

حکایت
ماشاء اللہ

اگست 2014ء



WWW.PAKSOCIETY.COM

سالانہ چندہ

رجسٹرڈ انٹرنیٹ

حکایت

ماہنامہ

پاکستان 800 روپے

7000 روپے

1

سعودی عرب، کویت، اردن، ایران، سری لنکا، ابو ظہبی، بحرین،
دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت، سوڈان، یوگنڈا، کینیا، نائیجیریا اور
دیگر افریقی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے،
سویڈن، فرانس، ملائیشیا، سوئٹزرلینڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی

7000 روپے

2

آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینزویلا، یونان، امریکہ،
نورو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، گریناڈا

- ✎ غیر ممالک سے رقوم بھجوانے کے لئے "وقاص شاہ" کے نام کا ڈرافٹ بنوائیں۔
- ✎ پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک وی پی نہیں جاتی، رقم پہلے بھجوانی ضروری ہے۔
- ✎ کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار حضرات کے ذمہ ہوگا۔
- ✎ خط و کتابت اور بدل اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری حوالہ نمبر لکھنا ضروری ہے۔

نوٹ: تبدیلی پتہ کی اطلاع مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے دیجئے۔

26- پیالہ گراؤنڈ، لنک میٹرو روڈ، لاہور۔ فون: 042-37356541

نورِ مبین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

کچھ شک نہیں تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جا ٹھہرا۔ وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند ستاروں کو پیدا کیا۔ سب اس کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھو! سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے) یہ اللہ رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔

(سورۃ الاعراف: آیت 54)

حکایت

ماہنامہ

جلد: 43 اگست 2014ء شمارہ: 12

بانی
عنایت اللہ
شاہد بن عنایت اللہ

مدیر اعلیٰ: صالحہ شاہد
مدیر: عارف محمود
منتظم: سعد شاہد

قانونی مشیر

وقاص شاہد ایڈووکیٹ

شعبہ تعلقات عامہ

میاں محمد ابراہیم طاہر

سرکولیشن منیجر + شعبہ اشتہارات

فضل رزاق + خرم اقبال

عرفان جاوید + محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ

مجید پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مجلس مشاورت

ابدال بیلا

عظمت فاروق

میم الف

ڈاکٹر شبیر حسین

ڈاکٹر نصیر اے شیخ

ڈاکٹر نعم علی

ڈاکٹر رانا محمد اقبال

مدیر: عارف محمود 0323-4329344

وقاص شاہد 0321-4616461

مدیر: فضل رزاق 0343-4300564

عرفان جاوید 0322-4847677

قیمت: 80 روپے

ہیڈ آفس

26- پیالہ گراؤنڈ لنک میٹرو روڈ لاہور 042-37356541

Monthly_hikayat@gmail.com

primecomputer.biz@gmail.com مضامین اور تحریریں ای میل کیجئے:

اسرار شمارتے ملیر

15	ساتی چیرہ	خصوصی فیچر لہو لہو امت مسلمہ جنگ بیتی
25	محمد افضل رحمانی	داستان ایک عامل کی جرم و سزا
43	عاشق حسین	ڈاکو اور ڈپٹی کمشنر
65	دیگبیر شہزاد	ڈکیتی کے بعد
161	محمد رضوان قیوم	رنکا ڈاکو سلسلہ وار ناول
49	رزاق شاہد کوہلر	دیر زنداں
209	امجد جودید	دھوپ کے پگھلنے تک دلچسپ و عجیب
61	رانا محمد شاہد	ادھر ادھر سے علم و تحقیق
70	سکندر خان بلوچ	باعثِ ولت
81	مجاہد ادیب شیخ	دینی اور تاریخی مغالطے لمحہ فکریہ
75	ڈاکٹر مبشر حسن ملک	وردی کا تقدس معاشرت اور قانون
91	ایس امتیاز احمد	مجھے طلاق چاہیے نافاہل فراموش
97	ٹی آئی سامر	جنات کا دربار

اسرار شہادتِ ملیہ

109	محمد رفیع ہاشمی	شخصیات خوش تراوصاف شخصیت
113	حفیظہ بشر	چلر دیواری کی دنیا کچے دھاگے
123	محمد نذیر ملک	جب بیٹی ماں کی بہو بنی
129	میاں محمد ابراہیم طاہر	تلخیص انتقام
149	شفاعت احمد	انتخاب صدیوں کی سل
159	رحمٰن شاہد	ایک مکتوب ایک کہانی تربیات
183	دقار احمد ملک	جنگلہ
174	ڈاکٹر رانا محمد اقبال	طب و صحت دستِ شفاء
177	صیب اشرف صبوحی	عجیب و غریب جرائد دیتے ہیں دھوکا یہ
189	بشیر احمد بھٹی	کچھ یادیں کچھ باتیں انوکھا طریقہ ثواب
193	منظر حسن ملک	ایک حقیقت ایک افسانہ روپ بہروپ
203	گلزار اختر کاشمیری	مسئلہ کشمیر بھارتی وزیراعظم کا دورہ.....

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1





کیا ہم جشن منانے کے حق دار ہیں؟

اگست شہیدوں کا مہینہ ہے۔ ان شہدیوں کا جنہوں نے اپنی جان، اپنی عصمت، اپنے مال اور محسوم بچوں کی قربانی دے کر پاکستان حاصل کیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں کسی قوم نے آزادی کے لئے اتنی بڑی قربانی نہیں دی۔ بے کوئی مثال؟

کیا آپ کو وہ شہید یاد ہیں؟

وہ ہزاروں بیٹیاں یاد ہیں جنہیں ہندو سکھا اٹھالے گئے؟

وہ محسوم بچے یاد ہیں جنہیں نیزوں میں پرویا گیا؟

وہ باپ اور بھائی یاد ہیں جن کی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت و سگی کی گئی؟

آپ خاموش کیوں ہیں؟ یہ خاموشی مجرمانہ ہے۔

نوجوان کہیں گے 66 برس پرانی باتیں کیسے یاد رہ سکتی ہیں؟ 66 برس پہلے جو کچھ ہوا، اب اس کا ماتم کرنا چھوڑو۔

دنیا بدل گئی ہے، اب تو بھارت ہمارے ساتھ امن کی آشا اور پیار کی بھاشا کی بات کر رہا ہے۔

بے شک دنیا بہت بدل گئی ہے۔ دنیا کا نقشہ بدل گیا، رہن سہن بدل گیا، ہر چیز بدل گئی مگر ایک چیز نہیں بدلی.....

وہ ہے ہندو کی ذہنیت، مسلم دشمنی۔ ہندو کبھی مسلمان کا دوست نہیں بن سکتا۔ ہندو اور زہریلا سانپ ایک ہی خصلت رکھتے ہیں۔ سانپ کو جتنا مرضی دودھ پلاؤ، وہ موقع ملتے ہی ڈس لے گا۔ یہی حال ہندو کا ہے۔

اگر آپ بھول گئے ہیں تو میں یاد دلا دیتا ہوں کہ یہ وہی ہندو ہے جس نے 65ء میں پاکستان کو نیست و نابود کرنے کے لئے اپنی بیبت ناک جنگی قوت سے حملہ کیا تھا۔ یہ وہی ہندو ہے جس نے 65ء کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے 71ء

میں آدھا پاکستان کاٹ کر وہاں مسلمانوں کی قتل و غارت مسلمانوں کے ہاتھوں کرائی اور خود بھی پاکستانیوں کے خون سے کھل کر ہولی کھیلی۔ یہ وہی ہندو ہے جو کشمیر پر قابضانہ قبضہ کئے بیٹھا ہے۔ یہ وہی ہندو ہے جس نے اعلان کیا کہ

پاکستان کا پانی روک کر اسے صحرا بنا دیں گے تاکہ اس کا بچہ بچہ بھوکا پیاسا مر جائے۔ یہ وہی ہندو ہے جو بھارت میں

موجود مسلمانوں کے خون سے آئے دن ہولی کھیلتا رہتا ہے۔ یہ وہی ہندو ہے جس نے حال ہی میں اپنی ہندو جنونی

حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اذان پر پابندی لگائی جائے۔
ہند اپنی لچر فلموں اور ڈراموں کی وجہ سے نوجوان نسل کو بڑا خوبصورت نظر آتا ہے۔ یاد رکھیں! سانپ بھی بڑا خوبصورت اور رنگین ہوتا ہے۔ دونوں یکساں نہر لیے ہوتے ہیں۔ یہ نہر بڑے ہی حسین اور عریاں جسموں کے ذریعے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں اٹھیل کر ان کی کردار کشی کی جا رہی ہے۔ ہمارے نوجوانوں پر ہندو کا ظلم جاری ہے اور اسی ظلم کے زیر اثر وہ پاکستان دشمنی پر مبنی فلمیں اور ڈرامے شوق سے قبول کر رہے ہیں۔

اس میں سارا قصور نئی نسل کا ہی نہیں، بزرگوں کا بھی ہے جنہوں نے اپنے بچوں کو بتایا ہی نہیں کہ پاکستان کے قیام کا مقصد کیا تھا اور پاکستان حاصل کرنے کے لئے کتنی بڑی قربانیاں دی گئی تھیں۔

جو پہلے کبھی باوقار "یوم آزادی" ہوا کرتا تھا، اس کو "جشن آزادی" کا نام دے کر فضول ہل بازی اور مناج گانے کے پروگراموں کی نذر کر دیا گیا ہے۔ کیا ہم جشن منانے کا حق رکھتے ہیں؟

کیا ہم نے قیام پاکستان کے مقاصد حاصل کر لئے ہیں؟

کیا ہم دنیا میں ایک باوقار قوم کی حیثیت سے زندہ ہیں؟

کیا ہم نے ماضی کی غلطیوں کو تباہیوں کا ازالہ کر دیا ہے؟

کیا ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہے اور غربت ختم ہو گئی ہے؟

کیا ہم نے آدھا ملک گنوا کر کوئی سبق سیکھا؟

کیا ہم نے غیر ملکی قرضوں سے نجات حاصل کر لی؟

کیا عوام کو پینے کا صاف پانی ملنے لگا ہے؟

کیا لوڈ شیڈنگ پر قابو پالیا گیا ہے؟

کیا میٹرول، بجلی، گیس اور پانی ارزاں نرخوں پر ملنے لگے ہیں؟

کیا دہشت گردی اور بھتہ مانیا پر قابو پالیا گیا ہے؟

کیا مظلوموں کو انصاف ملنے لگا ہے؟

..... اور کیا واقعی ہم آزاد ہیں؟

یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ تو پھر ہم کس بات کا جشن منائیں؟ دراصل ہم کھیل تماشوں کی عادی قوم ہیں۔ ہر حکمران نے قوم کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے کھیل تماشوں میں الجھائے رکھا اور خود اوپر بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہے۔ اب حکومت نے اعلان کیا ہے کہ اسلام آباد میں پورے ایک ماہ تک جشن آزادی منایا جائے گا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس اعلان کے پس پردہ کیا مقاصد ہیں؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 30 دن کی تقریبات میں ملک و قوم کا کتنا سرمایہ اور وقت برباد ہوگا۔ کسی نے سوچا؟ حکمرانوں کو اس کی کوئی پروا نہیں کیونکہ وہ یہ سرمایہ عوام کی ہڈیوں سے نچوڑ کر نکال لے گی۔

یہ صرف جشن ہی ہوتا ہے، اس میں جذبہ بالکل نہیں ہوتا۔ جذبے سے خالی جشن، لوگ گھروں کی چھتوں پر، گاڑیوں پر، موٹر سائیکلوں پر، سائیکلوں پر، ریڑھیوں پر، گدھا گاڑیوں پر، ڈکانوں پر جھنڈے لہرائیں گے۔ ہر طرف سبز ہلالی پرچموں کی بہار آ جائے گی۔ رات کو بڑی سڑکوں پر، پارکوں میں، مینار پاکستان کے سائے تلے لوگوں کا جھوم ہوگا۔ مادر پدر آزادانہ جوان موٹر سائیکلوں کے سائیکلسرٹال کرکانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز کے ساتھ بھگانیں گے، ون ویگ کریں گے، قوم کی بیٹیوں کے دوپٹے کھینچیں گے اور بے ہودہ فقرے کہیں گے۔ انڈین گانوں پر بھنگڑے ڈالیں گے اور ان سارے کاموں میں ماڈرن لڑکیاں بھی پیچھے نہیں رہیں گی۔ خود ہی اندازہ کر لیں کہ اس قسم کے جشن کے پیچھے کس قسم کے جذبات کا رفرما ہوں گے؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گزشتہ برس 14 اگست کے ”جشن“ کے بعد جب میں اگلے دن دفتر جانے کے لئے نکلا تو سڑکوں پر جگہ جگہ کاغذ کی مٹی ہوئی پاکستان کے پرچم والی جھنڈیاں اور جھنڈے بکھرے پڑے تھے جنہیں خاکروب جھاڑو سے اکٹھا کر رہا تھا۔ یہ گندگی کے ڈبیر میں پھینکی جانی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر دل خون کے آنسو رو دیا۔ غیرت مند قوم میں اپنے پرچم کی حرمت کے لئے کٹ مرنے والے اور یہاں ہم اپنے پرچم کو بھروں تلے روند رہے ہیں۔

میں اسی سوچ میں گم تھا کہ کاغذ کا ایک جھنڈا ہوا کے ساتھ اڑتا ہوا میرے قدموں میں سے آگرایا۔ میں نے تڑپ کر اسے اٹھا کر درصاف کی اور بے اختیار سینے سے نکال لیا۔ عجیب جذباتی کیفیت ہو گئی۔ تحریک پاکستان کے شہداء یاد آ گئے، مہاجروں کے لئے پٹے قافلے یاد آ گئے جو جگہ جگہ لہو بہاتے آئے تھے، لاشوں سے بھری خون نچالی ٹرینیں یاد آ گئیں، کرپانوں سے کٹے ہوئے نوزائیدہ بچے نظروں کے سامنے گھومنے لگے، عفت آب بچیوں کی چھین کانوں میں گونجنے لگیں، ان کی عصمت کا خون ہر نو بکھر گیا، ہر طرف آگ و خون کا دریا، چیخ و پکار، بے بچرنگ، لمبا، ہر ہر مہادیو، بے کالی کی اور ست سری اکال جو یو لے سونہال کے نعرے گونجنے لگے۔ میرا سارا وجود زلزلوں کی زلزلے میں آ کر کانپنے لگا۔ یوں لگا جیسے اس کاغذ کے جھنڈے سے خون لپک رہا ہے۔ جھنڈا فریاد کناں ہے کہ میں تو تمہاری عزت، غیرت اور وقار کی علامت ہوں۔ میری حرمت کو یوں پامال تو نہ کرو۔۔۔۔۔ یاد کرو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علمبردار کو جن کا بازو کٹ گیا تو پرچم گرنے نہیں دیا، ہائیں ہاتھ میں تمام لیا۔ دشمن نے پرچم گرانے کے لئے بایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا تو بھی پرچم اپنے کٹے ہوئے بازوؤں میں سنبھال لیا مگر نے نہ دیا حتیٰ کہ ایک اور مجاہد نے آ کر پرچم تمام لیا۔ یہ سچے اور کھرے جذبے کا کمال تھا کہ اسلام کا پرچم آدمی سے زیادہ دنیا پر چھا گیا۔

یاد رکھو! یہ سبز ہلالی پرچم محض کپڑے کا یا کاغذ کا ایک ٹکڑا نہیں یہ تمہاری عزت، غیرت اور مٹی و قومی وقار کی علامت ہے۔ اگر تم اس کی عزت نہیں کرو گے، اس کی حرمت کا خیال نہیں رکھو گے تو دنیا میں تم بھی بے عزت اور بے وقور ہو جاؤ گے۔ پرچم بلند رکھو!

عارف معرو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹاڈہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



محبوب عالم، صابر حسین راجپوت اور میم الف کی شہرہ آفاق کتب

- کار شلواری اور پوشہ ۱۔
ایک پاکستانی سٹریٹ ویس سیکڑی جیرو کی
سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- بال ایک چیل کے ۱۔
نومہ سرافرمانی کی جہان کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- مات کے شے سے موت کی بے صحت ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- جب مجھے اغوا کیا گیا ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- ایک مات کی شادی ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- لاش، لڑکی اور گف کے گنہگار ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- دام میں صیلا آ گیا ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- فادات اُس رات کی ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- قاضی کی کوٹھڑی اور کنویریٹی ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- آشرم سے اُس بازار تک ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- لاش پر لاش ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- رقن کمار کی روپا ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- جائیداد کا وارث ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- بھیریا، بد روح اور بیوی ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- لوگرم رکھنے کا ہے اک بہانہ ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- قبر کا بھید ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- ایک لڑکی دو منگیترا ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- سانپ سادھو اور نیچے کی کہانی ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- مائیسی کیوں؟ ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- معتنا طیبی شخصیت (مکمل سیریز) ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- داستان ایک داماد کی ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- معتنا طیبی شخصیت (مکمل سیریز) ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- لاش پر لاش ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- پیار کا پانی ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- چادر اور چوڑیاں ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- حوالات میں طلاق ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- بن بیانی ہاں ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- 1857 کی داستان خونچکان ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- پیار کا پانی صراط ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- جنات کے دربار میں ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- دیسر یا بیوقوف ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)
- دوسری بیوی ۱۔
نومہ سرافرمانی کی روپیہ (۱۰۰ روپے)

خود فریبی سے گریز کریں!

ہمارے پڑھے لکھے لوگ دانشور اور وہ جو خود کو عقل مہل کہتے ہیں، کیوں اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کیوں پاکستان افغانستان، یمن، شام، لیبیا، عراق، مصر، تونس، سوڈان، صومالیہ، نائیجیریا وغیرہ مسلم ممالک کے حالات سدھرنے کا نام ہی نہیں لیتے ہیں



☆Email:saqqicheema07@hotmail.com ساقی چیمہ

ہے۔ جنگ کا مقصد دشمن کو اپنی مرضی پر چلانا ہوتا ہے اور جنگ جیتنے کا اہم حربہ دشمن کی سپلائی لائن کاٹنا اور اس عمل (جنگ) کو مسلسل جاری رکھنا ہے۔ پہلے یہ نظریہ مقبول عام تھا کہ ریگولر فوج گوریلوں سے نہیں لڑ سکتی لیکن جدید دور کے اس آزمائے ہوئے نظریے کو پہلے اسرائیلی فوج نے لفظ ثابت کیا اور اپنے خلاف لڑنے والے گوریلوں کو شکست دی پھر ابھی حال ہی میں سری لنکا کی فوج نے

سے دنیا معرض وجود میں آئی ہے اور حضرت جب انسان کا قدم یہاں پڑا ہے جنگیں ہو رہی ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ادیب اور صحافی، دانشور وغیرہ جنگ بارے کیا کہتے ہیں (یہ لوگ تکنیکی حقائق سے بے خبر محض مبالغہ آرائی افسانہ طرازی کرتے ہیں) جنگی ماہرین کہتے ہیں کہ جنگ ایک پرتشدد خونریزی کا عمل ہے جس کے جواب میں زیادہ تشدد اور خون ریزی ہوتی

سالوں پرانی جنگ میں دہشت گرد گوریلوں کو ختم کر کے یہ نظریہ کافی حد تک غلط ثابت کیا۔

قارئین! پاکستان میں دہشت گرد طالبان دس سال سے زیادہ عرصہ سے لڑ رہے ہیں، اس کے علاوہ سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی اور بلوچ علیحدگی پسند بھی شامل ہیں۔ کوئی بھی جنگ مسلسل سپلائی اور امداد کے بغیر نہیں لڑی جا سکتی۔ جنگ میں انسانی ایندھن استعمال ہوتا ہے جس کو بھڑکانے کے لئے بارود اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دہشت گردوں کی مدد کون کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟ جو لوگ اس ملک کی سلامتی کے ذمہ دار ہیں اور ریڈیوٹی وی پہ اپنے ترانے چلواتے ہیں، نصابی کتب میں ہیرو ہیں اور اپنے خفیہ اداروں کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، کیا وہ اس جدید دنیا میں نہیں رہتے؟ کیا ان کو نہیں پتہ کہ ان کی ناک کے نیچے کیا ہو رہا ہے؟ میں فوج کے خلاف بات نہیں کر رہا، صرف ایک پوائنٹ کی طرف توجہ دلا رہا ہوں کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ مسائل کے ذمہ دار ہیں ان کے بارے میں بات نہ کریں تو گلی میں پنے بیچنے والے کو ذمہ دار قرار دیں۔ مول خود پاک فوج کا حامی ہوں اور گزشتہ مضمین میں یہ بات واضح کر چکا ہوں۔

سب سے زیادہ بحث سب سے زیادہ اختیار اور پالیسی سازی کے عمل میں سب سے بڑا بوٹ کس کا ہے؟ تو پھر اگر گزشتہ دہائی سے زائد میں ایک لاکھ کے قریب سولین (اس میں سیوری والے ادارے شامل نہیں ہیں) ہلاک ہو چکے ہیں اور اربوں کی پراپرٹی تباہ ہو چکی ہے، اربوں کا سرمایہ ملک سے جا چکا ہے، اربوں روپے کی سرمایہ کاری رُک چکی ہے اور اس کا نقد نتیجہ بد امنی، عدم تحفظ کا احساس، ملک سے لگاؤ میں کمی، مہنگائی، عوام کی مفلوک الحالی، سرمائے کا ملک سے فرار، عوام کی لمبی لائنیں کہ بیرون ملک چلے جائیں، سیاحت کا کاروبار جس سے

ملک کو کروڑوں ڈالر ملتے تھے، بند اور تباہ ہے۔ ملک میں فرقہ پرستی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ جہالت اتنی بلند سطح پر تاریخ میں کبھی کسی ملک میں نہ تھی اور یہ سب گزشتہ 35 سال میں ہوا ہے اور اس کا آغاز ضیائی عہد میں ہوا تھا اور بعد میں اس کے جانشینوں نے یہی پالیسی جاری رکھی اور یہ سوچ کر خطے میں عدم استحکام پیدا کرنے والے عناصر پالتے رہے کہ یہ ہمارے پالتو ہیں، کام آئیں گے اور وہ فالتو ہو کر اپنے کام لگ گئے۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے اس کام سے ہاتھ نہ ہٹایا اور جب پانی سر سے گزر گیا تو پھر بھی اپنی سیدھی حرکتیں اور منصوبے بنا رہے ہیں اور اس سارے عمل میں معصوم عوام کا خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے، ان کی جائیدادیں ریت کے گھر وندوں کی طرح تباہ ہو رہی ہیں۔ تاریخ کے بدترین آمر کے لگائے ہوئے پودے تباہ درخت بن کر جمجمہ رہے ہیں۔ اسی آمر نے اس ملک کی جڑوں میں جو زہر بھرا جو بارودی قلیتے لگائے ان میں موجودہ کئی سیاست دان بھی شامل ہیں۔

اب شیروائی اور واسکٹ والوں کی بات ہو جائے، میں نے دس دفعہ لکھا ہے کہ یہ لوگ یہ جتنا ملک کا نظام چلانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ان کا کردار کس قدر گھٹیا ہو سکتا ہے دنیا کی چھٹی بڑی ایٹمی فوج والے ملک کا حکمران کس قدر بزدل ہو سکتا ہے۔ آپ اندازہ لگائیں اس ملک کی فوج کے ہیڈ کوارٹر جی ایچ کیو پر حملہ ہوا تھا، دہشت گردوں نے وہاں قبضہ کر لیا تھا اور ان میں سے ایک اہم مجرم گرفتار ہوا تھا اس کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ گزشتہ ہفتے اس کو پھانسی ہونا تھی اور پھر پیغامات ملے کہ اس کو پھانسی دی گئی تو تمہاری خیر نہیں اور تمہارے جتنے کی بھی خیر نہیں اور اب اس دہشت گرد کی پھانسی ملتوی ہو چکی ہے۔

اب آپ کو دو تاریخی افراد کے دو تاریخی فقرے بتاتا ہوں جو ہمارے ریڈیوٹی وی پریس میں ریکارڈ پڑے

ناروے، فن لینڈ، آئس لینڈ، سویڈن، بھیم، ڈنمارک اور
لکسمبرگ پہلے دس نمبروں پر تھے حتیٰ کہ امریکہ دسویں نمبر
کے بعد تھا، اس کے الٹ سروے میں یہ دیکھا گیا کہ کن
ممالک میں معاشروں میں لوگ گھٹیا کردار بد اخلاقی اور
معاملات میں سب سے بُرے ہیں تو افغانستان،
پاکستان، سعودی عرب اور ایران پہلے چار نمبروں پر تھے۔
یہ ہے ہماری اوقات۔ امت مسلمہ کا شور مچانے والو،
کتوں اور گدھوں کا گوشت کتے بی کی انتہیوں سے نکلی
چربی ڈال کر چوری کی گیس سے ہانڈی پکا کر سحر و افطار
کرنے والو! اس دنیا میں ہمارا یہ کردار ہے، ہماری یہ
حیثیت ہے کہ خود قرآن کے مطابق ہم بدترین ذلیل
معاشرہ ہیں۔

اس سے پہلے اس موضوع پر لکھا تھا تو دینی جماعت
کے بڑے کلمے رگن نے کہا کہ کتوں کا گوشت بیچنا، ہال
صفا پاؤڈر سے دودھ بنانا، ہلدی میں ملاوٹ کرنا، مریچوں
میں اینٹوں کا پاؤڈر ڈالنا، دودھ میں گندہ پانی ڈالنا تاکہ
گاڑھا ہو جائے، میٹر ریڈر کا رشوت لینا اور بیوہ کا خود کشی
کرنا الفرض اس نے تمام جرائم کے متعلق کہا کہ یہ انفرادی
جرائم ہیں۔ ان صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ
انفرادی جرائم وہ ہوتے ہیں جن میں ایک بندہ ایک ہی
بندے کو لوٹتا ہے۔ فون لوٹتا ہے، کار چھینتا ہے، چوری کرتا
ہے اور ایسے انفرادی مجرموں سے جیلیں بھری ہیں، جو
معاملہ میں نے لکا ہے وہ سب اجتماعی کردار کی بات ہے۔
ہات عکمرانوں کی ہو رہی تھی اور ہات یہ کرنی تھی
کہ گزشتہ دس سال سے زائد عرصہ میں ایک لاکھ سے زائد
پاکستانی دہشت گردوں کے حملوں میں ہلاک ہو چکے ہیں
جن میں غالب تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے۔ اربوں کی
ملاک تباہ ہوئی ہیں، ایک ایک حملے میں 150 سے زائد
افراد ہلاک ہوتے رہے۔ 200 تک بھی ہوئے اور آج
لشطن میں صرف چھ سات سو افراد ہلاک ہوئے ہیں تو

ہیں۔ نمبر ایک مارشل لاء لگنے سے دو دن قبل وزیراعظم
بھٹو نے کراچی میں ایک بیان میں جس کرسی پر بیٹھا تھا
اس پر میکی مار کر کہا۔ ”یہ کرسی بہت مضبوط ہے“۔ دو دن
بعد فوج کی تحویل میں تھا۔ نمبر دو اپنا جہاز کریش ہونے
سے دو دن پہلے ضیاء الحق نے فٹری تقریر میں کہا۔ ”میں
جانے والا نہیں ہوں“۔ اور دو دن بعد راکھ بن کر ہوا میں
اڑ گیا۔

ہر دور میں حکمرانوں نے جس لاجبائی سے اس
ملک میں کرپشن کو فروغ دیا ہے اس کی مثال کم ہی ملتی
ہے۔ قارئین! جس ملک میں ایک جعلی پٹرول پمپ سے
زیادتی کرے یا پھر جہالت کی انتہا ہے کہ لڑکی اپنا مقصد
حاصل کرنے کو اس کے چنگل میں پھنس جائے اور پھر
ایک بڑائی دی جیٹل اس لڑکی اور ملزم کو لے کر لٹانے جاتا
ہے، وہاں پر چھ درج کراتے ہیں، ملزم نے لڑکی کی نگلی
تصادف بنائی ہوئی ہیں موبائل فون میں وہ بھی مال مقدمہ
اور بطور ثبوت پولیس کو دیتے ہیں اور فی وی والوں کے
جانے کے محض پھر بعد حلقہ اے ایس آئی لڑکی کے بھائی
کو فون کرتا ہے کہ یہ تصویریں مارکیٹ میں فروخت ہو
جائیں گی ورنہ پچاس ہزار دو۔ وہ بے چارہ بھرتی دی
والوں کو لے کر آیا اور جب انہوں نے پوچھا تو وہ تمنایدار
چپ رہا بڑے تمنایدار نے کہا۔ کیا طوفان آ گیا ہے، آؤ
بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ معاشرہ
اپنے کردار کے لحاظ سے ذلت کی آخری حد پر پہنچ گیا
ہے۔

گزشتہ دلوں ایک پاکستانی اور ایک ایرانی پروفیسر
نے جو امریکہ میں رہتے ہیں، تمام جدید وسائل اور
طریقوں سے ایک سروے کیا کہ دنیا کے کن ملکوں
معاشرہ کے لوگ اعلیٰ ترین انسانی کردار اور بہترین
اخلاق اور دوسروں سے بہترین سلوک کرنے والے ہیں
جیسا کہ قرآن میں اعلیٰ انسانی کردار کی خوبیاں ہیں تو سنو

دہشت گردی اور کرپٹ سیاستدان ہیں یہ دونوں ہی ملک کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں اور اس ملک کے عوام کے تمام دکھوں کے ذمہ دار ہیں اور ان کو عوام پر مسلط کرنے والے وہ لوگ ہیں جو بادشاہ گر ہیں اور جو سرمایہ دار امریکہ کے غلام ہیں۔ قارئین! مشرق وسطیٰ میں اس وقت جو ہو رہا ہے اس کی صحیح تصویر دیکھیں تو آپ ہلاک اور چنگیز خان کو بھول جائیں گے۔ ”داعش“ دہشت گرد خارجی ہر اس انسان بچے بوڑھے جوان عورت کو قتل کر رہے ہیں جو ان کے راستہ میں آتا ہے۔ گزشتہ دنوں موصل میں ملا بغدادی نے حکم دیا کہ سرکاری ملازمین غیر مسلم آبادی کو کھانا پانی کوئی شے فراہم نہ کریں اور ہر جگہ ان لوگوں نے غیر مسلموں کا قتل عام کیا ہے اور خود کو اس نیا کاہرہ کار کہتے ہیں جنہوں نے جنگ میں سبز درخت کاٹنا بھی حرام قرار دیا تھا اور جنگ کا یہ اصول خاص طور پر نافذ بھی تھا کہ صرف ہتھیار اٹھانے والوں سے ہی جنگ کی جائے گی، وہ بھی جب تک وہ ہتھیار نہ ڈال دیں۔ یہ لوگ ہتھیار ڈالنے والوں کو بھی قتل کر رہے ہیں اور کل عالم میں اسلام کو بدنام کر رہے ہیں اور ان کا واحد مقصد امر کی ایجنڈے کی تکمیل ہے کہ مشرق وسطیٰ میں تیسرا نو ورلڈ آرڈر نافذ کر کے اس کی تشکیل نو کی جائے۔ اس وجہ سے دنیا کی کوئی تنظیم اس طرف توجہ نہ دے رہی ہے کہ وہاں غیر مسلموں سے کیا ہو رہا ہے۔

بہر حال آزاد کردستان کا قیام عمل میں آچکا ہے اور اس میں شامی اور عراقی علاقے شامل ہیں، ترکی نے اپنے زیر قبضہ علاقے دینے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے اور ایران نے انکار کر دیا ہے۔ اب بہت جلد عراقی اور شامی علاقوں کے بعد شدید جنگ ایرانی علاقے میں شروع ہو جائے گی اور اس جنگ میں ایرانی کردوں کی لاشوں کے ڈھیر لگا کر ان کو اس طرح نہ دھائیں گے جس طرح کہ انہوں نے بلوچوں (ایرانی صوبہ سیستان) کے ساتھ کیا اور ان کو ظلم

اس امت مسلمہ کے پیٹ میں بڑا درد اٹھ رہا ہے۔ جلوسوں سے عوامی زندگی عذاب کرنے والے اور موکی کیڑوں کی طرح بلوں سے نکل آنے والی جماعتوں اور ملاؤں کو ڈکھ ہو رہا ہے۔ گزشتہ 14 سال سے ہم جنوبی دہشت گردوں کا نشانہ ہیں امت مسلمہ اور فلسطینیوں نے کس دن ہمارے لئے ایک گھنٹہ کی بھی ہڑتال کی تھی؟ گزشتہ چودہ برسوں میں مرنے والے ایک لاکھ شہری اور تیس ہزار فوجی کیا اتنے ہی گئے گزرے تھے؟ یہ کیسا معاشرہ ہے، یہ کیسے لوگ ہیں اور یہ کیسے مذہبی رہنما ہیں؟ اس وقت آج چین میں جن لوگوں کو روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے اس کی خاص وجہ انہوں نے برسوں کے تجربہ سے بتائی ہے کہ پھر یہ لوگ کام نہیں کرتے، کوئی استاد طالب علم، مزدور اور سرکاری ملازم ہو اس سے پوچھو کام کیوں نہیں کر رہے وہ کہتا ہے تھک گیا ہوں، میرا روزہ ہے یعنی روزانہ 8 گھنٹے کام کے اوقات میں وہ دو تین گھنٹے کام کرتے ہیں۔ اس لئے وہاں سرکار نے پابندی لگا دی مگر عام آدمی پر یہ پابندی نہ ہے اور خاص بات یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلے جلوس نکالنے اور توڑ پھوڑ کرنے والوں کی غیرت برف میں لگ گئی ہے۔ کیوں چینی سفارت خانہ کو آگ نہیں لگائی ہے۔ کیوں جلوس نکال کر امن و امان تباہ نہیں کیا ہے؟ ہم کیسی متعلق قوم ہیں؟ اور سچ تو یہ ہے کہ چینی سچے ہیں۔ اس ملک میں ہم دیکھتے ہیں کہ روزوں میں کام کے اوقات آدمی رہ جاتے ہیں حتیٰ کہ جوڈکان دارمچ لو بجے ڈکان کھولتا تھا وہ بھی بارہ بجے آتا ہے اور کہتا ہے صبح آنے کا فائدہ نہیں لگا کہ تو آتے نہیں میرا تو کام آدھا رہ گیا ہے، اس رحمت کے مہینے میں۔ ہاں اس رحمت کے مہینے میں جو ناجائز منافع خوری اور لوٹ مار تاجر طبقہ نے چالی ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

قارئین! اس ملک کا سب سے اہم مسئلہ اس وقت

گردوں کو اردن میں خفیہ کیمپوں میں خصوصی تربیت دیتے رہے ہیں اور ڈیڑھ ارب ڈالر کی ہاسہ تو ہو چکی ہے اور اس کے بعد مزید ڈالر بھی آئے ہیں جن کی کرامت سے دس لاکھ قبائلی بے گھر بے درؤکھوں کا شکار ہیں۔ ایک ماہ کے آپریشن کے بعد محض ایک سیکنڈ کلاس دہشت گرد پکڑا گیا ہے۔ ویسے آپریشن کا علاقہ مکمل میل بند ہے اور فوج کے علاوہ دنیا کے کسی فرد کو یہ معلوم نہ تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں دہشت گرد طالبان کا خاتمہ کر رہے ہیں۔

ہمارے پڑھے لکھے لوگ دانشور اور وہ جو خود کو عقل کل کہتے ہیں، کیوں اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کیوں پاکستان افغانستان، یمن، شام، لیبیا، عراق، مصر، تونس، سوڈان، صومالیہ، نائیجیریا وغیرہ مسلم ممالک کے حالات سدھرنے کا نام ہی نہیں لیتے ہیں جبکہ اسی فکست خوردہ ذلیل سرمایہ دارانہ نظام میں رہتے ہوئے بھی دوسرے

کی جگہ میں ہیں کر خاموش کر دیا تھا۔ آپ ایمانیوں کے لئے ایک نئی مصیبت تیار کھڑی ہے چونکہ امریکہ خود یہ سب کردار رہا ہے اس لئے اس درود کی دوا کوئی نہ ہے۔ اسرائیل نے آزاد کردستان کو تسلیم کر لیا ہے، آبادی کی اکثریت سنی مسلمان ہے۔

قارئین! میں بار بار یہ بات کہتا ہوں کہ سرمایہ دارانہ نظام دنیا کا ذلیل ترین نظام ہے اور اس نظام، اس سوچ کے حامل افراد نے جنگ کو بھی کاروبار بنا دیا ہے۔ ان کے اسلحہ ساز کارخانے کمریوں کا اسلحہ بناتے ہیں جو یہ جنگ میں معروف یا متوقع جنگ کے شکار گرد ہوں اور ممالک کو فروخت کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا شیطانی چکر ہے کہ اس کو ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد اب وہ گھر بیٹھے کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اسلحہ بناتے ہیں، آگے خریدار کی مرضی وہ بے پانہ لے۔ ایک اہم خبر یہ ہے کہ امریکی سی آئی اے کے لوگ داعش کے دہشت

حقیقت نگار قلم کار میاں محمد ابراہیم طاہر کی شاہکار کتابیں

(ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن)

1947ء کی داستان خونچکاں

قیمت 250 روپے

آزادی کی قیمت

حصول پاکستان کی راہ میں سکھ ریاست کی پور تھلہ اور پٹیالہ میں مسلمانوں کے قتل عام کی دلخراش داستانیں

قیمت 250 روپے

شکستہ سے فاطمہ تک

صفحات 256

جذبات کو صبحوز دینے والی ناقابل فراموش داستان
ایک ہندو خاتون شکستہ کی جی داستان جس نے دیوی
دیوتاؤں کو ٹھوکر مار کر تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔

مسلم ممالک ترکی اور ملائیشیا کی ترقی اور امن قابل رشک ہے۔ اسی ذلیل شکست خوردہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر وہ گرناروے، سویڈن، ڈنمارک، فن لینڈ، آئس لینڈ اور سوئٹزر لینڈ ترقی میں سب سے آگے ہیں۔

محترم قارئین! یہ مضمون شروع کیا تھا کہ مشرق وسطیٰ کا ناسور پھر رسنے لگا اور پھر جلد ہی ایک فلسطینی اور اسرائیلی دست درگیاں ہو گئے۔ اس مسئلے ہمارے دنیا بھر میں عام مسلمان عمومی معلومات رکھتے ہیں 1947ء میں سعودی عرب کے شاہ عزیز فیصل نے اپنی مہر سے برطانوی حکومت کو دستخط کر کے تحریر دی کہ اس کے زیر قبضہ فلسطینی علاقہ اسرائیل کو دینے پر اسے کوئی اعتراض نہ ہے (دستاویز منظر عام پر ہے)۔ اس کے بعد سب کو پتہ ہے کہ وہاں ایک جنگ شروع ہو گئی اور پھر 50 سال سے زائد عرصہ کے بعد اس میں معاہدہ اوسلو کی شکل میں ایک نیا موڑ آیا جب اسرائیل فلسطینی ریاست کے قیام اور اس کی امداد پر تیار ہو گیا۔ پی ایل او کے صدر یاسر عرفات نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس نے جس جنگ میں عمر گنوا دی ہے وہ لا حاصل ہے اور اپنی قوم کے لئے مرنے سے قبل کچھ حاصل کر لوں۔

قارئین! اس موقع پر فلسطینیوں میں ایک انتہا پسند گروہ پیدا ہو گیا جو کہ امن معاہدے کے خلاف تھا اور اسرائیل نے یاسر عرفات پر زور دینا شروع کر دیا کہ اس گروہ کے خلاف کارروائی کرو جو وہ بوجہ نہ کر سکا تا کہ آپس میں لڑائی نہ ہو۔ امن کا عمل سنست پڑ گیا اور یاسر عرفات اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ فلسطینی اتھارٹی کا انتظام اس کی جماعت نے سنبھال لیا اور پھر جلد ہی انتہا پسند گروہ حماس کے نام سے سامنے آ گیا اور مجوزہ فلسطینی ریاست میں اس گروہ نے یاسر عرفات کی کی جماعت "فتح" سے مسلح تصادم شروع کر دیے اور اس اقتدار پر قبضہ کرنے کا مطالبہ کیا جو محض ایک جلد بانی شہر

کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تصادم میں معصوم بچے اور راہ گیر زیادہ مرے اور فریقین کا نقصان کم ہوا۔ اس کے بعد احتمالات میں اس شدت پسند گروہ کو بھی اکثریت حاصل ہو گئی۔ قبل ازیں تو یہ خفیہ مقامات سے اسرائیل پر راکٹ فائر کرتے تھے، قندار میں غالب حصہ ملنے کے بعد ان لوگوں نے مزاحمت اور جنگ کے اس راستے کو بھی ترجیح دی جس سے بچ کر جس کو چھوڑ کر یاسر عرفات اس قوم کے لئے اس دنیا میں ایک زمین کا پڑا امن ٹکڑا حاصل کر رہا تھا۔ قارئین! فلسطینی واقعی ایک بد قسمت قوم ہے مگر اس میں ان کے کردار کا بھی ہاتھ ہے۔ 1970ء میں ہزاروں فلسطینی شام اور اردن میں امن و سکون سے رہ رہے تھے پھر ان لوگوں نے وہاں سے اسرائیل کے خلاف پرتشدد کارروائیاں شروع کر دیں۔ ایسی کارروائیوں سے تنگ آ کر اسرائیل نے شام اور اردن سے ڈیل کی کہ ان کو نکالو، ان لوگوں نے ٹکٹ کی بجائے اپنے میزبانوں سے بھی لڑائی شروع کر دی۔ پاکستانی فوج کا بریگیڈ یئر ضیاء الحق (جو بعد میں اس ملک کا صدر بھی رہا) وہاں اردن میں فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ فلسطینیوں کے خلاف آپریشن شروع کیا گیا کہ ان کو لبنان میں دھکیل دیا جائے چنانچہ 20 ہزار سے زائد فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔ دیگر افواج نے مشکل سے 5 ہزار مارے ہوں گے اور ان کو لبنان میں دھکیل دیا تب لبنان جنت نظیر تھا مگر ان لوگوں نے وہاں جاتے ہی پھر اپنا کام شروع کر دیا اور اسرائیل سے جنگ میں لبنان کھنڈر بن گیا پھر وہاں سے بھی نکال دیئے گئے اور کئی ملکوں میں پھیر دیئے گئے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ جب سے شدت پسند گروہ حماس کا عمل دخل اور اثر و رسوخ فلسطین میں بڑھا ہے۔ فلسطین کا مسئلہ جنگ ہو گیا ہے۔ جب بھی امن کے راستے پر ایک قدم اٹھتا ہے بغیر کسی وجہ کے بغیر کسی اشتعال کے حماس کے لوگ اسرائیل پر راکٹ

برسانا شروع کر دیتے ہیں۔
 اب آپ ذرا غور سے سمجھیں کہ یہ راکٹ کیا ہیں۔
 یہ ایک خود ساختہ ہتھیار ہے جو کہ مروجہ جنگی میزائل کی
 دیکھی نقل ہے اور بہت چھوٹا ہے اس کی مار بھی کم ہے اور
 اس سے نقصان بھی واجب ہوتا ہے۔ حماس کے لوگ یہ
 راکٹ خود بناتے ہیں اور کچھ پرالے زائد الیحاد راکٹ
 ایران ان کو دیتا ہے۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ پاکستان میں
 شادی بیاہ پر جو گولے چلاتے تھے جو اوپر جا کر پھٹتے ہیں
 یہ ان کی ذرا بہتر قسم ہے اور ہوتا کیا ہے اس کے جواب
 میں اسرائیل اپنی بھرپور قوت اور غضب کے ساتھ حملہ آور
 ہو جاتا ہے جو ترقی گزشتہ پانچ سال سال میں علاقے
 میں ہو چکی ہوتی ہے اور غزہ و مغربی کنارے کے لوگوں
 کے دل میں امن کی امید پھر سے روشن ہو چکی ہوتی ہے
 اسرائیل کے تباہ کن حملوں سے وہ سب ختم ہو جاتا ہے۔
 ایسا گزشتہ دس بارہ سال میں تیسری دفعہ ہوا ہے اور ہر
 دفعہ یہ کھیل ایک ہی انداز سے دہرایا جاتا ہے۔ اسرائیل
 کہتے ہیں ایک اسرائیلی کے بدلے 50 فلسطینی مارنے
 ہیں اور وہ مارتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے کہ حماس کے
 جنگی جنونی اپنے بچوں کو اسرائیلی بموں سے مرنے کے
 لئے پیدا کرتے ہیں۔ قارئین! بچوں کی سب سے زیادہ
 ایک نظر بھی دیکھی نہیں جاسکتی ہیں اور اس دفعہ اسرائیلیوں
 کا یہ دھوکا بھی سچ ثابت ہو گیا ہے کہ حماس سکولوں اور
 ہسپتالوں کی عمارتوں سے راکٹ فائر کرتے ہیں۔ اقوام
 متحدہ کی انجنیسی برائے غزہ نے اس کی تصدیق کی ہے اور
 میں نے حماس کا ایک ہدایت نامہ دیکھا کہ میڈیا پر یہ مت
 دکھاؤ کہ اسرائیلی طیارے بمباری کر رہے ہیں بلکہ زیادہ
 سے زیادہ بچوں کی لاشیں دکھاؤ اور اب دنیا نے یہ بھی
 دیکھ لیا ہے کہ چار گھنٹے کی جنگ بندی جو انسانی بنیادوں پر
 ہوئی تھی، اس کے صرف دو گھنٹے بعد حماس نے راکٹ
 چلانے شروع کر دیئے۔

قارئین! یہ جنگ ایسے ہے جیسے کہ ایک بندے
 کے پاس چھوٹے والی ازگن ہو جس سے پرندے
 مارتے ہیں اور دوسرے کے پاس مشین گن اور بم ہوں
 اور چھوٹے کی گن والا بار بار فائر کرنے سے ہار نہ آئے
 جبکہ ایک بچہ کو بھی پتہ ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا ہے۔
 اس دفعہ گزشتہ ماہ شروع ہوا جب تین اسرائیلی
 لڑکوں کو بدظلم کے علاقے سے اغوا کر کے قتل کر دیا گیا
 اور تحقیق و تفتیش سے طرز ثابت ہونے والے فلسطینی فرار
 ہو گئے اور دو دن بعد ایک مسلم لڑکے کو اغوا کر کے زندہ
 جلادیا گیا۔ اس پر اسرائیلی حکومت نے خود اپنے مفاد
 کے لئے قاتل اگلے دن گرفتار کر کے مقدمہ درج کر لیا
 مگر اس کے چند دن بعد اچانک ہی جیسا کہ پہلے ہوتا رہا
 ہے حماس نے راکٹ باری شروع کر دی اور اسرائیل
 نے ایک دو دن کے توقف سے تباہی کا کھیل شروع کر
 دیا۔ اس ساری صورت حال سے یوں لگتا ہے کہ جیسے
 حماس کی اعلیٰ قیادت میں اسرائیل کے ایجنٹ ہیں اور
 جو غمی امن کی بات کسی موڑ پر پہنچتی ہے تو وہ بغیر وجہ اور
 اشتعال کے راکٹ باری شروع کر دیتے ہیں اور اس
 طرح سے اسرائیل کو گزشتہ سات آٹھ برس میں جو ترقی
 ہوئی ہوتی ہے، جو امن کی امید جاگی ہوتی ہے اسے تباہ
 کرنے کا بہانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ قارئین! یہ میرا دعویٰ
 ہے کہ اس عمل (حماس سے راکٹ باری کرانا اور شدت
 پسندی کو ہوا دینا) میں اسرائیل خود کسی نہ کسی طرح سے
 ملوث ہے اور ایک دن یہ بات واضح ہو کر سامنے آ
 جائے گی اور رہی بات امت مسلمہ کی تو وہ نجانے کس
 چیز کا نام ہے۔ دنیا بھر کے ہر ملک کے اہم شہروں میں
 جو رد باغیہ لوگ ریلیاں نکالتے ہیں جلوس نکالتے ہیں
 کہ غزہ پر ظلم بند کرو مگر امت مسلمہ کے سب سے بڑے
 شہید اسعودیہ کی طرف سے ایک سطر کا بیان بھی نہیں آتا
 ہے اور نہ ہی شعلوں کو ہوا دینے والے زائد الیحاد راکٹ

دینے والے ایران کا منہ کھلتا ہے۔ کیا یہ بے بسی کی سب سے بڑی بات نہیں کہ غزہ کی امداد کے لئے صرف ایک مسلم ملک ترکی کے علاوہ بقیہ ساری امداد غیر مسلم ممالک سے آتی ہے اور غزہ کے مظلوموں کے زخموں پر وہی مرہم رکھتے ہیں۔ یہ ایک مفروضہ ہے کہ وہ اسرائیل کی امداد کرتے ہیں۔

"حکایت" کے قارئین کو میاں طاہر صاحب کے تراجم سے واضح معلوم ہو گیا ہو گا اور راقم نے 1988ء میں یہ تحقیق مکمل کر لی تھی کہ اسرائیل نے کسی سے بھی بھیک نہیں لی ہے، اپنی عقل اور محنت سے وہ اس مقام پر پہنچے ہیں۔ ان کی قیادت میں وہ لوگ ہیں جو اپنے عوام سے جنون کی حد تک پیار کرتے ہیں اور اپنے ملک کی بقاء کے لئے پیشہ دارانہ انداز سے کام کرتے اور انتھک محنت کرتے ہیں۔ آدمی رات کے گیدڑوں کی طرح سے سیاسی حکومتوں کے خلاف سازش نہیں کرتے ہیں نہ ہی سیاسی جماعتوں اور ملاؤں میں رقوم تقسیم کرتے ہیں پھر بے شرمی سے سرعام اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

قارئین! بات غزہ کی ہو رہی تھی تو اسرائیل میں چندہ لاکھ فلسطینی عرب رہتے ہیں ان کے پاس وہاں کے آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ ہیں۔ یہ اسرائیلی شہری ہیں اور سو فیصد مکمل حقوق رکھتے ہیں جو کسی بھی اسرائیلی شہری کو حاصل ہیں حتیٰ کہ غزہ کے حق میں ریلی بھی نکالتے ہیں۔ آپ کو بتا دوں کہ خود اسرائیل میں ہائیں بازو کی جماعتوں اور لیبرل گروہوں نے غزہ پر حملہ کے خلاف جلوس نکالے ہیں۔ فلسطین کا مسئلہ مشرق وسطیٰ کا سنگٹا ہوا مسئلہ ہے جو بار بار بھڑکتا ہے اور اس کا واحد حل حقائق کو تسلیم کر لینے میں ہے۔ جتنی جلدی فریقین خصوصاً حماس زمینی حقائق اور صورت حال کو تسلیم کرے گی، مسئلہ کا حل نزدیک آ جائے گا۔ میرا مقصد کسی کی دل آزاری کرنا نہیں ہے۔

معزز قارئین! جب غزہ کے لاکھوں افراد امن امن پکارتے ہیں، جب اسرائیل کے اندر چندہ لاکھ فلسطینی اور ہزاروں قادیانی باعزت پُر سکون زندگی گزارتے ہیں (وہ کسی کے غلام نہیں ایک ریاست کے شہری ہیں) جب کراچی سے 2500 پاکستانیوں نے اسرائیلی شہریت اختیار کر لی ان میں سے صرف دو ہزار یہودی تھے بقیہ مسلم تھے اور جب دنیا بار بار فریقین کو امن کے راستے کی طرف لے کر چلتی ہے، مذاکرات ہوتے ہیں، طمانتیں لی اور دی جاتی ہیں تو پھر حماس کا موقف کیا ہے بلا جواز جنگ شروع کرنے کا وہ بھی خالی ہاتھ۔ اب غزہ کے ہزاروں نہیں لاکھوں افراد نے عندیہ دیا ہے کہ یہ ہمارا دیس ہمیں بہت پیارا ہے مگر اب اگر ذرا سا بھی موقع ملے اس کو چھوڑ دیں گے۔ میں فلسطینیوں کو مظلوم اور بد قسمت قوم تسلیم کرتا ہوں لیکن خدا را! آپ سے التماس ہے کہ حماس اور فلسطین کو الگ الگ کر کے دیکھیں۔ حماس کو دوث دینے والے اب بچھتا رہے ہیں۔ غزہ میں حماس نے بد معاشی سے اپنی حکومت قائم کر رکھی ہے اور جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ یہ بار بار جو جنگ شروع کر دیتے ہیں تو اس کے درپردہ اسرائیل کا ہاتھ ہونا عین ممکن ہے مگر یہ سوال اپنی جگہ پر ہے کہ اسرائیل کو اس سے کیا فائدہ؟ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسرائیل کسی خاص طویل المیعاد منصوبے پر عمل کر رہے ہوں جس کے خاتمہ پر وہ ایسی فلسطینی ریاست تشکیل دیں جو ان کی مددگار ہو۔ ظاہر ہے جتنے بھی حملے کر لیں وہ فلسطینیوں کو ختم تو کر نہیں سکتے اس کا ان کو بھی پتہ ہے اور اب آخری بات جیسا کہ میں اکثر ملاؤں کے بارے لکھتا ہوں تو اس دفعہ بھی ملا اور ملائیت زدہ لوگوں کے منہ سے ایک ہی فقرہ بار بار سن رہا ہوں یا اللہ غزہ کی مدد کر۔ اس فقرے کا سیاق و سباق یہ ہے کہ ملا جمعہ یا عیدین پر ایک لمبی دعا کراتا ہے اور کہتا ہے یا اللہ کشمیر کو

کوئی مرض لا علاج نہیں سوائے موت کے

ماہنامہ "حکایت" کے شعبہ "دست شفاء" کے مستند و ماہر ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ) کی جدید تحقیقات اور ماہرانہ خدمات سے مستفید ہوں اور پرانے، ضدی اور لا علاج امراض، خصوصاً درج ذیل امراض کے تیز ترین اور بے ضرر علاج کے لئے رجوع فرمائیں:

- پولیو
- الرجی
- ذہنی معذور بچے
- بادداشت کی خرابیاں
- ہاتھوں کی جلد کی خرابیاں
- ہائی بند پریش
- ہاک و گلے کے غدود کا بڑھ جانا
- اعضاء کی بے بسی یا کنٹرول نہ ہونا
- پھیپھڑوں کے امراض
- احساس کتری، جھجک
- مردانہ، زنانہ امراض
- اعضاء کا پیدائشی (یا بعد میں) ٹیڑھا پن

رابطہ کے لئے

0321-7612717

0312-6625086

0323-4329344

ڈاکٹر رانا محمد اقبال
(گولڈ میڈلسٹ)

عارف محمود

بالمشافہ ملاقات کے لئے پہلے وقت لیں۔

دست شفاء حکایت 26 پیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور

شدت پسند ملک ہے تو بھرماس کے بد معاشوں نے کس وجہ سے کس قائدے یا جنوں کی خاطر نقل و غارت کا یہ بازار گرم کر رکھا ہے۔ مرنے والوں میں حماس کے 50 لوگ بھی شاید ہوں بقیہ سب سولین اور بچے ہیں۔ اس سے پہلے غزہ کے اندر الفتح سے لڑائی میں حماس کے بد معاشوں نے درجنوں بچے اور عام لوگ مار دیئے تھے۔ ان حقائق پر نظر رکھیں اور یہ ضرور یاد رکھیں کہ اسرائیل کو امن کی زیادہ ضرورت ہے اور وہ اس معاملہ سے بہت تنگ ہیں۔

اب تک خود اسرائیل نے دو دفعہ جنگ بندی کی پیشکش کی ہے اور حماس نے اس کے علاوہ دنیا بھر سے ہر طرف سے آنے والی جنگ بندی کی پیشکش ٹھکرا دی ہے اور اس جنگ میں ہو کیا رہا ہے اسرائیلی فوج کے حملوں سے سولینی افراد کی جائیدادیں تباہ ہو رہی ہیں۔ عورتیں اور بچے مرنے پر ہیں اس لئے کہ نام نہاد مجاہدین تو محفوظ جگہ ہٹا کر جاتے ہیں۔

قارئین سے اپیل ہے کہ فلسطینیوں سے محبت اور اسرائیل سے نفرت دو الگ کھیل ہیں، ان کو سمجھیں اور اسرائیل کے خلاف زیادہ تر غیر مسلم ہیں جن کے اپنے خاص مفادات ہیں اور آج ہر جگہ ریٹی ٹکالنے والے اہمردوں کو پاکستان میں ایک لاکھ معصوم لوگ جن میں عورتوں بچوں کی اکثریت ہے اور 50 ہزار سے زائد سکیورٹی اہلکاروں کے افراد کی لاشیں نظر نہیں آتی ہیں۔

نوٹ:- میرے ساتھ اختلاف کرنے والے حضرات سے گزارش ہے کہ کال کر کے اپنی بات کیا کریں، گناہ ایس ایم ایس نہ کریں۔ اچھے طریقے سے کال کر کے اپنا تعارف کرا کے بات کریں۔ آئندہ کسی ایس ایم ایس کا جواب نہیں دوں گا۔



آزادی دے، فلسطین کو آزادی دے آمین اور پھر کہتا ہے کہ چندے کے پیسے مسجد اور مدرسے کی صندوقچی میں ڈالنا مت بھولیں۔ تو جناب جب تک امت مسلمہ دعائیں کرتی رہے گی اور لوگ محض ریلیاں نکالتے رہیں گے تو کچھ نہ ہوگا اگر ہم ایک طاقتور باوقار قوم ہوں تو ہماری بات بھی کوئی سنے گا اس پر دھیان دے گا۔

صرف فلسطینیوں کے علاوہ ساری عرب دنیا کھلے عام یا اندر خانے اسرائیل سے دوستی کر چکی ہے حتیٰ کہ سعودی عرب تک اس سے کاروبار کر رہے ہیں تو پھر ہمارے پاکستانیوں کو کیا مسئلہ ہے، کیا دشمنی ہے اسرائیل سے؟ ہم اسرائیل سے دوستی کر کے فلسطینیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کر سکتے ہیں اور بھارت کا پریشر بھی کم کر سکتے ہیں۔

حماس نے غزہ کو بری حال بنا رکھا ہے اور غزہ میں تمام خون ریزی کی ذمہ داری حماس پر ہے۔ یہ لوگ جان بوجھ کر امن کی بات نہیں کرتے اور نہ ہی امن کے راستے پر چلنے کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ خون ریزی کا راستہ اپناتے ہیں ان کی حیثیت وہاں وہی ہے جو پاکستانی قبائلی علاقوں میں طالبان کی ہے جنہوں نے عوام کو بری حال بنا رکھا ہے اور خون ریزی کر رہے ہیں۔ پاکستان میں ایک ایک دھماکے میں 250 لوگ مرتے رہے کبھی حماس نے ایک فقرہ بھی اسوس کا کہا؟ دنیا بھر میں درجنوں جگہوں پر مسلمانوں پر ظلم کی انتہا ہوئی حماس نے کوئی لفظ بولا؟ آج ساؤتھ افریقہ اور ملائیشیا سے بھرس لندن تک جو جلوس اور ریلیاں غزہ کے حق میں نکل رہی ہیں۔ یہ غزہ کے حق میں نہیں ہے اسرائیل کے خلاف ہیں۔ غزہ سے پیار کی ریلی نہیں یہ اسرائیل سے نفرت کی ریلی ہے۔ اسرائیل میں محض 50 فیصد انتخاب پسند ہیں بقیہ لیبرل اور ہائیں بازو کے لوگ ہیں جو غزہ کو آزادی دینے کے حق میں ہیں۔ پاکستان اسرائیل سے زیادہ مذہبی

داستان ایک عامل کی

محمد افضل رحمانی

قسط: 5



سائیں کی حق تلفی ہوتی ہے پھر ٹو تو میرے دل سے اسی وقت کل گیا تھا جب ٹو نے ہری سنگھ کی بیٹی کے ساتھ منہ کالا کیا تھا۔ بتا تجھے کیا حاصل ہوا؟ اگر ٹو شیطان کے بہکا دے میں نہ آتا تو ہو سکتا ہے ٹو شاد کے سر کا سائیں ہوتا۔ ٹو دنیا میں جتنی چاہے عیاشی کر لے لیکن جو لطف ہوی بچوں کے درمیان رہ کر آتا ہے اس کا تو اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ مگر جب اپنے بچوں کے درمیان بیٹھ کر انہیں دیکھتا ہے تو اس کا کلیجہ ٹھہر جاتا ہے۔ ایک دن مجھے کہنے لگا شادو تیرا حق مجھ سے کبھی ادا نہیں ہو گا ٹو نے شیریں جیسے آٹھ بچے جن کی میری زندگی میں عجیب قسم کا رنگ بھر دیا ہے ان کی موجودگی میں میرا کوئی شریک میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔

”اچھا شادو! منے کے ساتھ تیری شادی کیسے ہوئی، کیا اُس نے کسی پہلوان کو ہرایا تھا؟“

”نہیں، ایک وجہ تو تیری بے وفائی تھی۔ ٹو ایک غیر مذہب کی لڑکی پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ ٹو صرف پانی ہی نہیں بلکہ بے غیرت بھی ہے۔ ٹو نے ماہے و پر کی عزت وقار کو مد لگا دیا اور بیٹیاں کو اس کے سر کے سائیں کے سامنے ذلیل کیا، ماہے کو تھانے اور پکھری چڑھایا۔ اس کو چھڑی لگوائی، تنک حرام ٹو نے ماہے کو کیا صلہ دیا؟ اس کی محبتوں اور محنت پر پانی پھیر دیا۔ ٹو اگر اس کیس سے بری بھی ہو جاتا تب بھی میں تم پر تھوکتا بھی پسند نہ کرتی۔ جس مرد کو غیر عورتوں کا چسکا پڑ جائے وہ انسان نہیں رہتا، سؤر بن جاتا ہے۔ مجھے مرے ہوئے ماہے کی شرافت کی قسم، میری زندگی میں صرف مٹا پہلوان ہی داخل ہوا تھا اور یہی قسم میں منے کے ہارے میں بھی اٹھا سکتی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں تم سے شادی کی خواہش مند تھی لیکن سؤروں کو سمجھو میں نہیں ملا کرتیں۔ جس طرح غیرت مند مرد گندی عورت کو پسند نہیں کرتا اسی طرح غیرت مند عورت بھی گندے مرد کو پسند نہیں کرتی۔ مٹا خوبصورت، طاقتور، اور

”دیکھ رکھنے ٹو مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔“ شادو نے کہا۔ ”تجھے زندہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ کیا ٹو تصور کر سکتا ہے کہ کوئی آدمی جس کو مردہ سمجھ لیا گیا ہو اچانک اس سے ملاقات ہو جائے تو انسان کتنی حیرت انگیز کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بول رکھنے میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟“

”ہاں، شادو! ٹو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں رکھائی ہوں لیکن اس راز کو راز ہی رکھنا ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ میرے دشمن مجھے قتل بھی کر سکتے ہیں یا پھر میں گرفتار ہو سکتا ہوں۔“

”ہاں، رکھنے! مجھے احساس ہے، میں اتنی کم عقل نہیں ہوں تیری اجازت ہو تو منے کو بتا دوں، منے پر مجھے مکمل اعتماد ہے۔ ویسے بھی مشکل وقت میں وہ تیرا مددگار ہو گا۔“

”جیسے تیری مرضی لیکن میرا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے، میں کسی بھی وقت یہاں سے دور بہت دور جا سکتا ہوں۔ اچھا، چھوڑ ان باتوں کو، کچھ اپنے ہارے میں بتا۔“

”مجھ پر اللہ کا بہت فضل ہے۔“ شادو نے کہا۔ ”مٹا پہلوان میرے سر کا سائیں ہے، تیری بے وفائی اور پھر گمشدگی کے بعد میں نے منے سے شادی کر لی تھی اللہ نے مجھے آٹھ بیٹے عطا کئے ہیں۔ اگر ٹو ان کو دیکھے تو حیران رہ جائے گا اتنے خوبصورت اور طاقتور تو جوان ٹو نے بہت کم دیکھے ہوں گے۔ منے اور میں نے مل کر انہیں اس انداز سے پالا ہے جس طرح شیر اور شیرنی اپنے بچوں کو پالتے ہیں۔“

”شادو! بتانا کبھی میرا خیال بھی آیا؟“

”ہاں کیوں نہیں، تیرا خیال آتا تھا لیکن اس انداز سے نہیں کیونکہ شادی کے بعد مٹا ہی میری محبتوں کا محور بن گیا تھا۔ ویسے بھی غیر مرد کا خیال رکھنے سے اپنے سر کے

ساتھ نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا۔ شام تک ہم جتنا سفر کر سکتے تھے کرتے رہے اندھیرا گہرا ہو گیا ہمیں کسی ہستی کی تلاش تھی کہ وہاں صدا کر کے پیٹ کا جہنم بھرتے۔ دور سے ہمیں مدھم سی روشنی کے آثار نظر آئے، ہم اس کی طرف چل پڑے۔ جب ہم روشنی کے قریب آئے تو خطرناک کتوں نے ہمارا استقبال کیا لیکن یہ ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھے۔ کتے کے بھونکنے سے گداگر کا رزق تو کم نہیں ہوتا۔ پھر ایک زنانہ آواز ہمارے کالوں میں آئی۔ وہ کتوں کو اپنے مخصوص انداز سے واپس بلا رہی تھی۔ کتے شاید اس کی زبان کو سمجھتے تھے، فوراً ہی واپس چلے گئے۔ اتنے میں ہم اس مکان کے قریب پہنچ چکے تھے کہ اسی عورت نے بلند آواز سے پوچھا۔

”اللہ لو کو! تم کون ہو؟“

”ہم مسافر ہیں اور بھوکے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں، سونے کو جبکہ بھی مل جائے گی اور کھانا بھی، اندر آ جاؤ۔“

جب ہم اندر داخل ہوئے تو ایک کالی کلوٹی عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے چراغ کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ وہ ایک خانقاہ تھی اور قبر کے سرہانے دیا چل رہا تھا جبکہ ساتھ والے حجرے میں چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں اور تازہ حقہ جس کی چلم میں ابھی ابھی آگ بھری گئی تھی۔ ہم چار پائیوں پر بیٹھ گئے اور میں نے حقے کے کش لگانے شروع کئے۔ پیردنی دروازے پر دستک ہوئی، عورت نے بلند آواز سے کہا۔

”ظہر جا، میں آ رہی ہوں۔“ اور پھر ایک منگ دھڑنگ ہاتھ میں لٹٹا دوسرے ہاتھ میں ہالٹی اور موٹے سے پر ریشوں والا کفکول لئے اندر داخل ہوا۔ عورت نے اُسے ہماری آمد کی خبر دی۔ وہ سیدھا کمرے میں آیا، اس نے لٹٹا دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور ہالٹی

میرے جواز کا آدمی تھا اور پھر میں اس کی پسندیدہ لڑکی تھی، اس نے مجھے برا کر مجھے جیتا تھا اور شادو کو ہرانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ ٹو لفظ راستے کا انتخاب کر کے شادو کے بے پناہ پیار سے محروم ہو گیا اور اب در بدر کی ٹھوکریں کھانا تیرا مقدر بن چکا ہے۔ تجھے کوئی ابا کہنے والا نہیں، ٹو کسی کی محبت کا محروم نہیں، تیرا کوئی گھر نہیں، ٹو جب مرے گا تجھے کوئی رونے والا نہیں ہوگا۔ مٹا ایک دفعہ ہائے کرے میں اور میرے بیٹے اس کی دل جوئی کے لئے اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔“

”بس کر شادو!“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا۔ ”مجھے والد، پھوپھا اور چچو کی جدائی نے نیم پاگل کر دیا ہے، اوپر سے تیرا ایک ایک لفظ میرے جیسے کی مانند میرے جگر کو کاٹ رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے رکھنے! میں اب چلتی ہوں، بہتر ہے ٹو جلد از جلد اس علاقے سے نکل جا۔ ہری سنگھ کے بیٹے تیری تاک میں ہیں اگر ٹو پھپھانا گیا تو بہت بُرا ہوگا۔ ویسے اِدھر یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ رکھنے کو ہری سنگھ نے قتل کر دیا ہے۔“

شادو جب جانے کے لئے مڑی تو میں نے اس کی جاندار چال کو دیکھا، اس پر ابھی بڑھا پا اثر انداز نہیں ہوا تھا پھر مٹا پہلوان اُس سے آ ملا۔ شادو کو منے کے ساتھ دیکھ کر میرا دل جیسے بیٹھ گیا ہو، پرانی درویش جاگ اٹھیں تھیں لیکن شادو نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ نڈیرٹو نے بھی غور کیا جب دل کے جانی بے رخی اختیار کر جائیں تو انسان کی کیا حالت ہوتی ہے؟“

”ہاں، رکھنے! انسان ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ اس کی کیفیت اس شخص کی مانند ہو جاتی ہے جو پانی میں ڈوب رہا ہو اور اسے تنکے کا سہارا بھی میسر نہ آئے۔“

”نڈیرٹو نے بالکل ٹھیک کہا ہے، میری بھی یہی حالت ہوگئی تھی۔ اب کیا ہو سکتا تھا، میں اپنے استاد کے

واپس آیا تو مجھے پتہ چلا کہ ملک مقتولہ عورت کو کہیں سے بھاگ کر لایا تھا۔ عورت کا تعلق کسی خانہ بدوش خاندان سے تھا، انہی لوگوں نے تلاش بسیار کے بعد دونوں کو قتل کر دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد میرے استاد کے دماغ نے پلٹا کھایا اور اس کا میلان مذہب کی طرف ہو گیا۔ ایک دن مجھے کہنے لگا۔ رکھتے اس جہنم میں میں نے جتنے بُرے کام کئے ہیں اگلے جہنم میں میری روح سکون نہیں پاسکے گی۔ میں بڑی آتما (یعنی خدا) کے ساتھ ملنا چاہتا ہوں اور ہر بار کے جہنم سے خلاصی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

آداگون یا تاسخ

یاد رہے کہ نجات کا تصور تقریباً ہر مذہب میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا پس منظر ہر مذہب میں مختلف ہے۔ چونکہ یہ ایک مستقل موضوع ہے لہذا اس پر بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ صرف ہندو مذہب کے بارے میں چند لائنوں میں تھوڑی سی وضاحت کروں گا تاکہ آپ کے علم میں اضافہ بھی ہو اور کہانی بھی دلچسپ نہ ہو اور یہ بھی اس لئے کہ چونکہ کہانی کا تعلق اس سے بنا ہے کیونکہ کہانی کا ایک کردار ایک ہندو جوگی ہے یاد رہے کہ ہندوؤں کے ہاں آخرت اور جنت و جہنم کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں اس کے برعکس آداگون یا تاسخ کا نظریہ پایا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح کو دوبارہ کوئی اور جسم دے کر اس دنیا میں لوٹا دیا جاتا ہے اور ہزاروں مرتبہ ایسا ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان ایک جہنم میں بُرے کام کرے تو اگلے جہنم میں اسے سزا دی جاتی ہے اور اس سزا کے نتیجے میں اسے کتے، گدھے یا کسی اور جانور وغیرہ کی شکل میں جہنم ملتا ہے حتیٰ کہ جب تک ایک انسان انتہائی درجہ کی ریاضتیں، عبادتیں اور مشقتیں برداشت نہیں کر لیتا تب تک وہ اس آداگونی چکر سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

زمین پر رکھی جو دودھ سے لہاب بھری ہوئی تھی۔ پھر موٹھ سے کھٹکول اتارا اور باری باری ہم سے مصافحہ کیا۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یہ تو اپنے ہی "ٹھکے" کا آدمی تھا۔ قریبی بستی سے کھانا اور دودھ مانگ کر لایا تھا۔ ہم نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور حسب ضرورت دودھ پیا۔ اس نے اپنا مختصر تعارف کرایا، وہ اس خانقاہ میں بحیثیت مختلم محافظ اور متولی رہتا تھا۔ اس خانقاہ میں دن بزرگ کے متعلق بھی اس قسم کے جھوٹے اور مبالغہ آمیز قصے مشہور تھے جو تقریباً ہر خانقاہ میں دن بزرگ کے لئے مشہور ہوتے ہیں اور جن کی اصل میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ہم بہت ٹھکے ہوئے تھے لہذا جلد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے اور پھر ہماری آنکھ اس وقت کھلی جب دو آدمی ملک پر گنڈاسوں سے پے در پے وار کر رہے تھے اور ملک کی دلدوز چیمیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ اس سے خوشتر کہ ہم حالات کو سمجھتے یا ملک کی مدد کو پہنچنے کا اہل کام کر کے تیزی سے بھاگ گئے، ملک ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ہم باہر نکلے تو دونوں کتے مچن میں مردہ پڑے ہوئے تھے اور عورت کی چار پائی کے نیچے کافی مقدار میں خون جمع تھا لیکن وہ ابھی تیز تیز چھوٹے چھوٹے سانس لے رہی تھی۔

رکھتے ایہ دو ہرے قتل کا کیس ہے، خوشتر اس کے کہ صبح کی روشنی پھیلے اور یہ خبر قریبی گاؤں میں پہنچے ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہئے۔ میرے ہندو استاد نے کہا۔

"ہاں استاد یہاں سے بھاگنے میں ہی عاقبت ہے۔" اور پھر ہم وہاں سے نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نامعلوم راستے پر چل پڑے۔ پتہ پھنسنے تک ہم کافی دور نکل گئے تھے لیکن اس الموسناک واقعے نے ہم پر گہرا اثر ڈالا تھا ہمیں اس واقعے کی تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن جب میرا استاد مر گیا اور میں اس علاقے میں

العقیدہ مسلمانوں کو ان کے گناہوں کے ازالے کے لئے سرور کونین کی شفاعت نصیب ہوگی۔ علماء کرام، حفاظ عظام، شہداء امت بھی گناہاروں کے لئے سفارش کریں گے لیکن شفاعت کی اجازت رب العزت خود دیں گے۔ جو خوش قسمت جنت میں پہنچ جائیں گے پھر ابدالاً بادی جنت میں ہی رہیں گے لیکن کچھ لوگ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر جہنم سے آزاد ہو جائیں گے۔ کفار و مشرکین جہنم میں رہیں گے اور ہمیشہ کے لئے جہنم میں ان کا ٹھکانہ ہو گا۔ ہندوؤں کے ہاں چونکہ یہ عقائد نہیں ہیں ان کی نجات کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان اپنے آپ کو انتہائی مشقتوں میں ڈال کر آتما یعنی خدا سے مل جائے۔ بس اس کی نجات ہوگی یعنی وہ فنا فی اللہ ہو گیا۔ اب اسے ایک جہنم سے دوسرے جہنم میں آ کر سزا بھگتنے سے نجات مل گئی۔ جب تک وہ اپنے آپ کو اس قسم کی مشقتوں میں نہیں ڈالے گا۔ بار بار جہنم لیتا رہے گا اگر کسی جہنم میں اس نے نیک کام کئے تو اگلے جہنم میں اس کی روح کسی آرام اور عیش و عشرت کرنے والے جسم میں ڈال دی جائے گی اور اس نے برے کام کئے تو اس کی روح اگلے جہنم میں کئے، گدھے، خنزیر وغیرہ میں ڈال دی جائے گی اور یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔ اس سے میرا مطلب ہندو مذہب پر تنقید نہیں کیونکہ ہر شخص اپنے عقائد و خیالات میں بالکل آزاد ہے اور ہدایت دینا نہ دینا اللہ کے اختیار میں ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا کہ یہ ایک مستقبل موضوع ہے یہاں میں مختلف مذاہب کا تقابلی نہیں کر رہا نہ میں یہاں دلائل عرض کر رہا ہوں کہ کون سا مذہب حق پر ہے البتہ یہ میرا ایمان ہے کہ نجات کے متعلق اسلام کا نظریہ برحق اور حقیقت پر مبنی ہے جسے عقل سلیم مانتی ہے۔

نروان کی تلاش

پھوپھا اور پھوپھو کی وفات اور ملک اور اس کی داشتہ

اپنے آپ کو انتہائی مشقت میں ڈال کر اور سخت ترین ریاضتیں کر کے اس آدا کوئی چکر سے نکل کر نروان (نجات) کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ آبادیوں سے دور جنگلوں اور غاروں میں رہنا، گرمی، سردی، بارش وغیرہ میں ننگے بدن رہنا۔ انہوں نے اپنی ریاضتوں کا مقدس عمل سمجھا۔ اپنے آپ کو دیوانہ وار تکلیفیں پہنچا کر انکاروں پر لٹ کر، درختوں کی شاخوں پر گھنٹوں لٹک کر اور اپنے ہاتھوں کو بے حرکت بنا کر یا سر سے اونچالے جا کر اتنے طویل عرصے تک رکھنا کہ وہ بے حس ہو جائیں اور سوکھ کر کاٹا بن جائیں۔ تیز دھار لو کیلے پتھر سے ایک گال سے دوسرے گال تک اور ناک کے دونوں حصوں تک اور دونوں ہونٹوں کے آر پار پتھر اتار دینا اور اس طرح گھنٹوں کھڑے رہنا، تازہ کانٹوں اور نو کیلی کیلوں کے بستر پر لیٹے رہنا یا رات بھر ایک پاؤں پر کھڑے رہنا۔

(مقدمہ آرمہ شاستر صفحہ 99 بحوالہ کتاب التوحید، جنات کا پوسٹ مارٹم صفحہ 239)

اس سے ملتا جلتا تصور بدھ مت اور جین مت کے بزرگواروں کا بھی ہے۔

نجات کے متعلق یہود کا عقیدہ یہ ہے کہ چالیس دن جہنم میں رہنے کے بعد آخر کار جنت میں چلے جائیں گے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر چڑھ کر اپنے ماننے والوں کے لئے کفارہ ادا کر گئے۔

مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد اعمال کے مطابق جزا و سزا دی جائے گی اور قیامت تک رحوں کو اگر نیک ہیں تو علیین میں اور اگر بد عمل ہیں تو جہنم میں رکھا جائے گا اور جب قیامت قائم ہوگی تو اعمال کے موافق جنت یا جہنم کا حقدار قرار دیا جائے گا لیکن صحیح

کے قتل کے واقعات ہندو جوگی پر گہرے اثرات چھوڑ گئے اور اُس کا میلان مذہب کی طرف ہو گیا۔

”رکتھے! میں اگلے جنم میں سزا برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس نے بڑے وثوق سے مجھے کہا۔ ”اس جنم میں جو اندوہناک گناہ میں نے کئے ہیں وہ تمہارے سامنے ہیں۔ اب نردوان (نجات) کی تلاش میں اس سریر کو مشقتوں اور ریاضات کی بھٹی میں جھونک کر بڑی آتما سے ملنے کا خواہش مند ہوں اور میرا مشورہ تمہارے لئے بھی یہی ہے کہ چھوڑ اس پاپوں بھری ناپاک زندگی کو اور آ میرے ساتھ اس قافی سریر (جسم) کو دکھ اور مصیبت میں ڈال کر جنم جنم کی مصیبتوں اور پریشاندوں سے چھٹکارا حاصل کریں اور اگر ٹو اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہتا ہے تو پھر میرا تیرا ساتھ اب نہ نہیں سکتا۔ ٹو اپنا راستہ لے اور میں سیدھا گنگا اشان کر کے اس بے کئے سریر کو ایسا مزہ چکھاؤں کہ آتما خوش ہو کے میری روح میں سما جائے۔“

”استاد! میرا کون سا مذہب ہے، مجھے تو کوئی پتہ نہیں لیکن میں تیرے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔“ میں نے لجاجت سے کہا۔

”دیکھ رکتھے! میں جب اپنے آپ کے ساتھ نہیں رہوں گا تو تمہیں ساتھ کیسے رکھ سکتا ہوں اور اگر ٹو دنیا میں رہ کر اور پاپ کمانا چاہتا ہے تو تیری مرضی۔ میں نے تمہیں گناہ آلود زندگی گزارنے کے لئے کئی گر سکھا دیئے ہیں ان کو استعمال کر کے ٹو ہر قسم کی عیاشی کر سکتا ہے۔“

”لیکن استاد! میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا، میرا بیٹا مرنا تمہارے ساتھ ہو گا۔“ میں نے بغد ہوتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ استاد نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

پھر ہم نے گنگا اشان کیا، اس دوران استاد نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ میں آج بھی حیران ہوتا ہوں کہ اسے

دن انسان بغیر کھائے پئے کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔ پھر ہم ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچے وہاں کچھ اور ہندو نردوان کی تلاش میں اپنے جسموں کو مختلف طریقوں سے اذیت دینے میں مصروف تھے۔ بعض کے جسم سوکھ کر کاٹا ہو گئے تھے اور ان کی شکل و صورت بھی انسانی نہیں رہی تھی۔ ایک سادھو کو میں نے دیکھا کہ اپنے ناک میں نیکیل ڈال کر نیکیل کے سرے کو درخت کی ایک اونچی شاخ سے باندھ رکھا تھا کہ زمین پر صرف اس کے پاؤں کی انگلیاں لگی ہوئی تھیں۔ میرے استاد نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت ناک اور دردناک بھی تھا اور دلخراش بھی۔ وہ ایک درخت کے تنے کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور دوسرے سادھو نے ایک بڑا لمبا اور موٹا رسا اس کے گرد پوری طاقت سے کس دیا۔ پاؤں سے لے کر گردن تک اس نے اس کے جسم کو ڈھانپ لیا۔ میرے رو گئے کھڑے ہو گئے اگر کوئی اور استاد کے ساتھ اس طرح کرتا تو میں اپنی جان دے دیتا اور استاد کو اس مصیبت سے بچاتا لیکن یہ راہ میرے استاد کی خود پسند کردہ تھی اور ایک مذہبی معاملہ تھا جس میں میں نے کوئی دخل نہیں دے سکتا تھا۔ اتنے میں ایک سادھو نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور پھر غضبناک انداز میں مجھ پر برس پڑا۔

”اوپلچھ (ناپاک) ٹو ہماری پوتر (پاک) زمین کو اپنے گندے وجود سے ناپاک کر رہا ہے، ابھی اسی وقت یہاں سے چلا جا۔ ہمارے باپو نے تمام لیچھوں کو ہندوستان کی پوتر دھرتی سے نکال باہر کیا ہے، ٹو بھی یہاں سے نکل جا۔ مجھے گاؤں ماتا کی قسم ہم تمہیں بھارت ماتا کے دو ٹکڑے کرنے کی سزا ضرور دیں گے۔“

استاد نے زبان بند کر لی تھی، وہ نہ بول رہا تھا نہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے آخری بار استاد کو دیکھا اور جیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ ابھی میں نے دو تین میل سفر طے کیا ہو گا کہ ایک دیرانے میں جو منظر دیکھا وہ دل دہلا دینے والا

فوج کی وردی میں تھے، میں نے اپنی ٹکوار جو میں نے ایک مقتول مسلمان کے سامان سے احتیاطاً لے لی تھی، جلد سے چھپانے کی کوشش کی لیکن ان دونوں نے دیکھ لی پھر انہوں نے ہماری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور گھوڑوں سے نیچے اتر آئے اور ایک چخ کر بولا۔

”لوئے تم دونوں سسلے (مسلمان) ہو؟“ اور پھر انہوں نے کرپا نہیں نکال لیں اور ہم پر حملہ آور ہو گئے لیکن میری پہلوانی کام آگئی، میں نے پوری قوت سے ایک سکھ کو ڈنڈ لگا یا وہ قلا ہازیاں کھاتا ہوا دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ دوسرا کرپاں سے مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کرپاں کا وار کرتا میں نے پوری قوت سے ٹکوار اس کی گردن پر دے ماری اس کا سر اس کے دھڑ سے علیحدہ ہو کر تریبون کی طرح دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ دوسرے نے ابھی پوری طرح اپنے آپ کو سنبھالا بھی نہیں تھا کہ میں اس کے سر پر پٹخ گیا اور اسے دو تین ٹھنڈے لگائے اور ٹکوار ہوا میں لہرائی اور پھر ایک بھر پور وار اس کے موٹے سے پر کیا اس کا ہاز و کث کر زمین پر گر پڑا۔ پھر میں نے دوسرا وار اس کے دوسرے کاندھے پر کیا اس کا دوسرا بازو بھی جسم سے الگ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ میں اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا لیکن ہمارے پاس وقت کم تھا۔ تیسرا وار میں نے اس کی گردن پر کیا، اس کا سر جسم سے علیحدہ ہو تو نہ ہوا لیکن وار کارگر تھا اس کی شاہ رگ کٹ گئی تھی اس کے بچنے کے کوئی چانس نہیں تھے۔ پھر ہم نے ان کی حلاشی لی اور کافی رقم ان کی جیبوں سے ہمارے ہاتھ آئی۔ پھر ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔

سورج غروب ہونے کو تھا جب میرا ساتھی اچانک گھوڑے سے گر پڑا، میں گھوڑا روک کر اس کے پاس آیا اس کی پسلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میرے خیال میں اس کے زخم کھل گئے تھے۔ پھر اسے خون کی تے آئی ایک دو

تھا۔ سو کے قریب مسلمان مقتول پڑے تھے جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں اور تقریباً اتنے ہی زخمی تھے جن کی چخ و پکار سے دل دہل رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ اتنے میں ایک زخمی کو ہوش آ گیا جو زیادہ زخمی تو نہیں تھا لیکن صورت حال کی سنگینی کی وجہ سے حواس پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ پہلے تو وہ گھبرا گیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے اور درویشانہ لباس سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ میں مسلمان ہوں تو اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا اور کہنے لگا۔ ”تم کون ہو اور یہاں کیا رہے ہو؟“

”میں مسافر ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا کہ یہ دلدوز منظر دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے بتا یہ کیا معاملہ ہے؟“

”جسبہیں نہیں معلوم کہ پاکستان معرض وجود میں آ گیا ہے، ہمارا یہ قافلہ پاکستان ہجرت کر کے جا رہا تھا کہ ہندو اور سکھ غنڈوں نے ہم پر حملہ کر دیا اس کے نتیجے میں جو صورت حال ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔“ پھر وہ اٹھا اور باری باری مقتولین کے چہرے دیکھنے لگا اور پھر ہڈیاں انداز میں چیخنے لگا۔ ”سب قتل ہو گئے بیوی، بچے، بچیاں، بھائی، والد، والدہ کوئی بھی تو نہیں بچا۔“

میں نے اسے نسل دلاسا دیا اور مشورہ دیا کہ ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہئے۔ دوسرے زخمی چخ و پکار کر رہے تھے لیکن ہم ان کی قسم کی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ہم نے لاشوں اور زخمیوں کے سامان سے کھانے پینے کا سامان اکٹھا کیا اور ہندو غنڈوں سے بچنے والی کچھ رقم اور زیور اپنی جیبوں میں ڈالا اور اندازے سے ایک طرف چل پڑے۔ ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ دیکھا دو آدمی گھوڑوں پر سوار ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ جب وہ ہمارے قریب آئے تو ہم انہیں دیکھ کر گھبرا گئے۔ وہ دونوں سکھ تھے اور پولیس یا

میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ "ہم کمزروں کو پوجتے ہیں آپ گڑھوں کو۔"

رکتے نے ایک گولی ایم کی ٹکالی، میں نے دودھ کا ایک بڑا پیالہ اسے بھر کر دیا اس نے گولی نگلی جلد ہی اس پر غنودگی طاری ہو ہونے لگی۔

سالانہ میلہ

رکتے کی داستان سن کر مجھے بہت لطف آیا، میں نے کہا۔ رکتے چالیس سال ٹو نے کہاں گزارے اور ہندو جوگی تمہیں کیسے ملا۔ پھر یہ سانپ کا آنا جانا اور نظروں سے لوگوں کا شکار کرنا اور فقیری کے دوسرے گڑھوں نے کہاں سے اور کیسے سکھے؟

"دیکھ نذیر! میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔" رکتے نے کہا۔ "بلکہ تمہیں یہ سارے فن سکھا بھی دوں گا لیکن میلے کے بعد، اب صرف دو دن بعد میلے لگے گا اور ان دو دنوں میں ہم فارغ نہیں ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے رکتے!" میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

میلے کی تاریخ 16 سادون کو طے تھی لیکن رکتے کا پروگرام تھا کہ اس تاریخ کو بدل کر جینٹھ کے آخر کی کوئی تاریخ مقرر کی جائے کیونکہ سادون میں عموماً بارش ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ میلے کی روایتیں ماند پڑ جاتی تھیں لیکن مجبوری یہ تھی کہ عام لوگ اس تاریخ سے ہی متعارف تھے اور لوگوں کے ذہن میں 16 سادون جینٹھ چکی تھی۔ اس دوران رکٹھا اپنی شعبہ ہائیں اور مکاریوں کی وجہ سے کافی معروف ہو چکا تھا۔ اس کی بھری مریدی کا سلسلہ بھی کافی عروج پر تھا اور اس کی آمدنی بے حد بڑھ چکی تھی۔ لہذا اب اسے جعلی کرنسی بنانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے متعلق ایک یہ بات بھی مشہور ہو چکی تھی کہ گونا گور کی دوا اس میں سرایت کر گئی ہے۔ گونا گور کے

پتلیاں لیں اور اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ظاہر ہے میں اس کے کفن دفن کا انتظام نہیں کر سکتا تھا، میں نے اس کی لاش کو بے نور و کفن چھوڑا اور اپنے والا گھوڑا جوڑا کر زور تھا اس کی جگہ دوسرا گھوڑا لیا اور اُن دیکھی راہوں پر چل پڑا۔ میرا گھوڑا تھک چکا تھا۔ آدمی رات کے بعد میں گھوڑے سے نیچے اترا، رنے سے گھوڑے کے پاؤں باندھے اور اسے چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود زمین پر لیٹ گیا۔ جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا اور پھر میں اس وقت جاگا جب بہت سے لوگ مرد، عورتیں، بچے میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں بڑبڑا کر اٹھا۔ صورت حال معلوم کی تو پتہ چلا کہ مسلمان مہاجرین کا قافلہ ہے جو پاکستان کی طرف ہجرت کر کے جا رہا ہے، میں بھی اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ ہم بخیریت پاکستان پہنچ گئے۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا لہذا میں نے ایک خانقاہ پر ڈیرہ لگا لیا لیکن وہ خانقاہ اتنی مشہور نہیں تھی۔ آخر میں اس موجودہ خانقاہ پر پہنچا اور پھر اپنی شعبہ ہائیں اور مکاریوں سے موتیوں والی سرکار بن گیا اور اب جو صورت حال ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔

"نذیر! مذہب کے نام پر لوگ جتنی جلدی ہے وقف بنے ہیں اتنی جلدی اور کسی چیز سے نہیں بنتے۔ میں نے اپنی زندگی میں ہندو مذہب میں جو دھوکہ اور فراڈ دیکھا ہے اور کسی مذہب میں نہیں دیکھا اور ہماری یہ فقیری والی لائن ہندوانہ طریقے سے ملتی جلتی ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ ہمیں پتھر کے بت کھڑے کرنے پڑتے ہیں اور ہمیں قبر اور مزار کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے مولانا آزاد کی یہ بات یاد آگئی جب انہوں نے نہرو کے سامنے ہندو مذہب پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمہاری عقل میں اتنی بات بھی نہیں آتی کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کو پوجتے ہو اور انہیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہو۔ تو نہرو نے جواب دیا تھا۔ مولانا ہم میں اور تم

اگست 2014ء

33

حکایت

داستان ایمان فروشوں کی

مصنف: عنایت اللہ

ان کہانیوں میں آپ کو سلطان صلاح الدین ایوبی اور صلیبیوں کے جاسوسوں اور مخرب کاروں (جن میں حسین لڑکیاں بھی تھیں) سراغرساںوں اور کمانڈروں جاناہزوں کے سنسنی خیز ایمان افروز ڈرامائی تصادم، زمین دوز تعاقب، فرار، محبت اور نفرت کی کش مکش کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں ملیں گی۔

قیمت مکمل سیٹ = 10 روپے

اور ایک بہت بڑی کہانی پیدا ہو جائے گی

ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے دلولہ انگیز، سنسنی خیز، ایمان تازہ کرنے والے اور جذبات کو بلا دینے والے واقعات جن میں ہندوؤں کی عیاری، شہید، بازی بھی ملے گی اور مذہب کے نام پر عصمتوں کا بیچو پار کرنے والے بھی ملیں گے۔

قیمت مکمل سیٹ = 10 روپے

کتابستان

بازار گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ - لاہور

فون: 042-37356541

بارے میں عام لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ سانپ اس کے حکم کے تابع رہتے ہیں۔ پھر لوگوں میں یہ بات بھی مشہور تھی کہ ہر جمعرات کو ایک بہت بڑا سانپ رکھنے کی خانقاہ سے ایک دوسری مشہور خانقاہ پر جاتا ہے جو وہاں سے کئی میل دور تھی اور کافی لوگوں نے ایک بہت بڑے اڑدھے کو اس طرف جاتے دیکھا بھی تھا۔ بہر حال اس قسم کے کئی واقعات رکھنے کے بارے میں مشہور ہو چکے تھے اور وہ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ بن چکا تھا اس کی خانقاہ سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہو چکے تھے اور ان کی دل مرادیں پوری ہوئی تھیں۔ کئی لڑکیاں اور عورتیں ذاتی طور پر بھی اس سے فیض یاب ہو چکی تھیں جو میلے والے دن بن سنور کر آتی تھیں۔ راجہ اندر تو بچا رہ رکھنے کے پاس بھی نہیں ہو گا۔ ہندو جوگی کے بتائے ہوئے سنیا سی نسخے اُسے کسی میدان میں کبھی ہارنے نہیں دیتے تھے۔ اس کی شیطانی اور حیوانی طاقت سے میں بخوبی آگاہ تھا لیکن وہ خود مذاہب الہی میں گرفتار ہو کر ایک خوفناک اور شرمناک بیماری میں گرفتار ہو گیا تھا جس کا تذکرہ میں پیچھے کر چکا ہوں۔

”اچھا تذکرہ! ان باتوں کو چھوڑ۔ میں نے کہا۔“
”اور میلے کے بارے میں بتا۔“

”ہاں قاری صاحب! میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔ جس دن صبح میلہ شروع ہوتا تھا اس رات کو ساری رات ڈھول بجانے والوں نے مسلسل ڈھول بجائے۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ عورتیں نذر و نیاز لے کر خانقاہ میں پہنچنا شروع ہو گئیں۔ روٹ، سرخ اور بکرے سینکڑوں کی تعداد میں آنے شروع ہو گئے جو خانقاہ سے ڈرامٹ کر ایک بہت بڑے احاطے میں جس کے گرد چار دیواری تھی، خدمت گزاروں نے وصول کر کے کھلے چھوڑ دیئے۔ یہ خدمت گزار رکھنے کے مرید تھے جو ثواب سمجھ کر یہ کام سرانجام دے رہے تھے۔ عورتیں رکھنے کے

سامنے نذر پیش کرتیں پھر اُسے سلام کرتیں کئی اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتیں کئی اس کی منگی چاہی شروع کر دیتیں۔ رکھا ایک شان بے نیازی سے ایک گندی گالی بکتا اور کہتا حرام کارو دوسروں کی باری بھی آنے دو۔ عورتیں بے اختیار کہیں بسم اللہ کرے!

مکافات عمل

رکھنے نے مجھے کہا۔ نذر پرا تو اٹھ جا اور خدام سے کہہ کر گندم کے رکھنے کا انتظام کر کیونکہ اب لوگ گدھوں پر گندم لاد کر بھی نیاز لارہے تھے۔ میں نے چند جوانوں کو گودام نما ایک کمرہ دکھایا اور انہیں حکم دیا کہ گندم اس کمرے میں رکھی جائے۔

"ٹھیک ہے ہادامی!" انہوں نے جھک کر بڑے ادب سے کہا۔

پھر میں واپس رکھنے کی طرف چل پڑا کیونکہ ملے کا اصل لطف تو رکھنے کے پاس تھا ابھی میں چند قدم ہی گیا تھا کہ میری نظر ایک پیکر حسن پر پڑی۔ چھوٹا قد، موٹی آنکھیں، پتلی آنکھیں، ناک قلم کی طرح تر بھی ہوئی گوار سے تیز، چاندی رنگ، کمر کے نیچے تک لہرائی ہوئی چوٹی جیسے کالی ناخن، یا قوتی ہونٹ جو اس کے چاندی رنگ چہرے پر مبالغہ کی حد تک سجے ہوئے تھے۔ اس کا انگ انگ نسوانی حسن کا شاہکار تھا۔ میرے قریب آئی اور مجھے جھک کر سلام کیا۔

"موتیوں والی سرکار! میں آپ کی زیارت کے لئے آئی ہوں۔" شاید وہ پہلی مرتبہ آئی تھی۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اُسے اصل موتیوں والی سرکار کا پتہ بتاؤں کیونکہ رکھا اس قسم کے نازک پھولوں کو نسل دیا کرتا تھا۔ اس کے جسم میں زار روں کے راسخو یخن کی روح سرایت کر چکی تھی پتہ نہیں عورتوں کے لئے اس میں کون سی کشش تھی کہ وہ صبح پر پھولوں کی طرح اس کے گرد

منڈ لایا کرتی تھیں۔ رابعہ جس کے عشق نے مجھے دین و دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا اس لڑکی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی گورابعہ اب بھی میرے دل میں بسی ہوئی تھی لیکن اگر کوئی مجھے اختیار دیتا اور میرے بس میں ہوتا تو میں رابعہ کے مقابلے میں اس لڑکی کو ترجیح دیتا اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ یکدم یہ لڑکی میرے حواس پر کیوں چھا گئی تھی۔ میرے خیال میں مرد کی شیطانی فطرت ہے کہ وہ جس عورت سے فائدہ اٹھا لیتا ہے پھر وہ اس کی نظر سے گر جاتی ہے اور پھر وہ دوسری اور تیسری کی جستجو میں جت جاتا ہے اس لئے کسی گھاگ دانشور نے یہ مقولہ تخلیق کی ہے کہ "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔" مرد شکاری ہے اور عورت شکار اور شکاری کو حق حاصل ہے کہ اپنے شکار کو قابو کرنے میں جیسا چاہے حربہ اختیار کرے لہذا یہ ذمہ داری شکار پر آتی ہے کہ وہ اپنا دفاع کرے۔ یقین کریں قاری صاحب! مرد جتنی بزدل جنس دنیا کے تختے پر موجود نہیں بشرطیکہ عورت اپنا دفاع کرنا جانتی ہو کیونکہ غلط روی کی ابتدا عموماً عورت کی طرف سے ہوتی ہے اگر عورت کسی مرد کو دھتکار دے تو یہ دم دھا کر بھاگ جائے گا۔ ہاں بعض دلہ مرد عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر زبردستی پر بھی اتر آتا ہے لیکن یہ شاذ و نادر ہوتا ہے۔ عموماً عورت کی طرف سے حوصلہ افزائی اس گیدڑ کو شیر مٹا دیتی ہے۔

بہر حال میں اس قتالہ عالم کو ایک جھڑے میں لے گیا اور اس سے خانقاہ پر آنے کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگی۔ موتیوں والی سرکار شادی کو دو سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک گودہری نہیں ہوئی، سنا ہے آپ کی دعاؤں میں بہت تاثیر ہے اس لئے نیاز لے کر آپ کے قدموں میں حاضر ہوئی ہوں۔

"ٹھیک ہے ہالک!" میں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کے لئے ہمیں خوش

کرنا ہوگا۔"

"سرکار! آپ جس طرح خوش ہوں گے میں کروں گی۔" اُس نے کہا۔ "آج بھی میں ہمارے کر حاضر ہوئی ہوں اگلے جمعرات مزید نیاز لے کر آؤں گی۔"

"دیکھو ہالک ہم نیاز سے خوش نہیں ہوتے۔"

"سرکار! آپ جس طرح خوش ہوتے ہیں میں اس طرح کر لوں گی۔"

"اوہ پھر سمجھو تمہاری دلی مراد پوری ہو گئی ادھر ہمارے قریب آؤ۔" وہ میرے قریب ہو گئی میں سمجھا کہ چھلی جال میں پھنس چکی ہے لیکن جب میں نے اس سے پیچھے ہٹ کر دیکھا تو اس کے سفید رخساروں پر یکدم گلابی رنگ چڑھ گیا اور پھر وہ گہرا گلابی ہو گیا پھر ایسا محسوس ہوا کہ ابھی رخساروں سے خون بہہ نکلے گا۔ پھر وہ بولی تو اس کی آواز میں تلکے ارتعاش کے ساتھ خود اعتمادی غصے اور تذبذب کی کیفیت بھی کہنے لگی۔

"سرکار! آپ کو یہ حرکات زیبائیں ہیں میں یہاں سائل بن کر آئی ہوں عزت بردار کروانے نہیں اور دیکھو جب میں نے عزت منوالی تو بچے کا کیا قائدہ؟ یہ جسم میرے سر کے سائیں کی امانت ہے، میں بچے پر بھی لعنت بھیجتی ہوں اور تم پر بھی۔" ادھر اس کی جسمانی ساخت اور حسن کی گھمری اوپر سے انکار ان چیزوں نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ قاری صاحب میں حلیہ کہتا ہوں کہاں جیسی جوان، طاقتور، طویل القامت، خواہ صورت لوکی نے میں نے زندگی میں پہلے دیکھی تھی نہ آج تک کہیں نظر آئی ہے میں کسی قیمت پر موقع منوانا نہیں چاہتا تھا۔

"ہالک ادھر دیکھو!" میں نے کہا تو اس نے غیر اختیاری طور پر میری طرف دیکھا اور پھر میری نظروں کے حصار میں جکڑی گئی۔ پھر وہ میرے اشاروں پر ناپنے کے لئے مجبور ہے بس تھی۔ پھر میں دروازہ بند کر کے رکھے

کے پاس پہنچا وہ عورتوں کے جبرمٹ میں بیٹھا تھریں وصول کر رہا تھا، میں اس کے قریب گیا اور اس کے کان میں کہا۔ رکھتے تھے لئے ایک ہیرا کمرے میں بند کر آیا ہوں خدا کی قسم تو دیکھے گا تو پاگل ہو جائے گا اتنی حسین لڑکی تو نے آج تک نہیں دیکھی ہوگی اتنے جلدی کروقت کم ہے یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ رکھنے کی رال چکنے لگی وہ میرے ساتھ چل پڑا میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو رکھے کی آنکھیں تازے لگ گئیں۔

"اوتے تھریا تم نے ٹھیک کہا ہے کیا یہ اسی دنیا کی عورت ہے؟"

"ہاں رکھتے امیری دریافت پر تمہیں کوئی شک ہے؟"

"نذیر دروازہ بند کر دو کوئی دیکھ لے گا، لوگوں کا رش بہت زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔" رکھا کمرے میں داخل ہو گیا میں نے اوپر سے کنڈی لگا دی۔ ذرا ہی دیر بعد رکھے نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور بلند آواز سے کہنے لگا نذیر جلدی سے دروازہ کھول میں نے جونمی دروازہ کھولا۔ رکھے نے ایک کڑا کے دارڈھ میری گردن پر لگایا میں قلابازیاں کھاتا ہوا دور جا کر اب پہلا موقع تھا کہ رکھے نے مجھے مارا تھا۔ میرے حواس پر انگڑے ہو گئے۔ ابھی میں پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ رکھا میرے قریب آیا مجھے گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور ایک زوردار چپت میرے منہ پر رسید کی مجھے دن کو تارے نظر آنے لگے پھر وہ بجلی کی طرح کڑک کر کہنے لگا۔

"بے حیا تمہیں پتہ ہے وہ لڑکی کون ہے؟"

"نہیں رکھتے مجھے معلوم نہیں۔"

"او خالم وہ جنت ہے میری پھپھو کی بیٹی۔" مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن میں نے ہمت کر کے کہا۔ رکھے بھلا مجھے کیا معلوم تھا۔"

ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" رکھے نے بڑے قلق کے

مان گیا کیونکہ اس ناپاک ماحول سے میں خود بھی لکنا نہیں چاہتا تھا لیکن ذرا سا موڈ ہٹانے پر رکھنے کے عتاب سے بھی بچ گیا اور آئندہ کے لئے رکھا بھی مزید محتاط ہو جائے گا۔

جنت حجرے کے دروازے پر کھڑی ہونٹوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اس کا دماغ ابھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل کے صد ہزار ٹکڑے ہو گئے کہ جنت ابھی چلی جائے گی مجھے اس انسان پر جلتی اور اور حسد ہونے لگا جو اس کے جسم و جان کا مالک تھا۔ وہ صرف خوب صورت ہی نہیں خوب سیرت بھی تھی یہ کوئی مردانگی نہیں تھی کہ اسے بے بس کر کے اس کی عزت برباد کر دی جائے وہ اب بھی پاک تھی کیونکہ اس کا دل پاک تھا۔ پھر وہ لگتی منگتی ہماری طرف بڑھنے لگی اور ہمارے قریب آ کر رکھنے کو اور سے دیکھنے لگی پھر اس کے ہونٹ ہلے اور کہنے لگی۔

”موتیوں والی سرکار میں نے اس سے پہلے کہیں آپ کو دیکھا ہے مجھے ایسا یاد پڑتا ہے جیسے آپ میرے والد ماجد پہلوان کے جنازے پر ہمارے گھر آئے تھے اور میرے والد اور والدہ کی میتوں کا دیدار کیا تھا۔“

”نہیں بالکل! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ہم کبھی کسی کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے۔“

”ہاں ہو سکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔“

”بالکل تمہارا نام کیا ہے؟“

”موتیوں والی سرکار! میرا نام جنت ہے۔“

”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

”سرکار! آپ کی دعا لینے آئی ہوں میری شادی کو دو سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی گود ہری نہیں ہوئی۔“

”تمہاری شادی کہاں ہوئی ہے؟“

اس نے ایک گاؤں کا نام لیا۔ وہ گاؤں ہماری خانقاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔

ساتھ کہا۔
”دیکھ رکھنے! اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا گزر اوقت بھی کبھی ہاتھ آیا ہے؟“
”لیکن نذیر! ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

”رکھنے! تو جو سزا دینا چاہتا ہے مجھے دے لے۔“
”میں تمہیں کون سی سزا دوں تو نے وہ جرم کیا ہے جس کی سزا بھی تجویز نہیں کی جاسکتی۔“ پھر یکدم میرے دماغ نے پلٹا کھایا میری ریڑھ کی ہڈی میں درد کی ٹیسس اٹھ رہی تھیں اور میرے گال پر جیسے کسی نے آگ کا انگارہ رکھ دیا ہو میں نے غصے اور جوش کی حالت میں کہا۔

”دیکھ رکھنے! جن عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ تو بے دھڑک گناہ کیا کرتا تھا وہ بھی تو کسی کی بیٹیاں، بہنیں ہی ہوتی ہیں اس وقت تیری غیرت کہاں چلی جاتی ہے۔ جب تو شیطانی کھیل کھیلتا ہے اور بے حیالی کرتا ہے۔ اس وقت تیری غیرت جوش میں نہیں آتی؟ یاد رکھ رکھنے جو کسی کی دمی بھین کی عزت سے کھیلتا ہے اس کی اپنی عزت بھی محفوظ نہیں رہتی۔ بتا تو نے کتنی نازک فلیوں کو سلا ہے اور اب بھی اس بڑھاپے میں بھی تجھے شرم نہیں آتی۔ میں تیرے کروت لوگوں کے سامنے بیان کر دوں تو تیری اولیائی کا لہاوہ تار تار ہو جائے گا۔ اب تو جنت کی لٹی ہوئی عزت کا ماتم کر میں تجھ پر تین لفظ بھیج کر ابھی یہاں سے جا رہا ہوں۔“

رکھنے کو جب کام بگڑتا نظر آیا تو اس کی غیرت جھامک کی طرح بیٹھ گئی وہ منت سماجت پر اتر آیا اور مجھے منانے کی کوشش کرنے لگا گو اسے وقتی طور پر اہل آیا تھا لیکن خبیث اور بے غیرت انسان جد ہی کئی جواز ذہن میں پیدا کر لیتا ہے۔ زانی انسان ایک ایسا بے غیرت حیوان ہے جو خود اپنے ہاتھ سے اپنے گھر کی طرف زنا کا راستہ بناتا ہے۔ میں ٹھوڑے سے تذبذب کے بعد جلد ہی

خواہشات

☆ لامحدود خواہشات محدود زندگی کو عذاب بنا دیتی ہیں جبکہ انسان کی زندگی میں "صبر" اور "شکر" دونوں کا بڑا درجہ ہے کیونکہ صبر مصیبت کو نالتا ہے اور شکر نعمت کو بڑھاتا ہے۔ (نسیم بیکینہ صدف)

ہے۔ پھر اس نے نیاز پیش کی اور دوائی کی قیمت پوچھی۔ رکھنے نے کہا۔ دیکھو بالک ہم تم سے نیاز نہیں لیں گے اور دوائی کے پیسے بھی نہیں لیں گے اور یہ ہمیں آدھ ہوا ہے ہم پیر و مرشد کے حکم کے خلاف نہیں کر سکتے۔

"لیکن سرکار! میں کوئی غریب نہیں ہوں ہم پر اللہ کا بہت فضل ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن ہمیں مرشد کا جو اشارہ ہوا ہے ہم اس کے خلاف نہیں کر سکتے۔"

اب جنت لا جواب ہو گئی رکھنے نے تھیلے سے دونوں ہاتھوں میں بھر کر روپے نکالے اور جنت سے کہنے لگا۔ بالک! جمہولی پھیلاؤ یہ بھی میرے مرشد کا حکم ہے جنت نے جمہولی پھیلائی اور رکھنے نے روپے اس کی جمہولی میں انڈیل دیے پھر اس کے سر پر شفقت سے پیار دیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ سلام کر کے چلی گئی۔ جوں ہی وہ خانقاہ سے باہر نکلی رکھنا زمین پر بیٹھ گیا اور اپنا ایک بازو اپنی آنکھوں پر رکھا پھر وہ اس قدر غائب ہو گیا کہ میرا دل بھر آیا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا اور ایک کان میں شہادت کی انگلی دے کر ترنم سے یہ شعر پڑھنے لگا۔

پاسے پاسے مگنی جوانی پاس نہ سدا یا راں
ساتھی کون محمد بخش! درد و غم خواراں
مان نہ کرے روپ گھنے دا وارث کون حسن دا
سدا نہ رہن شاخاں ہریاں سدا نہ پھول چمن دا

"ٹھیک ہے بالک! ہم تمہارے لئے دعا کریں گے لیکن ہماری کچھ شرائط ہیں اگر تم وعدہ کر لو کہ ہماری شرائط پر عمل کر دو گی تو تمہاری گود ہری ہو جائے گی۔"

"سرکار! میں ہر شرط ماننے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ میرے سر کے سائیں کی حق تلفی نہ ہو۔"

"نہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"پھر بتائیں سرکار!"

پہلی شرط تو یہ ہے کہ تم آئندہ پوری زندگی کسی خانقاہ یا کسی محاور کے پاس نہیں جاؤ گی اگر تم نے ایسا کیا تو پھر ہماری دعا بے اثر ہو جائے گی اور دوسری شرط یہ ہے کہ جب تمہاری گود ہری ہو جائے تو پھر بھی نذر نیاز لے کر اس خانقاہ پر نہیں آنا بلکہ گاؤں کی مسجد میں جو توفیق ہو حصہ دار رہنا یا کسی عید یا عقیقہ کو حسب توفیق رقم ادا کر دینا اور اگر تم ساری زندگی کسی خانقاہ پر گئی تو تمہاری اولاد مر جائے گی اور ہمیشہ بے اولاد رہو گی۔ بتاؤ میری یہ شرطیں منظور ہیں؟"

"جی سوتیوں دانی سرکار! میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں اور آپ کو زبان دیتی ہوں۔ آپ نہیں جانتے ہیں جس باپ کی بیٹی ہوں وہ بھی زبان کا پکا تھا اگر آپ میری والدہ کو کچھ لیتے تو اس کے چہرے پر جہا کی چادر اور ننگی کانور آپ کو ضرور نظر آتا۔" اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔ رکھنے کی آنکھوں میں بھی سادون اتر آیا اور رکھنے نے مجھے کہا۔ نذیر ادھر حجرے سے دواؤں والا اٹھیا لے کر آؤ۔ جب میں واپس آیا تو رکھنے نے جنت کو کچھ دوائیں دے کر اچھی طرح سے سمجھا دیا کہ کون کون سی دوا اس کے خاوند نے کھائی ہے اور کون کون سی اس نے خود کھائی ہے۔

"انچھا اب تم جاؤ اور میری باتوں پر عمل ضرور کرنا۔"

"سوتیوں دالی سرکار! یہ میرا آپ سے وعدہ

پہلے کھڑی کا پروگرام بھی تھا۔ وقت مقررہ پر مختلف علاقوں کی ٹیمیں میدان میں اتریں شائقین کھڑی سے دل بھر کر لطف اندوز ہوئے لیکن ابھی میلے کا سب سے اہم اور دلچسپ پروگرام رات کو ترتیب دیا گیا تھا اور وہ موسیقی کا پروگرام تھا ملک کے مشہور گانے والے اور گانے والیاں آئی ہوئی تھیں لوگ بڑی شدت سے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

اقبال بالو عرف بالو کجری

گانے والیوں میں بالو کجری سب سے معروف اور مشہور تھی۔ خوبصورت نین نقش کے علاوہ اتنی سریلی کہ سامعین کا دل موہ لیتی تھی۔ اس زمانے میں گانے والی کو کجری اور سازندوں کو کجری کہا جاتا تھا۔ ان میں نقال اور بھانڈے بھی تھے جو اپنی باری پر مختلف جھٹتیں کر کے لوگوں کو ہنساتے تھے۔ بالو کجری کی جو مفت عوام میں مشہور تھی وہ یہ تھی کہ وہ شرم و حیا سے بالکل پاک تھی۔ مردوں کے مجمعے میں بے دھڑک اپنے فن کا مظاہرہ کرتی جس شخص سے روپیہ وصول کرتی اس کی گال پر چٹخی ضرور بھرتی۔ مجمعے میں سے جب کوئی روپیہ دکھاتا تو کئی کئی مردوں کے اوپر سے چھلانگ لگا کر متعلقہ آدمی تک پہنچ جاتی۔ بالو نے کئی گیت گائے اور کئی لوگوں کی جیبیں خالی کیں۔ پھر اس نے مخصوص انداز میں ڈانس کیا اس کے سر پر پانی کی چانی بھر کر رکھ دی گئی اب صرف وہ اپنی کمر ہلا رہی تھی جبکہ دوسرے اعضاء بالکل ساکن تھے۔ حتیٰ کہ پانی سے لہا بھری چانی سے ایک قطرہ پانی باہر نہ نکلا۔ رکھا اور میں گاؤں کیوں کے سہارے زمین پر ہمارے لئے بچائے گئے مخصوص قالین پر بڑی شان سے بیٹھے مظلوم ہو رہے تھے۔ بالو شاید تھک گئی تھی اس نے ایک نوجوان لڑکے کی طرف اشارہ کیا اس کے بال شانوں تک لٹکے ہوئے تھے وہ چٹانے نہ کھڑا ہوا تیار اور پھر اس نے اپنے مخصوص

سدا نہ بھور ہمیشہ پھر سدا نہ وقت امن دا
مالی حکم کیوں نہ دیوے اج سیر کرن دا
سنگدے ساٹھی لدھی جانتے سہل بھی سدا ساتھ لدا
جہ نہ آوے فیر محمد جان ایہہ وقت وہاں
مگر شکاری کرے تیاری ہار چہ بندیاں ہرناں
جو چڑھیا اس ڈھینا لوڑک جو تھا اس مرناں
پھوپھا، پھوپھی، والد سوہنا دے مئے وارغ جدائی
جنت توں جھڈ دیتا آتے دچہ جنت کر کے دھائی
پھوپھا جنت تیری میرے کول اج پر دہی آئی
شامت میرے عملوں والی دیتی اونہوں آئی
رکھنے کی سریلی، بلند اور دل سوز آواز پر اس کے
گرو ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ رکھا شاید اپنے حواس میں
نہیں تھا میں نے آگے بڑھ کر رکھنے کو بازو سے پکڑا اور
بڑے ادب سے کہا موسیوں والی سرکار لوگ آپ کا دیدار
کرنے کے لئے آئے ہیں آئیں اپنے آستانہ عالیہ میں
تشریف رکھیں۔

لوگوں کی بہو، بیٹیوں کی عزت سے کھیلنے والا مکار،
معصوم بچوں کا قاتل دھوکے باز، جب اپنے گھر کو آگ
لگی تو حواس کھو بیٹھا لیکن موقع اور صورت حال کی
نزائت کو سمجھتے ہوئے جلد ہی حواس پر قابو پا گیا۔
عقیدت مند جھک جھک کر سلام کر رہے تھے اور وہ ایک
شان بے نیازی سے واپس اپنے حجرے کی طرف چل
پڑا۔ میلہ اب اپنے پورے جوہن پڑا گیا تھا ہزاروں کی
تعداد میں عقیدت مند اور تماشا بین پہنچ چکے تھے۔ مختلف
ڈکانیں ج چکی تھیں۔ کھیل تماشے والے اپنے اپنے
کرتب دکھانے میں مصروف تھے۔ خانقاہ کو چومنے
چاننے والے اپنے کام لگے ہوئے تھے، روٹ، مرنے،
بکرے، پٹنگروں من گندم اور نقدی کے انہار لگے ہوئے
تھے۔ فالودے کی ڈکالوں پر بچوں کا رش تھا۔ منضائی کے
شوہین جلیبی سے شوق پورا کر رہے تھے۔ عصر سے ذرا

ہوتا جیسے گھنگرہ اس کے حکم اور منشا کے مطابق نک رہے ہیں۔ ذرا دیر بعد چمٹا بجانے والا لڑکا اس کے قریب آیا اس نے چمٹے کی آواز گھنگرہوں کے ہم آہنگ کر دی تو ایک ماں بندھ گیا اب بالو بھری نے سر ہاندھی اور رکھے کی جگنی گانے لگی۔

میری موتیاں والی سرکار
لامدی ڈبے بیڑے پار
اس کدی نہ منی ہار
اوئے جیہ میرا جگنی
میری جگنی دے دھامے بے
جگنی اوہے منہوں مجھے
جنہوں سٹ عشق دی جگنی
اوئے جیہ میرا جگنی
سائیں بوڑیاں والیا جگنی
ہم گھنگروں گھنگروں جی سائیاں
تالے گھر گھر بوٹیاں توں لائیاں

رکھنے کے عقیدت مندوں نے بالو بھری پر روپوں کی بارش کر دی۔ رکھا اس کے قریب آیا اس نے دونوں ہاتھوں میں روپے بھرے ہوئے تھے پھر اس نے بالو کے سر پر سارے روپے بھرا اور کر دیئے۔ بالو بھلی کی حیزی سے پیچھے ہٹی اور پھر ایک خاص انداز میں ملتی ہوئی رکھنے کے بالکل قریب آ گئی اس نے ایک گھنٹا زمین پر ٹپکا اور سر کو اتنی حیزی سے گھمائے لگی کہ اس کا پراندہ رختے کے چہرے پر پڑنے لگا۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور سر میں کہنے لگی ساتھ ہی وہ ایک ہاتھ سے رکھنے کی طرف اشارہ بھی کر رہی تھی۔

ایہہ موتیاں والی سرکار
کیڈا بوہتا لپدا درہار
ہانہوں پھڑدا جنہوں اک دار
بیڑا جاندہ اوہدا پار

انداز میں چمٹا بجا کر گانا شروع کیا۔
ملتی حیزی تیرے دیکھنے لوں جوگی اتر پہاڑوں آیا
بھنگی رات میں اس کی سریلی آواز سے مجمع مسجد ہو گیا۔ ظالم نے ایسا لہجہ پایا تھا کہ لوگوں کی آنکھیں تارے لگ گئیں وہ جب خاص انداز سے ہالوں کو جھٹکتا اور آواز کے زیر و بم کے ساتھ چمٹے کی آواز کو ہم آہنگ کرتا تو لوگوں کے ہاتھ غیر ارادی طور پر جیبوں میں چلے جاتے اور پھر لوگوں نے اس پر روپوں کی بارش شروع کر دی۔ رکھا دونوں ہاتھوں سے اس پر روپے ٹپکا کر رہا تھا۔ اس کی سریلی آواز اور انداز بیان نے لوگوں پر جادو کر دیا۔ بالو بھری کے اندر شیطان حلوں کر گیا وہ آگے بڑھی اور اسے سینے سے لگا کر دھمال شروع کر دی اب پورے مجمع پر شیطان مسلط ہو گیا لو جو انوں نے آواز سے کئے شروع کر دیئے تینوں شیطانی ہتھیار ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ آواز دسز اور حسن، دوسرے بھر سمجھ گئے کہ پورے مجمع پر شیطانی اور شہوانی ماحول مسلط ہو گیا ہے یہ نقصان وہ بھی ہو سکتا تھا ہذا انہوں نے بھٹکوں کو اشارہ کیا۔ بھاٹ اپنی مخصوص اور مضحکہ خیز آوازوں سے مجمع کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔

بھاٹوں نے اپنی جگتوں سے بے شمار روپے نوٹے۔ پھر بالو بھری شوخ میک اپ اور بھڑکیلے لباس میں نمودار ہوئی۔ گیس کی روشنی میں میک اپ اور بھڑکیلے لباس میں ایسا محسوس ہوا تھا جیسے بالو بھری ابھی ابھی کوہ قاف سے آئی ہے۔ گیسوں میں دوبارہ جیل ڈالا گیا اور ہوا بھری لگی جس سے ان کی روشنی اتنی بڑھ گئی کہ دن کا گمان ہونے لگا۔ اب بالو رکھنے کے سامنے کھڑی ہو گئی اس نے پاؤں میں گھنگرہ باندھے ہوئے تھے اس نے کمر مٹکائی اور پہنے ایک پاؤں کو مخصوص انداز میں زمین پر مارا گھنگرہوں کی آواز گونجی پھر باقاعدہ ڈاس کرنے لگی وہ اپنے پاؤں اس ترتیب سے زمین پر مارتی کہ ایسا محسوس

تھی کہ اچانک انہیں ایک کما کے کھیت سے آہوں اور سسکیوں کی آواز آئی وہ کھیت میں داخل ہو گئے اور آواز کے رخ پر آگے بڑھتے چلے گئے آخر وہ سستی کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے پاس تاراج وغیرہ کا انتظام نہیں تھا ایک نوجوان نے ماچس کی تیلی جلائی اور سستی کے لباس اور میک اپ سے کچھ گئے سستی ہی ہے لیکن ظالم درندے اپنا کام کر گئے تھے۔ سستی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی ایک نوجوان نے اسے کندھے پر ڈالا اور واپس خانقاہ کی طرف چل پڑے سستی کی آہیں قسم چکی تھیں شاید وہ خوف کی وجہ سے دوبارہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ خانقاہ کے قریب پہنچ کر ایک نوجوان نے زور سے آواز لگائی موتیوں والی سرکار سستی مل گئی ہے بالو بھجری دوڑتی ہوئی آواز کی طرف لپکی ایک آدمی کیس لئے ہوئے اس کے پیچھے گیا جب بالو نے سستی کی حالت دیکھی تو کربناک آواز میں کہیں کرنے لگی۔ ہائے لوگو میں لٹی گئی۔

”ہاں اور وہاں بند کر اور خدا کا شکر ادا کر کہ سستی زندہ مل گئی۔“ کسی نے کہا۔

بالو نے دونوں ہاتھوں کو اپنی رانوں پر مارا اور کہنے لگی۔ ”اس سے مر جانی تو بھرتھی۔ ہائے لوگو! تم نہیں جانتے میرا کتنا نقصان ہوا ہے میری زندگی کی ساری کمائی ضائع ہو گئی ہے۔“

”ہم تیرا نقصان پورا کر دیں گے۔“ موتیوں والی سرکار نے کہا۔

”نہیں موتیوں والی سرکار! میرا نقصان آپ پورا نہیں کر سکتے۔“

”اچھا رونا دھونا چھوڑ اور بچی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر۔“ کچھ دیر بعد سستی کو ہوش آ گیا۔ ظاہر ہے اب پروگرام نہیں ہو سکتا تھا لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ چند خادم اور بالو کے ساتھ آنے والے سازندے، بھاڑ اور دولڑکیاں باقی رہ گئیں۔ رکھنے نے بالو بھجری

اوتے سائیں میریا جگنی
میں منگتی اہے در دی آن
نالے خادم اہے گھر دی آن
متھا اہے قدمیں تے دھر دی آن
اوتے میریا جگنی

رکھا دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے لگا۔ نذر میں آئی ہوئی ساری دولت ایک بھجری پر لٹا دی پھر اپنی انگلیوں سے سونے کی انگوٹھیاں اتار کر بالو کو اپنے قریب بلایا اور اپنے ہاتھ سے انگوٹھیاں اس کو پہنا دیں۔ رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی ابھی سپر رانچے کا سوانگ باقی تھا پوری نیم بانگل تیار تھی۔ چوپک، مٹی، کیدہ، ہیر، رانچہ، سستی تمام مشہور کردار اٹھاڑے میں پہنچ چکے تھے۔ ہیر کا کردار بالو بھجری نے خور ادا کرنا تھا۔ بسب کہ سستی کا کردار کرنے کے لئے ایک خوبصورت نوجوان لڑکی اکھاڑے میں نمودار ہوئی کہ اچانک وہ نوجوان لڑکے سمجھے سے بھاگتے ہوئے اکھاڑے کی طرف آئے۔ ایک نوجوان نے سستی کو کمر سے پکڑا اور کندھوں پر ڈال کر تیزی سے بھاگ نکلا دور لڑکا اس کے ساتھ تھا۔ سب اتنی جلدی میں ہو گیا کہ کسی کے ہم و گمان میں بھی نہیں تھے سب لوگ ششدر و حیران کھڑے دیکھ رہے تھے۔ سستی کی چلیں کچھ دیر تک سناکی دیتی رہیں پھر وہ بھی بند ہو گئیں۔ کچھ نوجوان اندازے سے اس طرف کو بھاگ نکلے جس طرف وہ دونوں لڑکے سستی کو اٹھا کر بھاگے تھے لیکن سستی کا کوئی سراغ نہ مل سکا پتہ نہیں اسے زمین لگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ بالو بھجری بلند آواز سے رورہی تھی ہائے میری بیٹی پھر اس پر غشی سے دور سے پڑنے لگے۔ اب کافی لوگ پاروں طرف پھیل گئے۔ رات کا اندھیرا گہرا تھا اس لئے سستی کی تلاش بہت مشکل ہو گئی تھی۔

کافی دیر تلاش کرنے کے بعد کچھ لوگ خالی ہاتھ واپس آ گئے لیکن ابھی کچھ نوجوانوں نے تلاش جاری رکھی

سے کہا۔ بالو بتا تیرا کتنا نقصان ہوا ہے تاکہ میں وہ پورا کر دوں۔

”موتیوں والی سرکار! آپ میرا نقصان پورا نہیں کر سکتے بس میں نصیبوں جلی اپنی سزا کو پہنچ گئی مجھے سستی کی عزت ملنے کا کوئی احساس نہیں پہلے ہماری کون سی عزت محفوظ ہے لیکن مجھے احساس یہ ہے کہ سستی کی عزت فلاں لوگوں نے لوٹی ہے۔ ابھی تو میں نے اس کی تہہ کھلائی کی رسم ادا کرنی تھی مگر راجے اور نواب اس کی بولی لگا چکے تھے۔ ایک نواب پچاس ہزار بولی دے چکا تھا لیکن میں نے ابھی ہاں نہیں کی تھی۔“

”بالو! تہہ کھلائی کیا ہوتی ہے؟“

”موتیوں والی سرکار! ان معاملات کو آپ نہیں سمجھتے یہ ہمارے خاندانی رسم و رواج ہوتے ہیں۔“

”لیکن ہمیں بتانے میں کیا حرج ہے؟“ رکشے نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”سرکار! تہہ کھلائی یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنی بیٹیوں کو

جن کے ہاؤس کا کوئی پتہ نہیں ہوتا لیکن ہمیں پتہ ہوتا ہے

کہ اس کا ہاؤس فلاں آدمی ہے، جب وہ چھوٹی عمر میں

ہوتی ہیں تو ہم ان کے ناک میں سونے کی ایک تھیلی ڈال

دیتے ہیں جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ لڑکی اب

جوان ہونے والی ہے پھر ہم اس کی حفاظت کرتے ہیں کہ

کوئی مرد اس کے قریب نہ جائے اور یہ بات راجاؤں اور

نوابوں تک پہنچ جاتی ہے کہ فلاں ہائی نے ایک لڑکی کو تہہ

پہنائی ہوئی ہے۔ پھر بڑے بڑے راجے اور نواب بولی

لگاتے ہیں۔ بس جو زیادہ بولی دے وہ تہہ کھلانے کا حقدار

من جاتا ہے اور اس کام میں ہم مکمل ایمان داری سے کام

لیتے ہیں کہ بالکل سچی اور صاف مال اسے مہیا کریں۔ بس

وہ نواب پہلی دفعہ اس کی زندگی میں داخل ہوتا ہے اور اس

طرح اس کی تہہ کھلائی کی رسم ادا ہوتی ہے۔ جب اس کی

تہہ اتار دی جاتی ہے تو بس پھر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اب یہ

کلی نہیں پھول بن چکی ہے۔“

”اچھا یہ بات ہے۔“ رکشے نے کہا۔

”سرکار! میری بڑی بیٹی کی تہہ کھلائی پچاس ہزار

روپے میں ہوئی تھی۔“ بالو کی آنکھوں میں آنسو بھر

آئے۔ ”سرکار! ہمیں بے غیرت کہنے والے خود ہم سے

بھی بڑے بے غیرت ہیں۔ میں جب جوانی کی سرحد میں

داخل ہوئی تو میری ہائی نے میری تہہ کھلائی ایک ریاست

کے نواب سے کرائی تھی۔ میں ابھی چھوٹی عمر میں تھی

نواب پچاس سال سے کسی طرح کم جنہیں ہوگا پورے

بازار حسن میں مجھ سے زیادہ خوبصورت اور کوئی لڑکی نہیں

تھی۔ پچاس ہزار روپیہ کوئی معمولی رقم ہوتی ہے؟ میں

سب کچھ اپنی جان پر سہہ گئی لیکن میرے دل میں اس

نواب کے لئے نفرت اور انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور

پھر میں نے اس سے ایسا انتقام لیا جس کا آپ تصور بھی

نہیں کر سکتے۔ وہ نواب مجھ پر لو ہو چکا تھا آخر میں نے

اسی نواب سے ایک بیٹی کو جتا۔ وہ بڑی بیٹی اسی نواب کی

ہے اور پھر جب میں نے بڑی بیٹی کی تہہ کھلائی کی رسم ادا

کی تو اسی نواب کا بیٹا میرا مہمان بنا اور اپنی بیٹی بہن کی تہہ

کھلائی کی۔ اس رات میں بہت خوش تھی۔ میں نے

بڑے نواب سے الٹا انتقام لے لیا تھا اور اب سستی کے

ساتھ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو ایک نئے وفا سے وہ انتقام

لیتی کہ انسانیت کانپ جاتی۔ وہ واحد شخص تھا جو میرے

دل کو پسند آیا تھا میں نے ہائی سے اس کا ذکر کیا تو میری

ہائی نے ماتھے پر تھوڑی چڑھائی اور غضبناک انداز میں

کہنے لگی۔

”بالو! عشق ہمارا شیوہ نہیں اگر گھوڑی گھاس سے

پیار کرے گی تو کھائے گی کیا؟ کبھری کی اولاد کسی سے

عشق کرے کبھی آج تک نہ سنا نہ دیکھا۔ خبردار! آئندہ

جو ایسی بات منہ سے نکالی۔“

پھر میں نے اس نوجوان نواب زادے کو دل کے

اور ہوں ابھی جوان تھی جو وہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی۔

بالو نے رات کا بقیہ حصہ رکھنے کے حجرے میں گزارا تھا اور پھر وہ ناگن اُسے ڈس مگی رکھا مار فاری (آٹک) میں جٹا ہو گیا تھا۔ وہ ناپاک اور گندی عورت پہ نہیں کتنے مردوں کو اس بیماری میں مبتلا کر چکی تھی۔ یہ بازاری عورتیں عموماً اس مرض میں مبتلا ہوتی ہیں اور ان سے یہ بیماری مردوں میں پھیلتی ہے۔ آج کے زمانے میں ایڈز جیسی موڈی بیماری پھیلانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ آپ انہیں بے شک خاں صاحب اور میڈم کا نام دے لیں بھلا شراب کی بوتل پر شربت کا لیبل لگانے سے اس کی اصلیت تو نہیں بدل جاتی۔ گورنمنٹ نے بازار حسن ختم کر کے اس گندگی کو شہروں، محلوں، پوش علاقوں، لیکسیوں اور شرفاء کے درمیان پھیر دیا ہے یہ گندگی ایک جگہ پر ہی ڈالی جائے تھی یا پھر اس کو جڑ سے منادیا جاتا جو موجودہ حالات میں ناممکن ہے لیکن رکھا ایک ماہر سنیا سی تھا اس نے ہندو جوگی سے طلسماتی نسخے سکھے ہوئے تھے لہذا وہ جلد ہی بیماری پر قابو پا گیا۔ ادھر میں جنت کے عشق میں جٹا ہو گیا تھا اس کے خیالات مجھے کسی ملی جین نہیں لینے دے رہے تھے۔ وہ رکھنے کی پھپھو کی بیٹی تھی لہذا میں اس کے متعلق رکھنے سے ہات نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن جوش جنون میں بھیس بدلا درویش نہ لباس پہنا اور رکھنے سے سیر کرنے کی اجازت مانگی۔ سیر کو فقیری زبان میں بتل کہتے ہیں فور اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی گاؤں میں جا کر خانقاہ کے نام پر نیاز مانگی جائے، رکھنے نے مجھے اجازت دے دی میں سیدھا جنت کے گاؤں پہنچا لیکن دیدار معشوق میسر نہ ہو سکا۔ میں بے دلی سے واپس آ گیا جب میں خانقاہ میں پہنچا تو رکھا اور سہتی دونوں غائب تھیں۔ (رکھا اور سہتی کہاں گئے؟..... شمارہ تقبر "ساگرہ نمبر" میں ملاحظہ فرمائیں)

بہید سے آگاہ کیا تو وہ کہنے لگا۔ بالو تم خوبصورت ہو، لو جوان ہو لیکن ہو تو کجری کی اولاد تم روپے مانگو جتنے مانگی ہو میں دوں گا لیکن تمہیں باعزت طریقے سے اپنالوں یہ خیال بھی دل سے نہ لانا۔ سہتی اس نواب زادے کی بیٹی ہے اور اسی نواب زادے نے اپنی بیٹی کی قیمت پچاس ہزار روپے نکالی ہے مگر اسوس میری یہ سکیم کامیاب نہ ہو سکی۔ بالو نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھ بالو! رکھنے نے مکارانہ انداز میں کہا۔ "میں تمہیں پچاس ہزار روپے ادا کر دیتا ہوں۔"

"نہیں سرکار! اب اس کی اتنی قیمت نہیں رہی نصف قیمت پر میرا اور تمہارا سود اٹکا ہے۔" مجھے منظور ہے۔" رکھنے نے جلدی سے کہا اور پھر سہتی ہمارے پاس رہی۔

جب دن چڑھا تو میں نے بالو کجری اور بھانڈوں، کجروں کو دیکھا تو مجھے حلی سی ہونے لگی۔ اُن کے جسموں سے ٹھنڈے والی گھنیا میک اپ اور جس طے سگریٹ کے دھوئیں کی ملی جلی فو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ بالو کجری کا بے نور اور جھریوں بھرا چہرہ جسے میک اپ کی تہوں نے چھپا رکھا تھا۔ دانتوں پر پان کے گندے سرخ و زرد داغ، مردانہ آواز، مصنوعی چوٹی وہ لکھڑو نما عورت نظر آ رہی تھی۔ گیس کی روشنی، گہرے میک اپ، بھڑکیلے لباس، لمبی مصنوعی چوٹی کے پس پردہ جوانوں کے دلوں پر راج کرنے والی ہالودن کی روشنی میں کسی جیل سے کم نہیں تھی۔ میرے دل سے بالو کی رات والی شخصیت گندھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گئی۔ کاش دوسرے تلاش میں بھی اسے دن کی روشنی میں دیکھ لیتے تو بالو کی اداؤں پر آج میں نہ بھرتے البتہ سہتی اور اس کی بڑی بہن عمر کے اس حصے میں تھیں جس میں بد صورتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالو بھی کبھی خوبصورت ہو گی لیکن اب کھنڈرات میں تہہ دل ہو چکی تھی لیکن اس کی مال کی حرص

اس انگریز ڈپٹی کمشنر کا قصہ جس نے ڈاکوؤں کو
اپنے گھر میں ڈاکہ ڈالنے کا چیلنج دے رکھا تھا۔

ڈاکو اور ڈپٹی کمشنر



ماشق حسین



تک پہنچنے کی پوری پوری کوشش کرتی تھی۔ اس زمانے
میں گاؤں میں پولیس کا سپاہی آ جاتا تو ہر طرف خبر پھیل
جاتی کہ تھانہ آیا ہوا ہے، خدا نکر کرے، کوئی خاص بات
ہے کہ حکومت کا آدمی آیا ہے۔

ایک انگریز ڈپٹی کمشنر نیا نیا انگلینڈ سے خلع
راولپنڈی میں تعیناتی کے لئے آیا۔ جب بھی کوئی انگریز
اگر ہندوستان میں آتا تو اسے ہندوستان کی مختلف
قوموں کے بارے میں مکمل معلومات دی جاتی تھیں تاکہ
وہ تاج برطانیہ کے لئے اچھی طرح حکومت اور کنٹرول کر
سکے۔ اس انگریز ڈپٹی کمشنر کو بتایا گیا کہ یہاں ہندوستان
میں بڑی بڑی ٹیپ قسم کی وارداتیں ہوتی ہیں جن میں
ڈاکے اور چوریوں وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا کھرایا کھوج

یہ کہانی مجھ سے تقریباً بیس سال بڑے ایک
دوست نے سنا لی تھی۔ میری عمر اس وقت ساٹھ
کے لگ بھگ ہے۔ یہ واقعہ پاکستان بننے سے بہت پہلے کا
ہے۔ اس نے اپنے باپ سے سنی تھی۔ اس وقت لوگوں کی
صحبتیں بہت اچھی ہوتی تھیں۔ چائے، سگریٹ اور بنا ہتی
تھی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اکثر لوگ پیدل ہی سفر کرتے
تھے۔ وہ زمانہ جوانمردوں اور بہادروں کا تھا۔ لوگ ایسے
ایسے بہادری کے کارنامے کرتے تھے کہ موجودہ دور میں
ناممکن نہیں تو مشکل ضرور محسوس ہوتے ہیں۔

انگریزوں کا راج بڑے زوروں پر تھا۔ قتل یا ڈکیتی
وغیرہ کی واردات ہو جاتی تو لوگ بھی تعیش میں بڑی
دلچسپی لیتے اور پولیس بھی دل و جان سے اصل مجرموں

لگانا بڑا ہی مشکل کام ہوتا ہے۔ بعض وارداتیں اس قدر دلیرانہ قسم کی ہوتی ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتے ہیں۔

سنے ڈپٹی کمشنر نے ایس پی کو جو انگریز تھا، کہا کہ میرے بچلے پر چوبیس گھنٹے پولیس کی سطح کا رد موجود رہتی ہے۔ میرے پاس دو خوشخوار کتے چوکیداری کے لئے رات کو کھلے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میرے علاقے میں پولیس گشت پر راتی ہے۔ یہاں بھی ساری رات ملتی رہتی ہیں۔ کیا ایسے حالات میں بھی چور میرے بنگلے سے چوری کر کے جاسکتا ہے؟

ایس پی نے جواب دیا کہ ان مذاہیر کے باوجود چوری کا امکان ہو سکتا ہے۔

”میرا ذہن نہیں مانتا۔“ انگریز ڈی سی نے کہا۔
”اسے سخت انتظامات کے ہوتے ہوئے بنگلے کے قریب بھی کوئی آنے کی جرأت کر سکے، چہ جائیکہ بنگلے کے اندر آ کر کوئی چیز چوری کر کے نکل جائے۔“

انگریز کی حکومت اور پولیس کی دہشت بھی اتنی زیادہ تھی کہ رات کے وقت تو کیا دن کے وقت بھی کوئی اس طرف جانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ڈی سی کے اصرار پر ایس پی نے کہا کہ اگر آپ ہندوستانی قوم اور خاص کر مسلمان کو آزمانا چاہتے ہیں تو اخبار یا اشتہار کے ذریعہ آدما کر خود تجربہ کر لیں۔

آخر یہ طے ہوا کہ ایک اشتہار دیا جائے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے بنگلے کے اندر سے جو کوئی آدمی چوری کر کے نکل جائے گا اس کو پانچ سو روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔ اگر وہ پولیس اور کتوں کے ہاتھوں مارا گیا تو وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ اگر موقع پر نہ مارا گیا یا گرفتار نہ ہوا تو اسے پیش ہونے پر پانچ سو روپیہ نقد انعام دیا جائے گا اور گرفتار بھی نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی سزا دی جائے گی۔

اشتہار نکلے تقریباً دو ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ بات اڑتے اڑتے چکوال کے درمیانی علاقے میں پہنچ

گئی۔ آدمی کا اصل نام تو مجھے یاد نہیں رہا۔ آپ فرضی نام امیر باز رکھ لیں۔ اس آدمی کا نام دس نمبر میں لکھا ہوا تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے جرائم میں مشہور تھا۔ گاؤں کے باہر چوپال پر اکثر لوگ فارغ وقت میں بیٹھ کر گپ شپ لگایا کرتے تھے۔ امیر باز بھی اُس وقت وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ جب ڈی سی کے اشتہار کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ امیر باز خاموشی سے سنتا رہا۔ اُس نے پوچھا کہ دو ماہ گزرنے کے بعد بھی چوری کی نیت سے ڈی سی کے بنگلے پر کسی کے جانے کی کوئی خبر بھی ملی ہے یا نہیں۔ ایک آدمی نے بتایا کہ اگلے ہی دن پنڈی سے ایک سرکاری آدمی جو کہ ہمارے گاؤں کا ہے، چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک کسی کو وہاں جانے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ یہ تو موت کے منہ میں جانے کے برابر ہے۔

امیر باز نے مضمم ارادہ کر لیا کہ میں مر جاؤں گا یا انگریز ڈپٹی کمشنر کو ایسا سبق دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ چونکہ وہ دس نمبر پر تھا، اس لئے اس کو اپنا گاؤں چھوڑنے سے پہلے اپنے نمبردار، چوکیدار کو مطلع کرنا پڑتا تھا۔ وہ اس واردات کو کم سے کم وقت میں مکمل کرنا چاہتا تھا۔ لہذا اُس نے اس سکیم پر عمل کرنے کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔ کتوں کے لئے اس نے بیلوں کے دو سینک تلاش کئے جن میں خالص گھی کی روٹی کی بخوری بنا کر سینگوں میں اچھی طرح بھر دی تاکہ کتوں کی کوشش کے باوجود چوری آسانی سے نہ نکل سکے۔

اُس زمانے میں سوائے ریل کے آنے جانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لہذا عام لوگ چالیس چالیس کوس پیدل چلتے تھے۔ ہمارے علاقہ کے لوگ جہلم اور گوجرانہل تک پیدل ہی سفر کرتے تھے۔ امیر باز صبح سویرے نمبردار کو ملا تاکہ اسے معلوم ہو کہ امیر باز گاؤں میں موجود ہے۔ چکوال سے راولپنڈی کا راستہ بہ نسبت سڑک کے پیدل کا نزدیک ہے۔ امیر باز پچھلے پہر ڈی سی کے بنگلے کا جائزہ

برآمدے کے اندر چلا جائے۔ یہ موقع جلد ہی میسر آ گیا۔ سنتریوں کی پیٹھ ایک دوسرے کے مخالف تھی۔ امیر باز چھلاوے کی طرح اُچھل کر برآمدے کے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

امیر باز درمیانے قد کا آدمی تھا۔ بدن میں ہلاکی جیسی کے علاوہ دوڑ میں اتنا تیز کہ دوڑتے ہوئے بالکل چھلاوہ نظر آتا تھا۔ اُسے یہ یقین تھا کہ واردات کے بعد جگہ کی حدود سے نکل گیا تو پھر سنتریوں کا ہاپ بھی اُسے نہیں پکڑ سکتا تھا۔ دوسرا موقع ملتے ہی وہ بنگلے کا جالی والا دروازہ کھول کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ لکڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ تمام جائزہ لینے کے بعد بنگلے کے وسطی کمرے کے قریب پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ درمیان میں بہت بڑا بنگلہ بچھا ہوا ہے اور مدھم لائٹ جل رہی ہے۔ بنگلے پر ایک طرف صاحب اور دوسری طرف میم صاحبہ سوئی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں لکڑی کی بنی ہوئی بڑی بڑی دو تین الماریاں پڑی ہوئی تھیں اور چڑے کے سوٹ کیس بھی تھے۔ اُس نے ایک سوٹ کیس کو کھولا تو اس میں چاندی کے روپے پڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت لوٹ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اُس نے خاموشی سے اپنی کمر کے ساتھ بندی تہبند کے پلو میں چاندی کے روپے ایک ایک کر کے رکھنے شروع کر دیے جب پلو بھر گیا تو اُس نے اچھی طرح کاٹھ باندھ لی۔ اب وہ نکلنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ اس کی نظر میم صاحبہ کے ہار پر پڑ گئی جو اُس کے گلے میں پڑا ہوا تھا اور اُس کے موتی مدھم روشنی کے باوجود چمک رہے تھے۔ اُس نے سوچا کہ وہ ہار اتارنے میں کامیاب ہو جائے تب ہی چیلنج کا صحیح جواب ہوگا۔

میم اور صاحب گہری نیند سوئے ہوئے تھے، امیر باز نے مدھم روشنی میں دیکھا کہ ہار کی ہک میم کی گردن کی دائیں طرف لگی ہوئی تھی۔ اس نے دم سادھے ہار کے ہک کو کھولنے کی کوشش کی۔ ہک تو کٹھڑے سے

لینے کے لئے راوی پنڈی پہنچ گیا۔ اس نے سنتریوں کو ڈیوٹی پر گشت کرتے دیکھا۔ بنگلے کی باہر کی دیوار عام آدمی کی کمر تک اونچی تھی۔ جیسا کہ اُس وقت عام بنگلوں کی ہوتی تھیں۔ دیوار کے اندر بھتروں کی ہاڑ لگی ہوئی تھی۔ اس کے صحن یا لان کے اندر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھولدار پودے لگے ہوئے تھے۔ بنگلے کے چاروں طرف برآمدے تھے۔ برآمدوں کے تقریباً چار چارٹ چوڑے ستون تھے۔ امیر باز کو اندر جا کر کوئی بھی چیز اٹھالے جانی تھی اور یہ ثابت کرنا تھا کہ ہندوستان میں ایسی قوم بھی رہتی ہے جو اتنی دلیر ہے کہ جان کی ہمدانے بغیر ہر چیلنج قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

آخر آدمی رات کے وقت وہ بنگلے کی باہر کی دیوار کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا اور سنتریوں کا جائزہ لینے لگا۔ کتوں کو بھی دیکھا جو کوشی کے لان میں ادھر ادھر بھر رہے تھے۔ سب سے پہلے اُس نے دونوں سینک جن میں خالص گھی کی روٹی کی خوشبو تھی، اندر کی طرف بڑے آرام کے ساتھ رکھ دیئے۔ خود دس پارہ گز دیوار کے آگے کی طرف سے سرک گیا۔ کتوں نے جو خوشبو سونگھی تو وہ سینکوں میں سے پوری نکالنے میں لگ گئے اور سینکوں کو تھپتھپتے کافی فاصلے پر لے گئے۔ اب اُس نے سنتریوں کو دیکھا جو گل چار تھے، وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد برآمدے کے باہر ایک دوسرے کو کراس کرتے تھے۔ انہوں نے رائلیں اٹھا رکھی تھیں مگر معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے اب وہ سمجھ چکے ہیں کہ یہاں آنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ چیلنج کئے ہوئے عرصہ دو ماہ سے زائد گزر گیا تھا۔ اس لئے وہ کچھ شست بھی ہو گئے تھے۔

بہر حال امیر باز اللہ کا نام لے کر دیوار کے اندر جا کر پودوں کی لوٹ میں بیٹھ گیا۔ وہ اس موقع کی تلاش میں ہی تھا کہ جو بھی سنتری تھوڑے فاصلے ہوں تو وہ

کل مکی مگریم نے سونے کی حالت میں اپنا ایک ہاتھ گردن پر الٹا پھیرا اور ساتھ ہی کروٹ بدل کر دوسرے پہلو ہو گئی۔ اب ہارکل کراہی کی گردن اور کندھے کے درمیان بستر پر بڑا ہوا تھا۔ امیر باز پنگ کے نیچے ہو گیا۔ تقریباً پانچ منٹ گزرنے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ میم اب دوبارہ غیند میں ہو گئی ہے تب اس نے پنگ کے نیچے سے کل کر ہار کو آہستہ آہستہ کھینچنا شروع کر دیا حتیٰ کہ وہ ہار نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے وہ ہار اپنی تہیند کے دوسرے پہلو میں ابھی طرح کس کے ہاتھ لیا اور کمر کے ساتھ اپنی تہیند کو لپیٹ لیا۔ امیر باز اندر سے جالی والے دروازہ کے ایک سائیڈ پر کھڑا ہو کہ چند لمحے یہ دیکھتا رہا کہ سنتری کب ادھر ادھر ہوتے ہیں۔

جلد ہی باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ وہ کمرے سے کل کر برآمدے کے چوڑے ستون کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اب اُسے لان اور باہر والی دیوار کو پھلانگنا تھا۔ کتے ابھی تک اپنی ناکام کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ وہ سیٹوں سے بھری ٹکال لیں۔ امیر باز نے اللہ کا نام لے کر موقع پاتے ہی دوڑ لگائی اور لائن عبور کر کے دیوار چاندی اور سڑک کراس کرتے ہوئے دوڑ پڑا۔

سنتری بیدار ہو گئے اور انٹ خدش گولیاں چلانے لگے۔ امیر باز پگڑیوں کے رستوں سے بھاگ رہا تھا۔ وہ ہاتی رات اور سارا دن چلا رہا اور دوسری رات دس گیارہ بجے اپنے گھر پہنچ گیا۔

اس واردات کے بعد جو حالات بعد میں اُس کو معلوم ہوئے وہ کچھ اس طرح ہیں کہ ڈپٹی کمشنر اور اُس کی میم جاگ پڑے۔ پہلے تو انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ چاندی کے روپے سوٹ کیس سے قاعب ہیں۔ انہوں نے معمولی سی چوری کو کوئی خاص اہمیت نہ دی مگر جو میم صاحب کو احساس ہوا کہ اُس کے گلے میں قیمتی ہار نہیں ہے تو اس نے اُدھم مچا دیا وہ

عام قسم کا ہار نہیں بلکہ بڑا ہی قیمتی ہار تھا۔ ایس بی صاحب اور ضلع کے انگریز اسٹیشن ہو گئے۔ علاقے کا چھپ چھپا چھان مارا لیکن مجرم کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ ڈی سی حیران تھا کہ اتنی بڑی احتیاطی تدابیر کے باوجود یہ دلیری کس شخص نے کی ہے۔ ڈی سی کہتا تھا کہ چور قیمتی ہار واپس کر دے اور وعدہ کے مطابق اس کو 5 سو روپیہ نقد انعام کے علاوہ سرٹیفکیٹ بھی دیا جائے گا۔ اشتہار دے دیے گئے اور اخبار میں بھی خبر چھپوائی گئی۔ چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی چور کا سراغ نہ مل سکا۔ ادھر میم صاحبہ تنگ کر رہی تھی کہ ہر قیمت پر ہار واپس دلایا جائے۔ ہار کی نوٹو کالی اور نقشے کی کالی ہر قحانے میں بھجوائی گئی اور تاکید کی گئی کہ چوری کا سراغ لگانے والے کو بہت بڑی ترقی سے نوازا جائے گا۔

ادھر امیر باز چوری کی ہوئی رقم سے اپنے گھر کے اخراجات چلاتا رہا۔ اس وقت چاندی کا ایک روپیہ آج کل کے دو سو روپوں کے برابر تھا۔ اُس کی صرف ایک ہنگی اور بیوی تھی اس لئے بغیر کام کے بڑے آرام سے دن گزر رہے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ خواہ مخواہ پیش ہو کر اپنے آپ کو منجھٹ میں کون ڈالے۔ ایسا نہ ہو کہ انگریز سرکار میچ کے لئے قید خانے میں ڈال دے۔ ہار اُس کی بیوی نے مٹی کی ایک ادلی میں ڈال کر رکھا ہوا تھا جو لاہور اسی کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ اُس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ بہت ہی قیمتی ہار ہے۔ ایک دن اُس نے ہار کے دو موتی نکالے اور قریب ہی قصبے میں سٹار کے پاس لے گئی اور کہا کہ میری بچی کے لئے چھوٹی سی ہالیاں بنا دو اور ان میں یہ دونوں موتی لگا دو۔

سٹار نے جب موتیوں کو دیکھا تو اس نے امیر باز کی بیوی کو بتایا کہ یہ تو بہت قیمتی موتی ہیں۔ یہ تم نے کہاں سے لئے ہیں؟ اس نے جھوٹ بول کر کہا کہ میرا خاوند اپنے گاؤں کے قریب مٹی کھود رہا تھا، پرانے زمانے کی

راولپنڈی ایس پی کے سامنے پیش کیا گیا۔ فوراً اپنی کشتی کو اطلاع دی گئی کہ آپ کا ہارل گیا ہے۔ یہ امیر باز کے گھر سے برآمد کر لیا گیا تھا۔ ڈی سی اور اس کی میم نے فوراً اُن کو طلب کر لیا۔ جب انہوں نے امیر باز کا علیہ اور ظاہری جسم وغیرہ دیکھا تو انہوں نے کہا کہ یہ ہار تو ہمارا ہی ہے مگر یہ چور ہمارا نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے آدمی کی اتنی جرات ہو ہی نہیں سکتی کہ اتنی بڑی ہمت کر کے ہار گلے سے اتار کر لے جائے۔

ایس پی نے اس کو کہا کہ وہ اپنی زبان تمام طریقہ واردات صاحب بہادر کو سنائے۔ امیر باز نے تمام کہانی سنائی اور جرح کا جواب مکمل طور پر دیا۔ یہاں تک بتایا کہ میم صاحبہ نے اس طرح اپنی گردن پر ہاتھ بھی پھیرا تھا جس وقت میں ہار اتار رہا تھا۔ وہ حیران بھی ہوئے اور مکمل یقین بھی کر لیا کہ ہمارا ہار اسی شخص نے چھاپا ہے۔ اگر بڑ صاحب نے اُسے کہا کہ تم نے ہمیں سخت پریشان کیا ہے۔ اگر تم واردات کے فوراً بعد اطلاع دے دیتے تو ہمیں خوشی ہوتی مگر پھر بھی وعدہ کے مطابق تمہیں تنگ بھی نہیں کیا جائے گا۔ لہذا امیر باز کو باعزت طور پر بری کر دیا گیا اور تاکید کی گئی کہ آئندہ وہ باعزت زندگی گزارنے کی کوشش کرے۔

امیر باز نے آئندہ شریفانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں علاقے کے ایک بزرگ کے ہاتھ بیعت کرنی چاہی تو اس بزرگ نے اُسے کہا کہ بیعت تو میں تمہیں کر لیتا ہوں مگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ چوری چکاری نہیں کرو گے۔ اس نے وعدہ کر لیا مگر چوری سے تو جا سکتا ہے پھر پھیری سے نہیں جاتا۔ کبھی کبھار موقع ملتا تو وہ چھوٹی موٹی واردات اور گلے شکنی کر لیتا۔ کسی نے اُن بزرگ شخصیت کو بتایا کہ امیر باز اب بھی چکر چلاتا رہتا ہے مگر موقع پر نہ بکڑے جانے کی وجہ سے قح جاتا ہے۔ انہوں نے امیر باز کو بلایا اور کہا کہ آئندہ اگر کوئی ایسی

کھائی ہے، وہاں سے یہ دونوں موتی لے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اپنی بیٹی کی ہالیاں میں ڈالوں۔ اب میں یہ موتی تمہارے پاس لے آئی ہوں۔ سار نے اس بیان کو صحیح سمجھ کر ہالیاں بتا دیں جو ماں نے اپنی بیٹی کے کانوں میں ڈال دیں۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بیٹی ایک دن مکان کے باہر بیٹھی رو رہی تھی۔ پولیس کا ایک حوالدار جو کسی گفتیش کے سلسلے میں نمبردار کے پاس آیا ہوا تھا، امیر باز کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ بیٹی کے رونے کی وجہ سے نظر اس پر پڑی تو اس نے بیٹی کا علیہ جو عام غریب کے بچوں کا ہوتا ہے دیکھا۔ اس کی نظر اس کی ہالیاں پر پڑی۔ موتی چمک رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ عام موتی نہیں بلکہ کوئی خاص قسم کے موتی ہیں۔ اُس نے نمبردار سے پوچھا کہ یہ بیٹی کس کی ہے۔ اُس نے بتایا کہ یہ امیر باز کی بیٹی ہے جس کا نام دس نمبر میں ہے۔ حوالدار کو کچھ شک ہوا۔ اُس نے بیٹی کو نزدیک جا کر دیکھا تو موتیوں کی شکل اس ہار کے موتیوں سے ملتی جلتی تھی جو کہ اُن کے پاس ڈی سی کی میم کے ہار کا نقشہ تھا۔ وہ میں بطور ریکارڈ پڑا ہوا تھا۔ اُس نے امیر باز کو بلوایا اور کہا کہ یہ ہالیاں تھانے لے جا رہے ہیں بلکہ تمہیں واپس کر دیں گے۔

نظر یہ کہ موتی شناخت ہو گئے۔ امیر باز پہلے ہی مشکوک آدمی تھا لہذا اُسے فوراً تھانہ طلب کیا گیا۔ تھانیدار نے اُسے کہا کہ پھر بھی کہ تم خود ہی اپنی زبان سے بتا دو کہ یہ موتی تم نے کہاں سے لئے ہیں ورنہ مار مار کر پٹی پٹی ایک کر دوں گا۔ پہلے تو امیر باز نے آئیں بائیں کی مگر اس کو معلوم تھا کہ اُسے اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک میں ان کو ان موتیوں کا ثبوت نہ مہیا کر دوں۔ چنانچہ اس نے واردات کا مکمل اعتراف کر لیا۔

تھانیدار بہت خوش تھا کہ اس نے بہت بڑا کیس کھڑا ہے جو اس کی ترقی کا باعث ہو گا۔ امیر باز کو

حرکت کی تو وہ خود سدا رہوگا۔

موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ نوجوان اپنی ذہنی
اور جسمانی صحت کی طرف توجہ دیں
نئی نسل پر کٹھن فخر دار لوگوں کا بوجھ
آپڑا ہے

ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے ہم وہ
کتاب پیش کر رہے ہیں جس کے
آپ کو شدید ضرورت ہے

ڈاکٹر نصیر امین شیخ ایم بی بی ایس
اور
میم الف کی مشترکہ کتاب



آپ کی سرائف سنی جسمانی صحت اور نفسیاتی صحت
کا صحیح اور سہل حل پیش کرتی ہے
سفید کاغذ، آفس طبعیت
خود صورت نگرد پش، قیمت روپے
جو طلباء و کائیت کے دفتر سے کتاب خریدیں گے
انہیں ایک روپیہ رعایت پیش کی جائے گی۔
نسخہ لکھتے۔۔۔

ملکتہ داستان لٹریٹ

چند ہی دنوں بعد ایک ہندو کے گھر کا تالہ توڑا گیا
جو قریب کے گاؤں میں رہتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور
ہندو مع اہل خانہ چھت پر سو رہا تھا۔ ہندو کو شکست ہوا کہ
نیچے مکان میں کوئی آدمی ہے۔ اُس نے شور نہ مچایا بلکہ
آہستہ آہستہ چھت سے اتر کر اُس کمرے کا باہر سے کنڈا
لگا دیا جس کا کہ تالہ لٹا ہوا تھا۔ امیر باز اندر ہی تھا۔ ہندو
نے شور مچانا شروع کر دیا۔ گاؤں کے چند آدمی لالچیاں
لے کر ہندو کے گھر پہنچ گئے۔ پانچ چھ آدمی دروازہ کھول
کر اندر گئے۔ لالچین سے چار پائیوں کے نیچے دروازے
سے آ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ امیر باز پہلے ہی ہوشیار ہو
چکا تھا۔ چنانچہ وہ گھڑوئی (جور ضائیوں وغیرہ رکھنے کے
لئے اونچی جگہ بنائی ہوتی ہے) پر چڑھ کر چھت کے مہتر
کے کنڈے میں پاؤں کی انگلیاں پھنسا کر مہتر کے ساتھ
چھت کی طرح چھت گیا۔ جو نیچے قصبے کے ٹوک دروازے
سے دُعا آگے چار پائیوں کے نیچے تلاش کرنے لگے تو وہ
اوپر سے چھٹا لگا کر باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ مچن سے
لگنے کے بعد آدمی بھی اُس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ باہر
کھیتوں میں آگے آگے وہ دوڑ رہا تھا اور پیچھے پیچھے گاؤں
کے آدمی دوڑ رہے تھے۔

ویسے تو اس کو پکڑنا مشکل تھا مگر اندھیرے کی وجہ
سے ایک اونچے مینڈھ سے پاؤں ٹکرا گیا جس کی وجہ سے
وہ گر گیا۔ اب وہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ
پیچھے سے آدمی پہنچ گئے۔ پہلے تو اُس کی خوب ٹھکانی کی
بعد میں اس کو تھانے لے گئے۔ کیس چلا، چھ ماہ سزا ہو
گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے بزرگوں کے ساتھ وعدہ
خلائی کی ہے لہذا یہ سزا مجھے ملی ہے۔ سزا کاٹنے کے بعد
اس نے شریطانہ زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ وہ بہت
بوڑھا ہو کر فوت ہوا تھا۔



پہلی قسط

دریغ و غمراں

موم سے پتھر بن جانے والے لایک شریف انفس قبائلی نوجوان کی سنسنی خیز سیرگزشت۔



”نہیں۔“ اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”آپ بالکل بے ہوش نہیں ہوئے تھے۔ یقین نہیں آتا تو اپنے سامنے رکھی قبوے کی پیالی چیک کر لو۔ مجھے یقین ہے کہ قبوہ ابھی تک گرم ہوگا۔“

میں نے پیالی کو چھوا تو وہ واقعی گرم تھی لیکن میرا شک پھر بھی دور نہ ہوا، میں نے کہا۔ ”پیالی میں گرم قبوہ بھی تو ڈالا جاسکتا ہے؟“

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے اگر آپ

یہاں سے بٹے ہوتے تو تب

ورنہ آپ کی موجودگی میں یہ

کیسے ممکن ہے؟“

”تو پھر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے

کہ میں بے ہوش ہوا تھا؟“

وہ ہنس کر بولا۔ ”یہ اس قبوے

کا کمال ہے کہ آپ کو ایسا لگتا

ہے۔ ورنہ حقیقت میں ایسا

کچھ بھی نہیں ہوا۔“

”مطلب قبوے میں کچھ

ملا گیا تھا؟“ میں نے مشکوک

انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔“ اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”یہ محض آپ کا وہم ہے قبوے میں کچھ بھی نہیں ملا گیا تھا۔ یہ اس قبوے کی تاثیر ہے کہ پہلی بار بیٹے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بے ہوش ہو گیا ہے مگر حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ بیٹے والا پوری طرح ہوش میں رہتا ہے تاہم وقتی طور اُس کے دل و دماغ میں بالکل ضرور کچ جانی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو اب کی بار پیالی کر دیکھ لیں، اس بار آپ کو ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہوگا۔“

میں نے قبوے کی پیالی اٹھا کر ایک بار پھر لبوں

سے لگا لی اور گھونٹ گھونٹ کر سارا قبوہ پی گیا مگر اس

میں جب دوبارہ ہوش میں آیا تو میں نے خود کو اسی

صوفے پر پایا۔ ڈرائی فروٹ کی پلیٹ اور قبوے

کا نصف کپ بدستور میرے سین سامنے سنٹرل ٹیبل

پر رکھے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میں الجھن کا شکار

ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے میں بے ہوش ہوا ہی نہیں ہوں۔

مگر مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ قبوے کا نصف کپ پینے کے

بعد میں بے ہوش ہوا تھا۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل

تھا؟ اس بارے میں مجھے کچھ

بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے

ایسے ہی وال کلاک پر نظر ڈالی

تو ٹھیک دس بجنے والے تھے۔

میری الجھن مزید بڑھ گئی

کیونکہ یہ وہی وقت تھا جب

بے ہوش ہونے سے قبل میں

قبوہ پی رہا تھا۔ دونوں مسلح

فحش بھی وہیں موجود تھے۔

جب کہ وہ غیر ملکی نظر آنے والا

فحش اسی طرح صوفے

پر عین میرے سامنے تشریف

فرما تھا۔ مجھے الجھن میں

اور پریشان دیکھ کر پہلے تو وہ مسکرایا، پھر بولا۔ ”کیا بات

سے شیر دل! آپ مجھے بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔

کوئی الجھن ہے تو پلیز مجھے بتائیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں الجھن تو ہے مگر میں جانتا ہوں

کہ آپ مجھے سچ نہیں بتائیں گے۔“

وہ بولا۔ ”بھئی! پہلے سوال تو کرو، جواب نہ ملے تو

تب یہ شکوہ کرنا۔“

”کیا میں قبوہ پینے کے دوران بے ہوش ہوا تھا؟“

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

اُس کے لبوں پر ایک ہندسہ سی ہنسی رہ گئی۔

دعائے مغفرت

محترم رزاق شاہد کوہلر اور محترم ریاض عاقب
کوہلر کے والد محترم 23 رمضان کو بہ حکم الہی وفات پا
گئے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِلَیْہِ رَاجِعُونَ

اللہ مرحوم کو فریق رحمت کرے اور لواحقین کو صبر
جلیل عطا فرمائے۔ ادارہ اس عظیم صدمے پر ان کے غم
میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے اپیل ہے کہ وہ
دعائے مغفرت فرما کر تواب دارین حاصل کریں۔

(ادارہ)

بات کا ہمیشہ بُرا مانایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار وہ ماما کو ڈانٹ بھی دیا کرتے تھے تب اُن دونوں کے بیچ بحث چھیڑ جایا کرتی تھی۔ ماما بابا جان سے کہتی کہ داؤد اور ڈیوڈ دونوں ایک ہی نام ہیں بس زبان اور لہجے کے فرق کی وجہ سے مختلف لگتے ہیں مگر بابا جان جو کہ معمولی سے پڑھے لکھے تھے، ہمیشہ ماما کی ہر دلیل کو رد کر دیا کرتے تھے۔ ماما کا تعلق انگلینڈ سے تھا جب کہ بابا جان ایک قبائلی پٹھان تھے۔ دونوں نے محبت کی شادی کی تھی مگر یہ محبت اُن دونوں کو اس نہ آسکی حالانکہ ماما نے شادی سے قبل اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔ اتنا بتا کر وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

مجھے اُس کی کہانی دل چسپ لگی مگر اب وہ کھویا کھویا سا نظر آ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات تھے۔ یوں جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ شاید ماضی کی کرب انگیز یادوں نے اُسے گھیر لیا تھا۔ ایسی صورت حال میں اُس سے کچھ پوچھنا میں نے نامناسب خیال کیا۔ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی۔ تب میں نے پہلی بار اپنے دل میں اُس کے لیے ہمدردی کے جذبات محسوس کیے۔ اُس نے ایک بار پھر چشمہ اُتار کر اپنی نم آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور پھر مسخ گارڈز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم دونوں باہر جا کر بیٹھ جاؤ، جب تک میں نہ بلاؤں کمرے میں مت آنا۔“

غلیظ دانتوں والے نے منہ کھولا۔ ”آپ رسک لے رہے ہیں جناب! یہ شخص بہت خطرناک اور عیار ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں یہ آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس نے سلیم کو جس بے رحمی کے ساتھ قتل کیا ہے اُس کے بعد اس پر اعتبار کرنا.....“

”دفع ہو جاؤ۔“ داؤد خان نے چلا کر قطع کلامی کی۔ ”میں نے جو قسم دیا ہے اُس پر عمل کرو۔“

اُسے غصے میں دیکھ کر دونوں گارڈ تیزی سے باہر نکل گئے۔ گارڈز کے جانے کے بعد اُس نے میری

بار مجھے کچھ بھی محسوس نہ ہوا حالانکہ قبوے کا ڈانکھ اور خوشبو بھی وہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے یا پھر قبوہ بدل دیا گیا تھا؟ بہر کیف جو بھی تھا مجھے اُس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لہذا میں نے موضوع بدل کر سوال کیا۔ ”او کے قبوے والی بات کو رہنے دو اور یہ بتاؤ کہ مجھے کس مقصد کی خاطر اغوا کیا گیا ہے، آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”میرا نام داؤد خان ہے اور میں آپ کا ہمدرد ہوں۔“

”اس ہمدردی کا سبب جان سکتا ہوں؟ میں نے طے یہ انداز میں سوال کیا۔“

”آپ آم کھا میں جڑمت نہیں۔“ وہ لیوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی نسل کے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں آپ کا دوست ہوں، دشمن نہیں۔“ ”یہ بھی خوب کہی..... دوست بھی بھلا کبھی یوں اغوا کرتے ہیں؟“

اُس نے چشمہ اُتار کر دونوں شیشوں پر باری باری پھونک ماری اور پھر چشمہ دوبارہ چہرے پہ سجاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں صمد یار خان کا دشمن ہوں، وہی صمد یار خان جس نے آپ کی توہین آمیز دلیوں لٹائی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”آپ جب تک اپنے ہارے میں مجھے سچ نہیں بتائیں گے میں آپ کی کسی بات پر یقین نہیں کروں گا۔ آپ صمد یار خان کے دوست بھی تو ہو سکتے ہیں؟“

”ٹھیک ہے۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میرا نام تو آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہے یعنی داؤد خان، آپ کی طرح میں بھی.....“

”داؤد خان یا ڈیوڈ؟“ میں نے قطع کلامی کی۔

”ویسے ماما مجھے ڈیوڈ ہی کہا کرتی تھی۔“ وہ مسکرایا۔ ”تاہم بابا جان چونکہ سلا پٹھان تھے اس لیے ماما کی اس

حالات اس قدر بُرے نہیں تھے جیسے آج کل ہیں۔ اُس دور میں انگلینڈ جانے کا بہت چاہ تھا۔ خاص کر پنہان لوگ تو اپنا گھربار بچ کر بھی ملک سے باہر جانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ میرے بابا جان ایک لڑک لارڈ تھے اور پشاور کراچی روٹ پر چلا کرتے تھے۔ وہ پشاور سے مال لے کر کراچی جاتے اور کراچی کا مال پشاور لایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار تو وہ پشاور سے آگے افغانستان کے شہر جلال آباد تک بھی چلے جایا کرتے تھے۔ بابا جان کا نام احمد یار خان تھا جب کہ اُس سے ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جس کا نام محمد یار خان تھا۔ احمد یار خان اپنے چھوٹے بھائی سے بے تحاشا پیار کرتے تھے اور اُسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے۔ دونوں کا باپ اُن کے بچپن میں ہی گزر گیا تھا۔ بس ایک بوڑھی ماں تھی اور وہ دو بھائی تھے۔ اُن کے دن نہایت ہی اچھے گزر رہے تھے۔ گھر میں اللہ کا دیا کبھی کبھار تھا۔ احمد یار خان کی تنخواہ اُن کی ضرورت سے زیادہ تھی۔ ویسے بھی وہ دور بہت سستا تھا۔ اس قدر ارزانی نہیں تھی جیسے آج کل ہے۔

اُن دونوں محمد یار خان میٹرک میں تھا جب احمد یار خان کے سر پر ملک سے باہر جانے کا بھوت سوار ہو گیا۔ سرما کے دن تھے رات کے کھانے کے بعد جب وہ تینوں انگلیسی کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو احمد یار خان بولا۔ ”مور جان (ای جان) میں ملک سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ یہاں میری محنت کا صلہ بہت کم ملتا ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”یار خان! صلہ کم نہیں ملتا بلکہ تم ناشکرے ہو گئے ہو۔“ (ماں اُسے پیار سے یار خان کہا کرتی تھی)

اُس نے کہا۔ ”مور جان! تم جانتی ہو کہ میں محمد خان کو بڑا آدمی بنانا چاہتا ہوں۔ میرا یہ سپنا صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب میں ملک سے باہر کہیں ملازمت کروں گا۔ یہاں رہ کر میں اپنے بھائی کے لیے

طرف دیکھا اور پھر چہرے پر ایک ڈھی سی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ آپ میری داستان سننے کے لیے بہت بے تاب ہوں گے۔“

”ہاں بے تاب تو ہوں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو پھر میں آپ کی داستان حیات ضرور سننا چاہوں گا۔“

وہ بولا۔ ”بہت ڈکھ بھری داستان ہے۔ آپ خواہ تنخواہ السرد ہو جائیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”میری السردگی کو چھوڑو، آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ اُس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ”ڈکھ میں کسی دوسرے کو شریک کرنے سے ڈکھ کا احساس آدھارہ جاتا ہے۔“

”تو پھر سناپے میں ہمد تن گوش ہوں۔“

وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے مگر میری ایک شرط ہے؟“

”کیسی شرط؟“ میں نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔

وہ بولا۔ ”اب جب کہ ہم دونوں میں دوستی کا آغاز ہو چکا ہے تو کیا ہم اسی طرح ایک دوسرے کو آپ جناب کہہ کر مخاطب کرتے رہیں گے؟“

”ہاں واقعی ہمیں ان تکلفات میں نہیں پڑنا چاہیے اب ہم اچھی نہیں رہے۔“ میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے جواب دیا۔

”گڈ یہ ہوئی ناں بات۔“ اُس نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”اب میں تمہیں اپنی داستان حیات ضرور سناؤں گا۔“

☆☆☆

”یہ آج سے تقریباً چالیس برس قبل کا ذکر ہے۔“ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ”میں اُس وقت ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا۔ ملک کے

"میں یاری خان ہوں دنیا کی کوئی عورت مجھے تم لوگوں سے جہد نہیں کر سکتی، چاہے وہ انگریز ہی کیوں نہ ہو۔"

"جانے سے پہلے سب اپنی ماؤں سے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں مگر وہاں جا کر انہیں یہ باتیں بھول جاتی ہیں۔"

"مور جان! اگر تم نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" اس نے حتیٰ فیصلہ سنایا۔

"ہاں مور جان! لالہ ٹھیک کہتا ہے۔" چھوٹے بھائی نے بھی اس کی تائید کی۔ "انگلینڈ میں ایک ڈرائیور کو بہت اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ ہمارے دن پھر جائیں گے، ہم کب تک گاؤں کے اس کپے اور ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہیں گے؟"

دونوں بھائیوں کو متفق دیکھ کر ماں مجبور ہو گئی۔ ویسے بھی وہ ایک اُن پڑھ اور سادہ مزاج عورت تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر اس سے قائل نہیں کر سکتی تھی۔ شوہر زندہ ہوتا تو شاید اس کا ساتھ ضرور دیتا، تب وہ یاری خان کو باہر جانے سے روک دیتی بھی روک سکتی تھی۔ تاہم وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"میں یاری خان کی بات مان لوں گی مگر میری ایک شرط ہے؟"

"کیسی شرط مور جان؟" یاری خان نے بے صبری کے عالم میں پوچھا۔

وہ بولی۔ "میرا دل ملک جانے سے قبل تمہیں شادی کرنا پڑے گی۔"

"اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟" یاری خان شہنشاہ گیا۔ اُسے ماں سے کسی ایسے سوال کی توقع ہی نہیں تھی۔

ماں نے کہا۔ "تمہارے پیروں میں زنجیر ہوگی تو بھٹکنے سے باز رہو گے۔"

"مگر میرا تو ابھی رشتا بھی طے نہیں ہوا، کون مجھے

کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ کیا تم نہیں چاہتی ہو کہ تمہارا صدمہ ایک دن بہت بڑا آدمی بن جائے؟"

وہ بولی۔ "صدمہ خان پڑھ تو رہا ہے اور تمہیں کیا چاہیے؟"

"دسویں پاس کرنے کے بعد جب وہ کالج میں جائے گا تو تب بہت خرچہ ہوگا۔ اُس وقت میری تنخواہ سے یہ خرچہ پورا نہیں ہوگا۔" اس نے دلیل پیش کی۔

"نہیں یاری خان! ماں نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں تمہیں پردیس جانے کی اجازت نہیں دے سکتی وہاں جو بھی جاتا ہے کبھی واپس نہیں آتا۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھونا نہیں چاہتی۔"

وہ بولا۔ "مور جان! میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر سال چھٹی آیا کروں گا۔"

"وہاں جانے والوں کو وعدے یاد نہیں رہتے، تم بھی ہمیں بھول جاؤ گے۔"

"یاری خان! اپنی ماں اور بھائی کو بھول جائے یہ ناممکن ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو پردیس کی رنگینیوں میں کھو کر خونی رشتوں کو بھول جاتے ہیں۔ کیا تمہیں اپنے یاری خان پر اعتماد نہیں ہے؟" اس نے جوش کے عالم میں سوال کیا۔

"تم پر تو اعتماد ہے لیکن....." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"لیکن کیا مور جان؟" اس نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

"وہاں کی عورتیں بہت چالاک ہوتی ہیں۔ ماؤں سے بیٹے اور بہنوں سے اُن کے بھائی چھین لیتی ہیں۔

مجھے ڈر لگتا ہے کہ تمہیں بھی کوئی ایسی ہی عورت ہم سے چھین لے گی اور پھر میں اور صدمہ اکیلے رہ جائیں گے۔"

ماں نے دل میں چپے خدشے کا اظہار کیا۔ "یہ تمہارا وہم ہے مور جان۔" اس نے تہقہ لگایا۔

لے چل دی۔ جب کہ وہ دونوں بھائی دیر گئے تک دیکتی
انگلیٹھی کے گرد بیٹھے مستقبل کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیتے
رہے۔

☆☆☆

دوسرے روز ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر یاری
خان کی ماں اپنی بہن کے گھر جا پہنچی۔ دونوں بہنوں کے
تعلقات آپس میں بہت ہی اچھے تھے۔ سو بہن اُسے
دیکھتے ہی خوشی سے کھل اٹھی۔ ”آپا خانم! خیر تو ہے آج
صبح سویرے میری یاد کیسے آگئی؟“ چھوٹی بہن نے
مسکرا کر سوال کیا۔

وہ بولی۔ ”ذریعہ آج میں تیرے گھر میں سوالی
بن کر آئی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنی آپا کو خالی ہاتھ
نہیں لوٹاؤ گی۔“

ذریعہ نے کہا۔ ”آپا! آپ حکم کریں، آپ کے
لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔“

خانم نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔ ”میں تم سے جان
مانگنے کے لیے نہیں آئی ہوں بلکہ گل رُخ کا ہاتھ مانگنے
کے لیے آئی ہوں۔ مجھے اپنے یاری خان کے لیے گل رُخ
کارشتا چاہیے؟“

ذریعہ لمحہ بھر کے لیے تو متحیر رہ گئی۔ اُسے آپا خانم
سے اس سوال کی شاید توقع ہی نہیں تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی
کہ شاید بڑی بہن کو روپے پیسے کی ضرورت ہوگی مگر وہ تو
گل رُخ کا ہاتھ مانگ رہی تھی۔ چنانچہ ذریعہ سوچوں میں
مستغرق ہو گئی جب کہ خانم جواب طلب نظروں سے اُس
کی طرف دیکھنے لگی۔ جب خاموشی کا ایک طویل وقفہ گزر
گیا تو خانم بولی۔ ”کن سوچوں میں غم ہو، میں بڑی
امید لے کر تیرے پاس آئی ہوں۔ کیا تم بڑی بہن
کو نامراد لوٹا دو گی؟“

”نہیں۔“ ذریعہ نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”میں
آپ کو ہاں کر سکتی ہوں اور نہ ہی ناں کر سکتی ہوں۔ اس

بٹی دے گا؟“ اُس نے جواز گھڑا۔
”تم ہاں تو کرو رشتا تلاش کرنا میرا کام ہے۔“ ماں
نے پُر غزم لہجے میں جواب دیا۔

وہ سوچوں میں مستغرق ہو گیا۔ دل و دماغ میں
جنگ چھڑ گئی۔ دماغ نے کہا ماں کا کہنا مان کر شادی
کر لو، دل بولا اگر وہاں کوئی میم صاحب پسند آگئی تو کیا
ہوگا؟ دماغ نے طغریہ قبضہ لگا کر کہا ایک ملل پاس
ڈرائیور کو بھلا کوئی میم کیوں پسند کرے گی؟ دل بولا عورت
مشق میں اندھی ہو جاتی ہے وہ تعلیم، مرتبہ، خاندان بلکہ
لہب تک نہیں دیکھتی بس اپنے دل کی سنتی ہے۔ دماغ
نے کہا بجا مگر شادی کیے بتائیہ باہر نہیں چائے گا؟ دماغ
کی اس ٹھوس دلیل نے دل کو لا جواب کر دیا، وہ دھڑک
رہا تھا مگر اُس کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں تھی جسے
جواز بنا کر وہ دماغ کی یوٹنی بند کر دیتا، سو بچارا دھڑکنے
کے سوا کچھ بھی نہ کر پایا۔ دماغ نے طغریہ انداز میں
طفر کیا اب بولوناں! چپ کیوں ہو، جواب دو میرے
سوال کا۔ دل بولا تمہیں جیت مبارک ہو مگر اتنا یاد رکھنا کہ
یہ وقتی جیت ہے۔ بہت جلد میں تمہارے ہوش اُڑا دوں
گا۔ دماغ نے کہا تم بے وقوف ہو اتنا بھی نہیں جانتے کہ
جو میری مانتا ہے وہ ہمیشہ سرفروہ ہوتا ہے دنیا والے اُسے
جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ دل نے جواب دیا
اور جو میری مانتا ہے وہ مگر بھی امر ہو جاتا ہے۔

دل و دماغ کی یہ ملل جنگ جاری تھی کہ معا اُس
کی سماعتوں سے ماں کی آواز نگرانی۔ ”یاری خان! چپ
کیوں ہو جواب دو ناں؟“

”ٹھیک ہے مور جان۔“ اُس نے اقرار میں سر
ہلایا۔ ”مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ آپ جہاں چاہیں
میری شادی کر سکتی ہیں، میں کوئی اعتراض نہیں کروں
گا۔“

ماں اُسے ڈھیروں دعائیں دیتی ہوئی سونے کے

زیرینہ نے کہا۔ ”آپا! اگر ایسی بات ہے تو گل رخ کا باپ کبھی بھی نہیں مانے گا۔ وہ صاف انکار کر دے گا۔“
 ”تم اُسے یہ بات مت بتانا کہ یاری خان ملک سے باہر جا رہا ہے۔“ خانم نے مشورہ دیا۔
 ”میں اپنے خاوند سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔“ اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”آپ تو جانتی ہی ہیں کہ وہ فیس کے بہت حیز ہیں۔ انہیں اگر کسی طرح یہ بات معلوم ہوگئی تو وہ مجھے زندہ جلا لیں گے۔“
 ”اس بات کا صرف مجھے اور تجھے پتہ ہے۔ جب ہم دونوں زبان بند رکھیں گی تو اُسے کیسے پتہ چلے گا؟“
 ”آپا! آپ مجھے آگ میں کودنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ جھوٹ جھوٹ ہی ہوتا ہے جلد یا بدیر ظاہر ہو جاتا ہے۔“

”اگر ایسا کچھ ہوا تو سارا الزام میں اپنے سر لے لوں گی۔ تجھ پر کوئی آج نہیں آنے دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

ترجمہ و اضافے کے ساتھ (زیر طبع)

حالی سفر نامہ

جرمن، امریکہ، افغانستان اور دیگر ممالک کا چشم کشا سفر نامہ

(دوسرا ایڈیشن)

جرمنی۔ جی دار لوگوں کی سرزمین

قیمت 300 روپے

جرمنی کی ترقی کاراز اور انتہائی دلچسپ سفر نامہ

سفر حج حجاز مقدس کے روح پرور اور ایمان افروز سفر کا حال

صرف 25 روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

26۔ پیپال گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور۔

فون: 042-37356541

”ادب سرائے“ 125۔ ایف۔ ماڈل ٹاؤن لاہور۔

مصنف 205/M ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون 0300-4154083

کتبہ داستان

ہے تم سے۔"

"نہیں لالا میں بھلا آپ سے کیوں جھوٹ
بولنے لگا؟" اُس نے دل منظر کو سنبھالنے کی کوشش کی۔
ماں اُن دونوں کو چھوڑ کر گھر کے کاموں میں لگ گئی
جب کہ یاری خان کافی دیر تک چھوٹے بھائی
کو کریدتا رہا مگر اُس نے اپنے دلی جذبات کو کچھ اس
انداز میں چھپایا کہ یاری خان بالکل مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

گل رخ جابر خان اور زرینہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ
جابر خان کو اپنی جان سے بھی پیاری تھی۔ رات کو کھانے
کے بعد جب گل رخ اپنے کمرے میں سونے کے لیے
چلی گئی تو زرینہ نے امت کا مظاہرہ کرتے ہوئے
شوہر کے سامنے خانم کا پیغام دہرایا۔ جابر خان نے پہلے
تو زرینہ کو آنکھیں دکھائیں اور پھر ناگوار انداز میں بولا۔
"کیا خانم پاگل ہے اُسے گل رخ اور یاری خان کی
عمر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟"

وہ بولی۔ "اُن کی عمروں میں کوئی اتنا بڑا فرق تو
نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کا فرق ہوگا۔"
"خانم کی طرح شاید تمہارا بھی دماغ خراب ہو گیا
ہے۔ دس بارہ سال سے بھی زیادہ کا فرق ہوگا اور یہ بہت
بڑا فرق ہے۔" وہ ایک دم غصہ ہو گیا۔

"آپ خواہ مخواہ غصہ کر رہے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے
دل و دماغ سے غور کریں عمر کا یہ فرق لڑکی کے لیے اچھا
ہوتا ہے۔" زرینہ نے دلیل دی۔

وہ بولا۔ "تجھے دانش ور بننے کی کوئی ضرورت نہیں
ہے۔ گل رخ کا رشتا میں خود طے کروں گا۔ تم بس اپنے
کام سے کام رکھا کرو۔"

"کیوں..... میں کیا گل رخ کی کچھ نہیں لگتی؟"
زرینہ کو بھی غصہ آ گیا۔ "نو ماہ اُسے پیٹ میں لے کر
پھرتی رہی ہوں۔ اڑھائی برس اُسے دودھ پلایا ہے۔ میں
ماں ہوں اُس کی، آپ سے زیادہ اُس پر میرا حق ہے۔"

"ٹھیک ہے آپا! میں کوشش کروں گی مگر آپ کو
چند دن صبر کرنا پڑے گا۔ میں کوئی مناسب ساموچہ دیکھ
کر اُن سے بات کروں گی۔" آخر کار وہ رضامند ہو گئی۔
خانم خوشی خوشی گھر لوٹ آئی اور دونوں بیٹوں کو
سامنے بٹھا کر ساری بات بتادی۔ یاری خان کو یہ جان
کر بہت خوشی ہوئی کہ گل رخ اُس کی بیوی بننے والی ہے
مگر صبر یار خان یہ خبر سن کر کچھ بچہ سا گیا۔ پتہ نہیں اُس
کے دل میں کیا تھا؟

"اوئے لالے کی جان! تم نے کیوں منہ لٹکا رکھا
ہے، کیا تمہیں اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے؟"
یاری خان نے اُس کی اُتری ہوئی صورت دیکھ کر سوال
کیا۔

وہ بوکھلا کر بولا۔ "نن..... نہیں لالا! ایسی کوئی بھی
بات نہیں ہے۔"

"اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر تمہاری شکل لگور جیسی
کیوں ہو گئی ہے؟" یاری خان نے شوخی سے پوچھا۔
"وہ دراصل لالا میرے امتحان ہونے والے
ہیں ناں! تو بس اسی وجہ سے تھوڑا پریشان ہوں۔" اُس
نے بہانہ گھڑا۔

یاری خان نے کہا۔ "اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو
ابھی بتادو، تیرے لالہ کی جان بھی تیرے لیے
حاضر ہے؟"

"کمال کرتے ہو لالا!" اُس نے ایک کھوکھلا سا
تہتہ لگایا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آپ سے
کیوں چھپاتا؟"

وہ بھائی کی پینہ تھپکتے ہوئے بولا۔ "صبر خان! میں
صرف تمہارا بھائی ہی نہیں ہوں، بلکہ باپ بن کر حیرتی
پرورش کر رہا ہوں۔ ایک بات یاد رکھنا مجھ سے زندگی میں
بھی جھوٹ مت بولنا ورنہ مجھے بہت تکلیف ہوگی۔"

حکایت

کا شمارہ ستمبر 2014ء

سالگرہ نمبر

ہوگا

جو اپنی سابقہ روایات کے مطابق
ایک مستقل کتاب کی اہمیت کا حامل
ہوگا۔ اپنی کاپی ہا کر سے کہہ کر بگ کرا لیں۔

سالگرہ نمبر 320 صفحات پر مشتمل ہوگا۔

قیمت - 100/- روپے

قارئین کرام اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں۔

سوچتے وقت اتنا خیال رکھنا کہ یاری خان میرا بھانجا اور گل رُخ کا خالہ زاد ہے۔ وہ گل رُخ کے لیے اچھا شریک حیات ثابت ہوگا۔

”اچھا اب زیادہ بک بک نہ کر اور میرے لیے قبوہ بنادے۔“ اُس نے نالٹے والے انداز میں جواب دیا اور زرمینا اٹھ کر مگن کی طرف چل دی۔

ایسے ہی وقت میں دنی گیت پر دستک ہوئی تو وہ اٹھ کر گیت کی طرف چل دیا۔ اُس نے گیت کھولا تو سامنے صمد خان کھڑا ہوا تھا۔ جابر خان اُسے دیکھ کر کچھ بھر کے لیے تو حیران رہ گیا، پھر پوچھا۔ ”کیا بات ہے صمد خان..... کیسے آنا ہوا؟“

”آپ..... آپ سے ایک ضروری کام ہے خالو۔“ اُس نے جھجک کر جواب دیا۔

”ٹھیک ہے اندر آ جاؤ۔“ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو صمد خان تیزی سے اندر آ گیا۔

جابر خان نے گیت کو دوبارہ بند کیا اور صمد خان کو ساتھ لیے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ ”بیٹھو۔“ اُس نے ایک چار پائی کی طرف اشارہ کیا تو صمد خان جھجکتے ہوئے بیٹھ گیا۔

”ہاں اب بولو کیا کام ہے؟“ جابر خان نے اُس کے سامنے دوسری چار پائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

گوکہ صمد خان اکثر اُن کے گھر آیا کرتا تھا مگر جابر خان سے اُس کا سامنا کم ہی ہوا کرتا تھا۔ زیادہ تر

وہ اُس کی غیر موجودگی میں خالہ کے ہاں چایا کرتا تھا۔ اُسے جابر خان کی خصوصی طبیعت کے متعلق ابھی طرح

معلوم تھا۔ چنانچہ جابر خان نے جس طرح اُس سے سوال کیا اس سے وہ قدرے نرم ہو کر کش کش کا شکار ہو گیا۔

اُسے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ بات شروع کرے تو کس طرح کرے؟ جابر خان بدستور جواب طلب لگا ہوں سے

اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سردیوں کا موسم ہونے کے

”حق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُسے آگ میں جھونک دیا جائے۔ شادی گڈے گڑیا کا کیل نہیں ہوتی عمر بھر کا ساتھ ہوتا ہے۔ انسان کو سوچ سمجھ کر دشتا طے کرنا چاہیے۔ ویسے بھی مجلت کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔“ اُس نے بھڑک کر جواب دیا۔

”میرا بھانجا لاکھوں میں ایک ہے۔ کیا کی ہے اُن کے گھر میں، خدا کا دیا بھی کچھ ہے اُن کے پاس، دودھی تو بھائی ہیں۔ گل رُخ وہاں راج کرے گی۔“

”میں جو بھی فیصلہ کروں گا سوچ سمجھ کر کروں گا مگر فی الحال میں اس کام کے لیے سنجیدہ نہیں ہوں۔ اگر خانم کو جلدی ہے تو تم اُسے انکار کر دو۔ گل رُخ ابھی بچی ہے، شادی کے لیے بڑی عمر پڑی ہے۔ ابھی تو اُس کے کھینے کودنے کے دن ہیں۔“

وہ بولی۔ ”گل رُخ پورے اٹھارہ برس کی ہو چکی ہے اور یہ شادی کے لیے مناسب عمر ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اُس سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچیں کہ وہ بیٹی ہے آپ اُسے ساری عمر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔“

”میں نے کہا ہے ناں! کہ میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں گا، پھر تم کیوں اس بات کے پیچھے پڑ گئی ہو..... کیا گل رُخ کسی کے ساتھ بھاگی جارہی ہے؟“ وہ زچ ہو گیا۔

”اللہ نہ کرے کیسی بات کرتے ہیں؟ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ وہ جتنی جلدی گھر کی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“

”یہ دیکھ۔“ اُس نے بیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”اللہ کی بندی! مجھے چند دن سوچنے کے لیے تو دے؟“

”ٹھیک ہے۔“ وہ خوشی سے کھل اٹھی۔ ”جتنے دن دل چاہے آپ سوچیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بس

ایسا دیا آدمی نہیں ہوں۔
 ”جی ہاں تادو، ورنہ گلا کھنٹ کر مار ڈالوں گا۔“
 وہ چار حانہ انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بولو گل رُخ سے
 تمہارا کیا تعلق ہے؟ اور خبردار! اب کی بار اگر تم نے
 جھوٹ بولا تو میں تمہاری کھال ادھیڑ ڈالوں گا۔“
 ”مم..... میں قسم کھاتا ہوں خالو کہ ایسی.....
 کو کوئی.....“ وہ ابھی ہکلا ہی رہا تھا کہ جابر خان نے آگے
 بڑھ کر اسے دو تھپڑ جڑ دیے۔
 ”حرام زلوے! تمہاری یہ ہمت کہ تم جابر خان کی
 بیٹی کا نام لو۔“ جابر خان نے اُسے گریبان سے پکڑ لیا۔
 ”میں تجھے زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔ بولو تمہارا گل رُخ
 سے کیا تعلق ہے؟ بولو ورنہ مار ڈالوں گا۔“
 ایسے ہی وقت زرمینہ قبوہ لے کر کمرے میں داخل
 ہوئی تو اندر کا منظر دیکھ کر وہ چلائی۔ ”جابر خان! اسے
 کیوں مار رہے ہو؟ کیا کیا ہے اس نے..... خدا کے لیے
 اسے چھوڑ دو..... میں خاتم کو کیا منہ دکھاؤں گی؟“
 جابر خان نے اُسے گریبان سے پکڑ کر چابی سے
 نیچے پٹخ دیا اور پھر اُس کے پہلو میں ایک زوردار کھو کر رسید
 کرتے ہوئے گر جا۔ ”پوچھ اپنے اس حرامی بھانجے سے
 کہ یہ میرے گھر میں کون سا مقصد لے کر آیا ہے اور گل
 رُخ سے اس کا کیا تعلق ہے؟“
 ”مجھے لگتا ہے کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“
 زرمینہ قبوہ کا کپ میز پر رکھتے ہوئے آگے بڑھی
 اور پھرے ہوئے خاوند سے لپٹ گئی۔ ”خدا کے لیے مجھے
 بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے اور یہ یہاں اس وقت کیسے آ گیا؟“
 ”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے۔“ جابر خان خود کو
 چھڑاتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ تم اندھی ہو چکی ہو اپنے
 بھانجے کی محبت میں۔ پوچھو ذرا اس سے کہ یہ یہاں کس
 نیت سے آیا ہے؟ اور گل رُخ کو بھی بلاؤ، مجھے لگتا ہے کہ یہ
 اسی کی شہ پاکر یہاں آیا ہے۔ وہ جیتنا اس کے ساتھ ملی

باوجود صبر خان کو اپنا گلا خشک سا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اب وہ
 اُس وقت کو کوس رہا تھا جب اُس نے ادھر آنے کا ارادہ کیا
 تھا۔
 ”تم چپ کیوں ہو..... کیا منہ میں زبان نہیں
 ہے؟“ اس بار جابر خان نے قدرے سختی کے ساتھ
 پوچھا۔
 صبر خان کا سر جھکا ہوا تھا۔ تاہم وہ ہمت مجتمع کرتے
 ہوئے بولا۔ ”وہ..... وہ خالو..... دراصل..... میں کہنا
 چاہتا تھا..... کہ آپ..... آپ اس رشتے سے
 انکار کر دیں۔“
 ”کس رشتے کی بات کر رہے ہو؟“ جابر خان نے
 آنکھیں نکالیں۔
 ”یا..... یاری خان..... اور گل..... گل رُخ کے
 رشتے کی۔“ اُس نے بدقت تمام جواب دیا۔
 ”کیوں تمہیں کیا تکلیف ہے اس
 سے؟“ جابر خان نے مشکوک انداز میں پوچھا۔
 ”یاری خان ٹھیک آدمی نہیں ہے خالو..... وہ.....
 وہ گل رُخ کو خوش نہیں رکھ سکے گا۔“ اُس نے سہمے ہوئے
 انداز میں بتایا۔
 ”اوہ..... تو تم گل رُخ کے ہمدرد بن کر آئے ہو؟“
 جابر خان نے طنزیہ انداز اختیار کر لیا۔ ”لیکن کیوں.....
 تمہیں اپنے سگے بھائی سے زیادہ گل رُخ سے ہمدردی
 کیوں ہے؟ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی؟ مفت
 میں کون اتنی تکلیف اٹھاتا ہے..... اصل بات کیا ہے
 بولو؟“
 ”نن..... نہیں خالو! ایسی تو..... کک..... کوئی
 بات نہیں ہے۔“ وہ ایک دم بوکھلا اٹھا۔ ”مم..... مجھے.....
 دراصل آپ سے ہمدردی ہے..... گل رُخ سے تو.....
 مم..... میں نے کبھی..... بب..... بات بھی نہیں کی.....
 آپ بلا وجہ..... مجھ پر شک کر رہے ہیں مم..... میں

کمرے میں داخل ہوئی اور باپ اور محمد خان کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ "نہیں اباجی! میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ آپ اس کے خون سے ہاتھ نہ ہی رکنیں تو اچھا ہوگا۔"

"ہٹ جاؤ گل۔" جابر خان جنوبی انداز میں چلایا۔ "آج اسے میرے ہاتھ سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔ میں اسے چھلتی کر کے ہی رہوں گا۔"

"اگر یہ بات ہے اباجی تو پہلے گولی آپ کو مجھ پر چلانا پڑے گی۔" گل رخ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "مجھے مار کر ہی آپ اس تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"گل! میں کہتا ہوں کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ بے موت ماری جاؤ گی۔" جابر خان نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے اُسے وارننگ دی۔

"میں نہیں اباجی ہٹنے والی، اگر آپ کو گولی چلانی ہے تو بے شک چلا دیں۔" اُس نے ایک عزم سے جواب دیا۔

"اور گل کے بعد میری باری ہوگی۔" زرمینہ نے مداخلت کی۔ "اب آپ سوچیں مت بلکہ گولی چلائیں، ہم مرنے کے لیے تیار ہیں۔"

صورت حال کو یک دم پلٹتے دیکھ کر اُس نے رائفل اپنی کینٹھی پر رکھ دی۔ "ٹھیک ہے اگر یوں نہیں تو پھر یوں سہی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا اور دائیں ہاتھ کو لہبا کرتے ہوئے انگوٹھا لہر لہر کر رکھ دیا۔

"نہیں..... نہیں....." دونوں ماں بیٹی ہڈیانی انداز میں چیختی ہوئیں اُس کی طرف بھاگیں مگر اس سے قبل کہ وہ اُس تک پہنچ پائیں معا "دہائیں دہائیں" کی آواز گونجی اور جابر خان کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتا ہوا زمین پر گر پڑا۔

(اس سلسلے خیز داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

ہوئی ہے۔"

"خدا کا خوف کرو جابر خان! اپنی مصوم بیٹی پر اس قدر گناہنا الزام مت لگاؤ۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "محمد خان کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"خدا ہی! تمہیں اللہ کا واسطہ مجھے خالو سے بچاؤ۔" محمد خان اٹھ کر زرمینہ کے قدموں سے لپٹ گیا۔ "خدا کی قسم! میں تو خالو سے باری خان کے رشتے کی بات کرنے کے لیے آیا تھا مگر خالو نے میری بات سننے کی بجائے مجھے مارنا شروع کر دیا، مگر آئے مہمان کے ساتھ بھی بھلا کوئی ایسا سلوک کرتا ہے؟"

محمد خان کو یوں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھ کر جابر خان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ چلایا۔ "حرام زادے! مجھ پر الزام لگاتے ہو، ابھی تھوڑی دیر قبل تو تم مجھ سے کہہ رہے تھے کہ باری خان اچھا آدمی نہیں ہے اور میں گل رخ کا رشتا اُس نہ کروں۔"

"خالو! خدا کا خوف کریں میں نے ایسا کب کہا ہے؟" محمد خان نے ہاتھ روکنا شروع کر دیا۔

"تیری تو....." وہ ایک گالی دیتے ہوئے طیش کے عام میں اُس کی طرف بڑھا۔ "آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"نہیں آپ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔" زرمینہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر ڈٹ کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "مجھے یقین ہے کہ میرا بھانجا کب کہہ رہا ہے۔ البتہ آپ کے دل میں اس قدر میل ہوگا یہ بات میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچئی تھی۔"

"تیرے بھانجے کی ایسی کی تھی۔" جابر خان تیزی سے دیوار پر ٹنگ ہوئی رائفل کی طرف بڑھا اور رائفل اتارتے ہوئے بولا۔ "آج میں اس کیبنے بذات کا قصہ ہی پاک کر دیتا ہوں۔"

رائفل اتار کر وہ جنوبی پلٹا مین اُس وقت گل رخ

ادھر ادھر سے



☆.....0345-7094506..... رانا محمد شاہد

کی ہارش کر دی۔ انہوں نے عابدین کو بالوں سے پکڑ کر نیچے گرا دیا اور ان کی دھنکی کر دی۔ اس خبر کے منظر عام پر آنے سے پتہ چلا کہ صرف پاکستان ہی نہیں دنیا بھر میں خواتین کے لڑائی اور مار کٹائی کا انداز ایک جیسا ہے۔
انوکھی ٹیکنالوجی..... درختوں کے ذریعے مواصلات کا نظام: کیا ہو گا کہ سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے درختوں سے ایسی روشنی خارج ہو جو رات کے وقت سڑکوں پر اجالا کر دے اور انہی درختوں کی شاخیں موبائل فونز اور دیگر مواصلاتی سرسبز کے لئے انٹینا کا کام انجام دیں۔ یقیناً ان کی توانائی کا ذریعہ جڑیں ہی ہوں گی۔ جی ہاں ایسا اب شاید ممکن ہو جائے۔ گزشتہ ماہ امریکی

مہمان نے اینکر پرسن کی آن ایئر دھنکی کر دی: ٹیلی وژن چینلوں کے ٹاک شو، کھانے پکانے کے پروگراموں میں میزبان کی الٹی سیدھی حرکتیں ان کے گلے بھی پڑ جاتی ہیں۔ ایسا ہی معاملہ مصر کے ٹیلی وژن چینل کی ایک میزبان نیہا عابدین کے ساتھ پیش آیا۔ مہمان خاتون نے آن ایئر کسی بات پر طیش میں آ کر ان کی دھنکی کر دی۔
 ہوا کچھ یوں کہ میزبان نے اپنی مہمان لگ خاتون کو چہانے کے لئے ان کی تیار کردہ ڈش میں سرکہ ڈال دیا۔ بس پھر کیا تھا، پروگرام میں کھانے پکانے کی مہارت کا مظاہرہ کرنے والی خاتون اتنی جذباتی ہوئیں کہ انہوں نے اپنی ڈش کے خراب ہونے پر اپنی میزبان پر مار دھاڑ

ہے جسے دیکھ کر حقیقی پرندے کا گمان ہوتا ہے۔ سارٹ بڑا نامی روبونک پرندے کا وزن صرف 400 گرام ہے جسے جاسوسی کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کبوتر کی طرح نظر آنے والا یہ روبونک بڑا مختلف زاویوں پر مڑنے اور لینڈ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایرانی دوشیزاؤں کو ڈرائیونگ کرتے رقص مہنگا پڑ گیا: سماجی رابطے کی ویب سائٹ "یو ٹیوب" پر ایک ویڈیو حیرتی سے مقبول ہو رہی ہے جس میں دو ایرانی لڑکیاں گاڑی چلاتے ہوئے ایک گانے کی دھن میں گمن رقص کر رہی ہیں۔ ان کی خوشی اس وقت اوج پر پہنچی کہ جب ان کی تیز رفتار گاڑی اچانک ایک خوفناک حادثے کا شکار ہوتی ہے، تاہم خوش قسمتی سے دونوں محفوظ رہتی ہیں۔ موبائل فون سے بنائی گئی ویڈیو میں صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ گاڑی چلانے والی ایک دوشیزہ گانے اور ناچنے میں اس قدر رگن تھی کہ اس نے سنیزنگ سے ہاتھ اٹھائے تاکہ اپنی اداؤں کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر سکے۔ عین اسی لمحے ان کی گاڑی حادثے کا شکار ہوئی۔

سردار جی کی کیا بات ہے: حضرت علامہ اقبالؒ کے لاکھوں مداحوں میں کچھ سکھ حضرات بھی تھے۔ ہر بندہ سنگھ سے علامہ اقبالؒ کی خاصی دوستی تھی۔ ایک دن ہر بندہ سنگھ علامہ اقبالؒ کے گھر آئے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو رات ہو گئی۔ ہر بندہ سنگھ علامہ اقبالؒ سے گفتگو میں اتنے گمن ہوئے کہ انہیں احساس بھی نہ ہوا کہ بادل گھرے ہوئے ہیں، بارش سے پہلے گھر چلے جائیں۔ اتنے میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ علامہ صاحب نے کہا: "سردار جی! بارش نے بہت زور پکڑ لیا ہے، آپ یہیں ٹھہر جائیں"۔ سردار جی مان گئے۔ علامہ صاحب ان کے لئے بستر وغیرہ کا انتظام کرنے کے لئے اندرون خانہ چلے گئے۔ چادر نکال لے کر آئے تو سردار جی غائب تھے۔ نوکر وغیرہ سب سو چکے تھے۔ علامہ صاحب کھڑکیاں دروازے بند کرنے

ریاست میساچوسٹ کے انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے پروفیسر مائیکل سینٹریو اور ان کی ٹیم نے پودوں پر کچھ تجربات کئے جن کی روشنی میں انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ چھوٹے پودوں اور بڑے درختوں سے ایسے بہت سے کام لئے جاسکتے ہیں جو بظاہر ان کے لئے نہیں ہیں۔ پروفیسر مائیکل نے سب سے پہلے پالک کے چوں پر تجربہ کر کے اس بات کا اندازہ لگایا ہے کہ اگر پودوں کی "فونو پیتھیزس" کے عمل کو تین گنا تیز کر دیا جائے تو نہ صرف پودوں کی نشوونما تیز ہوگی بلکہ انہیں برقی سینرز کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکے گا۔ انہی سینرز کی مدد سے مواصلات کا نظام چلایا جاسکتا ہے اور روشنی پیدا کی جاسکتی ہے۔ یقیناً یہ تحقیق نئی کام کی صنعت سے تعلق رکھنے والی کمپنیوں کے لئے خوش خبری ثابت ہوگی۔ اب انہیں اپنی سرورس صارفین تک پہنچانے کے لئے بڑے بڑے میٹ ورکنگ ٹاورز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس طرح کے پودوں کو "باؤنک پلانٹس" کا نام دیا گیا ہے۔

نیویارک ریسٹورنٹ..... پانچ سال تک ایڈوائس بنگ ہو چکی: اچھے ہوٹلوں میں کھانا کھانے کے لئے انتظار تو کرنا پڑتا ہے مگر امریکہ میں ایک ریسٹورنٹ ایسا بھی ہے جس میں کھانا کھانے کے لئے پانچ سال انتظار کرنا پڑے گا۔ نیویارک میں واقع ون مین ریسٹورنٹ میں بنے کھانے اتنے لذیذ ہیں کہ اب اس کی شہرت دور دور تک پھیل چکی ہے۔ اس ریسٹورنٹ میں ایک ہی شیف ہے جس کے ہاتھوں کا کھانا کھانے کے لئے ایڈوائس بنگ کرائی پڑتی ہے۔ اگر آپ کو بھی یہاں کھانا کھانا ہے تو بس 2019ء تک انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہاں اگلے پانچ سال تک کی تمام بنگ ہو چکی ہے۔

مشینی پرندہ: حقیقی پرندوں کے علاوہ اب مصنوعی پرندے بھی اڑان بھر سکیں گے۔ حال ہی میں جرمن سائنسدانوں نے کبوتروں کی طرح اڑان بھرنے والا روبوٹ تیار کیا

استدعا کو رد کرتا ہوا بولا۔ ”ابھی تک اس بوڑھے کے دماغ سے خوں حکمرانی نہیں گئی۔ کیا اب بھی وہ چاہتا ہے کہ طالب علموں کی صورت اس کا دربار سجا ہو اور ان پر اپنا حکم چلاتا رہے۔“

قیامت کی نشانی: سورج مغرب سے نکلے گا۔ ناسا نے ”قیامت کی نشانی“ کو قبول کر لیا ہے۔ امریکی خلائی ادارے ناسا کی تحقیق کے مطابق 30 جولائی کو اس سیارے کی مشرق کی سمت گردش رک گئی تھی جبکہ اُسٹ اور سمبر کو مریخ نے اپنے راستے کی سمت تبدیل کر لی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ مریخ سیارے میں گردش میں تبدیلی اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ تمام سیاروں کی گردش میں ایک دفعہ تبدیلی ضرور آئے گی۔ جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس کی گردش بھی مخالف سمت میں ہوگی اور سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور ایسا جلد ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور اس دن توبہ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔“ (صحیح مسلم)

بچوں کی حس مزاج: ایک نئی تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کی حس مزاج کا تعلق ان کے والدین سے ہوتا ہے۔ اس لئے اگر مائیں سنجیدہ مزاج ہیں تو آپ یہ ہرگز مت سوچئے گا کہ بچے حس مزاج سے مالا مال ہوں گے کیونکہ بچوں کی مزاج کی حس ماں جیسی ہی ہوگی۔ محققین کے مطابق بچوں میں حس مزاج 18 ماہ کی عمر سے پیدا ہوتا شروع ہو جاتی ہے اور اپنے والدین کو دیکھ کر ہی ان کی حس مزاج تشکیل پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے ساتھ ہر وقت موجود مائیں اگر سنجیدہ مزاج ہوں تو بچوں کی حس مزاج بھی محدود ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ بچے دو سال کی عمر سے یہ سمجھنا شروع ہو جاتے ہیں کہ کون سی چیزیں سنجیدہ ہیں اور کون سی مزاج کے دائرے میں آتی

گئے تو انہوں نے ہر بندرگاہ کو پانی میں شرابور دروازے پر کھڑا پایا۔ علامہ صاحب نے انہیں اندر بلا لیا اور دریافت کیا کہ وہ کہاں چلے گئے تھے۔ سردار جی بولے۔ ”میں اپنے گھر سیلنگ سوٹ لینے اور یہ بتانے گیا تھا کہ آج علامہ صاحب نے مجھے اپنا مہمان بنا لیا ہے۔ اس لئے رات کو گھر نہ آ سکوں گا۔“ علامہ صاحب نے کہا۔ ”گھر پہنچ گئے تھے تو واپس آنے کی کیا ضرورت تھی، وہیں آرام کرتے۔“ سردار جی نے کہا۔ ”آپ نے مجھے مہمان بنا لیا تھا۔ اس وڈائی (شرف) کو پورا کرنا ہی تھا۔“ (”زندگی زندہ دلی“ فضل الرحمن خاں شیروانی کی کتاب سے اقتباس)

کاک پٹ گھر: دنیا میں غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک افراد کی کمی نہیں۔ ایسے لوگ بہت جلد دوسروں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ برطانوی علاقے بکنگھم شائر کے رہائشی ایک جوڑے نے اپنے گھر کی پہلی منزل پر موجود فیرس کو بونگ 737 نامی طیارے میں تبدیل کر دیا ہے اور اس شوق کے لئے 40 ہزار پاؤنڈ خرچ کر ڈالے ہیں۔ اسٹیو اور رکی نے طیارے کے اندرونی حصے میں موجود تمام چیزیں اس فیرس میں نصب کر دی جس میں کاک پٹ، 12 میٹر کیمین، ڈپارچر لائونج اور انٹر برج شامل ہیں۔ جوڑے نے اس طیارے میں بیٹھنے کے لئے 75 پاؤنڈ کا ٹکٹ لگا دیا ہے۔

خوں حکمرانی: برصغیر کے مغل فرمانرواؤں میں سے سب سے نیک اور متقی کہلائے جانے والے شہنشاہ نے اپنے والد کو آگرہ کے قلعے میں اس طور نظر بند رکھا کہ وہاں سے پردوں کا گزر بھی ممکن نہ تھا۔ مکمل قید تھائی۔ جب سابق شہنشاہ برہمپور کی قید تھائی سے آگیا تو اپنے بیٹے اور وقت کے شہنشاہ کو پیغام بھجوایا کہ اس کے پاس کچھ طالب علم بھجوادئے جائیں جنہیں وہ قرآن پڑائے۔ اپنے والد شاہ جہاں کا پیغام سن کر اورنگزیب عالمگیر مسکرایا اور والد کی

کوریاء کے دورے پر تھے اور اس دوران ان کے بیٹے نے ان کے پاسپورٹ پر ڈرائنگ بنا کر مکمل طور پر اپنے گن کا مظاہرہ دکھایا جس کے باعث کشم حکام نے انہیں وطن واپسی سے روک دیا۔ جوئیر زیگ نے اپنے والد کے پاسپورٹ پر جانوروں کی تصاویر سے لے کر ہادلوں اور پودوں تک کی تصاویر بنا ڈالیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی جوئیر زیگ نے اپنے والد کی موٹھیں اور داڑھی بنا کر انہیں حرید پرکشش بنانے کی بھی کوشش کی۔ اب مسٹر زیگ نے چینی حکام سے رابطہ کیا ہے اور مدد کی درخواست کی ہے۔

30 لاکھ ڈالر انعام دینے کا اعلان: ملائیشیا کے کم شدہ بونگ 777 طیارے کے مسافروں کے رشتہ داروں نے ایک چندہ مہم شروع کی ہے اور جمع شدہ رقم میں سے طیارے کے ہارے میں مصدقہ اطلاع دینے والے کو 30 لاکھ ڈالر انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔

کیلے چور کہیں کے: وسطی امریکی ریاست ٹکساگو کی عدالت نے تین مردوں کے خلاف دو کیلوں کی چوری کے الزام میں مقدمہ شروع کر دیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ماہرین قانون نے اس مقدمے کی وجہ سے عدالت کو مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔ سماعت کے دوران اتارنی جنرل کے ادارے نے کہا کہ تین ملزموں نے گزشتہ سال دسمبر میں 32 سینٹ مالیت کے دو کیلے ایک دکان سے چوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ دو ملزموں کو حراست میں رکھا گیا ہے جبکہ ایک اپنے گھر میں نظر بند ہے۔ ان لوگوں کے وکیل نے کہا کہ ان کے موکلوں کے خلاف مقدمہ شروع کرنے کے عدالت کے فیصلہ کی وجہ ناقابل وضاحت ہے۔



دنیا کی سب سے بڑی عبادت گاہ: خانہ کعبہ کی عمارت 49.5 فٹ بلند ہے۔ اس کی دیواروں کی لمبائی کچھ اس طرح ہے۔ مشرقی دیوار 38 فٹ 18 انچ، مغربی دیوار 39 فٹ 1.5 انچ، شمالی دیوار 33 فٹ 6.5 انچ۔ اس کے دروازے (باب المتزم) کی لمبائی 6 فٹ 6.5 انچ اور چوڑائی 3 فٹ 13.5 انچ ہے۔

برصغیر کا پہلا ڈاک ٹکٹ: برصغیر میں پہلا ڈاک ٹکٹ یکم جولائی 1852ء کو سندھ کے گورنر نے جاری کیا۔ اس کی مالیت آدھا آنہ تھی اور یہ صرف 5 اضلاع کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اسے کرلی ٹوٹ چھاپنے والے ادارے تھامس ڈی لارے اینڈ کمپنی نے شائع کیا تھا۔ اس کی شکل گول اور رنگ سرخ تھا۔ اس ٹکٹ کو براعظم ایشیا کے پہلے ڈاک ٹکٹ ہونے کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اس کے اندر گول دائرے میں "سندھ ڈسٹرکٹ ڈاک" چھپا ہے۔

دنیا کی مہنگی ترین گلی: ہانگ کانگ میں واقع رسل سٹریٹ دنیا کی مہنگی ترین گلی ہے۔ حالیہ ذرائع ابلاغ کے مطابق رسل سٹریٹ میں ایک دکان کی قیمت دو کروڑ 30 لاکھ ڈالر ہے اور یہاں سب سے زیادہ قیمت پر دکانیں کرائے پر ملتی ہیں۔ رسل سٹریٹ میں دکان خریدنا تو دور کنار یہاں خریداری کرنا بھی آسان نہیں۔ دنیا کے امیر ترین لوگ ہی یہاں آ کر کچھ خرید سکتے ہیں ہر کسی کے بس میں نہیں کہ وہ یہاں شاپنگ کر سکے۔

بیٹے کی شرارت باپ کے لئے مصیبت: کبھی کبھی بچوں کی شرارتیں بڑوں کو کسی ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہیں جس سے وہ کوشش کے باوجود بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ ایسا ہی کچھ چینی سیاح کے ساتھ ہوا جو اپنے 4 سالہ بیٹے کی شرارت کے باعث جنوبی کوریا میں پھنس گیا۔ رپورٹ کے مطابق مسٹر زیگ اپنے بیٹے کے ساتھ جنوبی

اگر پولیس محنت اور دیانت داری سے تفتیش کرے تو پاتال میں چپے
بجڑوں کو بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ یہ تفتیشی کہانی اس بات کا کھلا ثبوت ہے۔

ڈکیتی کے بعد



☆.....0300-9667909.....ڈکیت شہزاد

ہوئے تھے جبکہ ان کی مقابل کرسی پر ایک گاڑی بیٹھا تھا۔
نوجوان سید حائجر کی بغل میں پہنچ گیا اور ان کے کندھے
پر ہاتھ مار کر پیچھے دھکیلا۔ انہوں نے حاضر دماغی کا
مظاہرہ کرتے ہوئے خطرے کے الارم والا سوچ دہرایا مگر
سائرن دھونکا دے گا۔ اسنے میں نوجوان نے اُن کی کپٹی
پر ریلوے کی ٹال لگا دی۔

”خبردار! اگر چالاک کی دکھائی تو بھیجا اڑا دوں گا۔“
اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ہاتھ پیچھے گردن پر رکھو اور
کھڑے ہو جاؤ۔“

باہر بابا کی جان سوکنے لگی اور سامنے بیٹھا گاڑی
کا پنے لگا۔ انہیں اپنی موت بالکل قریب دکھائی دے رہی
تھی جس سے وہ خوف سے کانپ رہے تھے اور وہ حکم کے

کلاب پور کے جنوبی علاقہ نرالا مگر پر ایک ڈیری والی
روڈ واقع ہے جہاں بینک آف پنجاب
کی برانچ بھی مین روڈ پر ہی واقع ہے۔ دن ساڑھے تین
بجے کا وقت تھا۔ سڑک پر کافی گہما گہمی تھی۔ بینک میں اس
وقت منیجر باہر بابا کے علاوہ کیشئر نجف علی، علیہ چوہدری، بی
ایم زیدی، طارق ہاجو، چڑھی ڈاکٹر حسین، سوہرہ طارق
کے علاوہ گاڑی روکھ علی اور اس کی ماں عائشہ نسیم جوی، محمد
آصف و خورشید تھے۔ ٹھیک تین بج کر پینتالیس منٹ پر دو
نوجوان بینک میں داخل ہوئے، دونوں ہی جلیٹ سہینے
ہوئے تھے، ایک نوجوان روکھ علی کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا
جبکہ دوسرا نوجوان منیجر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔
منیجر باہر بابا اس وقت کسی فائل پر نظریں گاڑے

سے لیروں کے بارے میں گہرائی سے پوچھ چمک کی۔ افسران نے ڈاکوؤں کے ذریعے چھوڑے گئے بینک کی تلاش کی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ڈاک سکواڈ بھی باہر آ کر رک گیا۔ بینک میں لگے سی سی ٹی وی کیمروں کی بابت بینک ملازمین نے بتایا کہ وہ کئی ماہ سے خراب ہیں۔ اس کی اطلاع اعلیٰ افسران کو دے دی گئی ہے۔ آئی جی قیصر عباس نے اعلان کیا کہ جو بھی لیروں کی اطلاع دے گا اسے ایک لاکھ روپے کا نقد انعام دیا جائے گا۔ واقعہ کی رپورٹ تھانہ سول لائن ڈکیتی کے تحت درج کی گئی اور تفتیش کا کام انسپکٹر عاطف چوہدری کے سپرد کر دیا گیا۔

29 نومبر کو ڈکیتی ہوئی تھی۔ رات دیر گئے تک جانچ پڑتال جاری تھی۔ افسران لوٹ کی واردات پر بحث کر رہے تھے کہ بھی خبر آئی کہ باغ جناح پارک میں کچھ نوجوان ایک ہائیک کو آگ لگا کر بھاگ گئے ہیں۔ علاقائی لوگوں کی اطلاع پر باغ جناح پولیس نے موقع پر پہنچ کر آگ بجھائی اور نیم سوختہ ہائیک قبضہ میں لے لی۔ اگلے دن آر ٹی اے سے معلومات حاصل کی گئی تو علم ہوا کہ مذکورہ ہائیک رجانہ کے باشندے احمد فراز راجو کے نام پر ہے۔ پولیس نے احمد فراز راجو سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے بتایا کہ ہائیک بچھے ہفتے راول جمیل سے چوری ہو گئی تھی جس کی رپورٹ تھانہ رجانہ میں درج ہے۔ پولیس نے علاقہ کے کئی مشتبہ لوگوں اور کئی پرانے کار چوروں کو پکڑ کر حراست میں لے کر پوچھ چمک کی مگر معاملہ صفری نکلا۔ ادھر سول لائن پولیس نے بینک کے ملازم طارق اور احمد حسن کو حراست میں لے کر پوچھ چمک شروع کر دی۔

تجربہ نہیں کہ لوگوں کو خوفزدہ کر دیا جائے مگر یہ بھی نہیں ہے کہ اس کے سبب ملت شہرت کے لئے مکمل جائیں۔ عجیب ہے کہ محنت کی طرح بھی اس کی جگہ لے سکے

مطابق دی کر رہے تھے جیسادہ کرنے کو کہہ رہا تھا۔ اسی دوران روح علی منیر کے کمرے کی طرف آئی اور اس نے دیکھا کہ نوجوان منیر کی کپٹی پر ریوالور لگائے انہیں باہر کی طرف لا رہا ہے۔ روح علی چپ چاپ اپنی ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور ماں کو بتانے لگی۔ بھی اچانک اس کے پیچھے بیٹھا نوجوان ریوالور لہراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”بھئی لوگ چپ چاپ کھڑے ہو جائیں۔“ اس نے حکم دیا۔ ”ہاتھ سر پر رکھ لیں اور اپنے موبائل زمین پر پھینک دیں۔“

پھر وہ اسٹرائیک روم کی طرف بڑھا۔ گاؤں کے پاس والا نوجوان بھی گاؤں کو کور کئے ہوئے اسٹرائیک روم میں لے آیا۔ اسی دوران ڈاکر حسین، طارق اور مکی ایم زیدی نے کچھ حرکت کرنے کی کوشش کی تو ڈاکوؤں نے ریوالور تان کر انہیں ساکت کر دیا۔ پھر ایک بد معاش کبھی کو گن پوائنٹ پر کور کئے رہا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی لائے ہوئے بیگوں میں لوٹ بھرنے لگا۔ روپے بھرتے وقت اس بد معاش کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر روح علی کو لگا کہ وہ اناڑی ہے پیشہ ور ڈاکو نہیں ہے اور ڈر رہا ہے، اس نے ریوالور والے بد معاش سے بھڑنا چاہا لیکن بھی اس کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ محض چند منٹ میں قلمی انداز سے بینک لوٹ کر دلوں بد معاش ریوالور لہراتے ہوئے فرار ہو گئے۔

آدی خوددار کیا ہوگا خوددار تو ہماری کا پچھتا ہے جو کھائے چارے کی قیمت اپنا گوشت کھلا کر ادا کرتا ہے۔

ڈاکوؤں کے بھاگ جانے کے بعد روح علی بینک کے باہر آئی اور پڑوسی ڈکاندار علی جان سے موبائل لے کر 15 نمبر پر واقعہ کی اطلاع پولیس کو دے دی۔ تھوڑی ہی دیر میں کئی قانون کی پولیس اعلیٰ پولیس افسران کے ساتھ موقع پر پہنچ گئی۔ افسران نے بینک میں موجود تمام لوگوں

دن گزرتے گئے مگر پولیس کو کوئی کامیابی نہیں ملی تو حسن عباس نے جہدے کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے سب سے پہلے سول لائن تھانہ انچارج عاظم چوہدری کا تبادلہ کر دیا اور ان کی جگہ ناصر گجر کو لایا گیا۔ بینک ڈکیتی کی تفتیش کر رہی پرانی ٹیم کو ہٹا کر نئی ٹیم بنائی گئی۔ ڈی پی او حسن عباس نے سافٹ ویئر کی ایک بالکل نئی تکنیک کا استعمال کیا۔ اس تکنیک سے موبائل ٹاور پر بیوی ٹریک کے باوجود پولیس کو آسانی سے کئی مشتبہ نمبر ملے جس سے پولیس کو کافی مدد ملی۔ پولیس کو ایک ایسا نمبر مل گیا جو حادثہ کے بعد سے ہی بند تھا جبکہ حادثہ کے وقت اس کی لوکیشن بینک کے موبائل ٹاور میں موجود تھی۔

کووڑس کا اتحاد اور چیونٹیوں کی عظیمی قطار کسی بھی قوم یا گھرانے کے لئے مشکل راہ ہو سکتی ہے۔

اسی دوران ایک دن اشرف عرف چھرا میرے کمر آیا اور مجھ سے کہا کہ کچھ کیا جائے ورنہ پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ اشرف کا دوست ساہر بھی پریشان تھا، اس کا باپ 18 سال قبل ہی لاپتہ ہو گیا تھا۔ تب سے آج تک اس کا پتہ نہیں چلا۔ وہ ایم ایس سی کی فیس بھی نہیں جمع کرا پا رہا تھا۔ اسی وقت فون کر کے اشرف نے ساہر کو بلوایا۔ ہم لوگوں نے پارک میں بیٹھ کر بینک ڈکیتی کا منصوبہ بنایا۔ میرا بینک آف ریجسٹرڈ لیبر کالونی میں کھاتا تھا۔ اسی سبب مجھے وہاں کی سرگرمیوں کا علم تھا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر بینک کا نقشہ بنایا اور اشرف اور ساہر کو سمجھایا۔ اس کے بعد اشرف ساہر نے کئی بار بینک کی ریکی کر کے وہاں کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے طے کیا کہ ایک موٹر سائیکل دو ریوالور و کارتوس کا انتظام پہلے ہی کر لیا جائے۔ میں نے اپنے دوست بنگلہ کے رہنے والے شاداب سے ایک ریوالور و کارتوس کا انتظام کر لیا۔ اس کے بعد اشرف سے وقت لے کر وکیل احمد جس کی بریانی کی دکان ہے، اس سے ایک ریوالور و کارتوس لے آیا۔ اسلحہ کا بندوبست ہو گیا۔ تب ایک موٹر سائیکل کے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ منصوبے کے مطابق اشرف عرف چھرا اور میں اپنی یا ماہا موٹر سائیکل سے گول چکر گئے اور وہاں شینڈ میں اپنی گاڑی کھڑی کر دی اور پرچی لے کر دونوں سول لائن واپس آ گئے اور اسی پرچی سے کپیڈٹر کی دکان سے سکیٹن کر لیا۔ اس طرح ہمارے پاس دو پرچیاں ہو گئیں۔ اس کے بعد واپس جا کر ایک پرچی سے اپنی یا ماہا

پولیس ٹیم نے اس نمبر کی آئی ڈی نکالی تو اجازت کا پتہ ملا جو اس بینک کا خاص کھاتے دار تھا اور اب یہ کھاتے بند تھے۔ پولیس نے تینوں کی آئی ڈی نکلوائی اور پھر ریجسٹرڈ لیبر کالونی کے باشندے اشرف عرف چھرا، نواب پور کے باشندے ساہر کے علاوہ بنگلہ کے رہنے والے اجازت کو گرفتار کر لیا۔ اشرف عرف چھرا اور ساہر طالب علم تھے جبکہ اجازت ایم ایس سی کا طالب علم تھا۔

پوچھ گچھ میں ملزموں نے بینک ڈکیتی کا اعتراف کر لیا۔ انہوں نے ڈکیتی کا واقعہ جو بیان کیا تو اسے سن کر انسپران بھی ہکا بکار ہو گئے۔ اجازت قریشی نے پولیس کو بتایا کہ بنگلہ کے مکان نمبر 257 میں ہم رہتے تھے مگر حاجی وسیم وغیرہ نے دھوکا دے کر مکان اپنے نام لکھوا لیا۔ جب سے ہم لوگ بے گھر ہو گئے ہیں۔ راحیل میرا دوست ہے جو لیبر کالونی میں رہتا ہے۔ اشرف عرف چھرا کا دوست ساہر ہے جو اشرف کے ساتھ ایم ایس سی کر رہا ہے۔ میرا گھر جب وسیم وغیرہ نے لے لیا تو میں اشرف کی مدد سے سول لائن چوراہے کے پاس کرائے کا کمرہ لے کر رہنے لگا۔ میرے ماں باپ بہن بھائی بھی ساتھ رہتے تھے۔ تھوڑے دن بعد ہی ہم عثمان پور میں واقع ناصر کے بینک

باہر نکل آئے اور ریوانور لہراتے ہوئے موٹر سائیکل کے پاس پہنچ گئے۔ آس پاس کے ڈکاندار ریوانور راہ گیر ریوانور دیکھ کر بھاگنے لگے۔ اس کے بعد اشرف نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی تو میں پیچھے بیٹھ گیا اور لال حویلی ہوتے ہوئے عثمان پورہ کا لوٹی پہنچے جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میرے گھر والے سول لائن والے کرائے کے کمرے میں تھے۔ ہم لوگوں نے کمرہ بند کر کے وہیں پر سارے روپے گئے، وہ کل رقم ایک کروڑ دس لاکھ تھی۔

وہ ہنڈا موٹر سائیکل اندر کھڑی کر دی۔ پھر روپوں سے بھرے دونوں بیگ ہتھکوں کے ڈھیر کے درمیان میں چھپا دیئے اور اپنے بھائی کو فون کر کے بلوالیا۔ اس نے کچھ دن پہلے ہی گیسروالی سائیکل سات ہزار میں خریدی تھی۔ بھائی کے آنے پر اس کی گیسروالی سائیکل اشرف کو دلا دی۔ اشرف روپوں سے بھر ایک بیگ لے کر اپنے گھر چلا گیا اور روپے اپنے گھر میں رکھ کر سائیکل سے میرے پاس آ گیا۔ اس بار سائیکل گھر میں کھڑی کر دی اور میں اپنی یاہا موٹر سائیکل سے اور اشرف ہنڈا موٹر سائیکل سے دوسرا بیگ لے کر اشرف کے گھر کی طرف چلے۔ میں آگے آگے چل رہا تھا، اشرف میرے پیچھے تھا۔ جب ہم لوگ باغ جناح پارک کے پاس پہنچے تو بٹھا کی چین ٹوٹ گئی۔ جسے اشرف نے وہیں چھوڑ دیا اور میری بائیک پر بیٹھ کر اپنے گھر پہنچا۔ اشرف نے دونوں بیگ اپنے اوپری کمرے کے چان میں رکھ دیئے۔ ساہر کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بیگ لوٹنے کے بعد وہ وہیں سے اپنے گھر چلا جائے گا۔ میں تو اشرف کے گھر سے واپس چلا آیا۔ موہاٹل سیٹ دسم اسی دن توڑ کر بند پڑے ٹی وی کے اندر ڈال دیئے تھے۔ ادھر رات گئے سنانے کا فائدہ اٹھا کر اشرف نے ثبوت مٹانے کی غرض سے ہنڈا موٹر سائیکل کو آگ لگا دی اور چپ چاپ اپنے گھر بھاگ گیا۔

اگلے دن اشرف نے مجھے بیس لاکھ 53 ہزار

موٹر سائیکل اٹھالی اور دوسری سکین پرچی سے موٹر سائیکل کا نمبر لکھ کر رات 8 بجے اسے بھی اٹھا لیا۔ یہ موٹر سائیکل اشرف کے گھر ہی رہتی تھی۔ گھر والوں کے پوچھنے پر اس نے بتا دیا کہ ایک دوست کی ہے۔ کبھی کبھی وہ میرے گھر پر بھی کھڑی کر جاتا تھا۔ جب ہمارے پاس دو موٹر سائیکل ہو گئیں اور ریوانور کا روس بھی ہو گئے تو اشرف عرف چھرا میرے گھر آیا اور فون کر کے ساہر کو بھی وہیں بلا لیا۔ دوپہر تقریباً ساڑھے تین بجے بینک آف پنجاب پہنچے۔ ہم دونوں نے ایک سم دونوں سیٹ میں ڈال کر اپنے پاس اور ایک اشرف نے رکھ لی اور تیسری سم ساہر کے موبائل میں ڈال کر بینک کے سامنے مزک کی دوسری ہٹری پر کھڑے ہو کر اپنے اپنے موبائلوں میں کال کا نذر ننگ کر لی۔ ساہر کو بینک کے باہر گمرانی پر لگا کر موٹر سائیکل لال حویلی جانے والی گلی میں کھڑی کر کے میں اور اشرف ہیلسٹ لگائے ہوئے ساڑھے تین بجے کے بعد بینک میں داخل ہوئے۔ مگر اس دن بینک میں گاؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لئے ہمت نہیں پڑی ہم کبھی اس دن واپس ہوئے۔

مؤرخہ 27 نومبر کو بھی اسی طرح ہم لوگ اسی وقت بینک گئے مگر اس دن بھی امید سے زیادہ بھیڑ تھی۔ سو لوٹ آئے۔ پھر اگلے دن چھٹی ہو گئی۔ 29 نومبر کو پھر موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ہم لوگ بینک میں پہنچے۔ ساہر کو مزک پر اتار کر میں اور اشرف ہیلسٹ لگائے بینک کے اندر داخل ہوئے۔ میرے ہاتھ میں پہلے سے ہی تین ونڈ بیگ روپوں کو بھرنے کے لئے تھے اور اشرف اپنے ہاتھ میں تالا لئے تھا جس نے صدر گیٹ میں کنڈی بند کر کے تالا لگا دیا تاکہ نہ کوئی باہر سے اندر آ سکے اور نہ ہی اندر سے کوئی باہر جا سکے۔ ایک چابی اشرف کے پاس تھی اور دوسری مجھے دے دی تھی۔ ہم لوگوں نے اپنی انگلیوں میں ٹیپ لگائے تھے تاکہ نشان نہیں آ سکے۔

بینک لوٹنے کے بعد صدر گیٹ کا تالا کھول کر ہم

نہرو

گرم رکھنے کا
ہے اک بہانہ

صابر حسین راجپوت

ان کہانیوں میں صرف شکار نہیں حقیقی
زندگی کے چونکا دینے والے ڈرامے، سچی
محبت اور جھٹکا سیریز کے کردار، اور
پاکستان کی مردانگی کے حیران کن کارنامے
ملیں گے۔

کتاب چھپ کر تیار ہے اپنے
آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

مکتبہ داستان

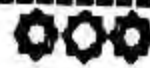
26 پیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ۔ لاہور

فون: 042-37356541

روپے دیئے۔ اسی دن ہم لوگ مال روڈ پر گئے، یہاں
سے نام سنگ گلیکسی ٹیب موہاں لیا۔ اسی دکان سے
اشرف نے بھی موہاں اور کچھ کپڑوں کی خریداری کی۔
پندرہ ہزار روپے چنگ والے کے ادھار چھٹا کئے اور
پچاس ہزار پانچ سو روپے گڑیا ماں کا ادھار چکا یا۔ اگلے
دن میں اپنے گھر والوں کو لے کر لاہور چلا گیا۔ مال روڈ
پر واقع ایک ہوٹل میں سات دن رہا جس کا کرایہ بیس ہزار
چھٹا کیا۔ اس دوران ڈینس میں ایک کوشی کرایہ پر لے
لی۔ انہی دنوں میں واپس گلاب پور آیا اور ٹرک سے اپنا
سامان لاہور لے گیا۔ ٹرک کا کرایہ بیس ہزار روپے دیا۔
ایک لاکھ روپے اپنے بھائی ہارون کے کھاتے میں بینک
آف پنجاب کی برانچ میں جمع کئے۔ اس طرح لوٹ کی رقم
سے ہی کافی روپیہ کھانے پینے میں خرچ کر دیا۔

اسی طرح ساہرا اور اشرف نے بھی اقبال جرم کر لیا۔
تینوں سے پولیس نے لوٹ کی کافی رقم برآمد کی۔ ساہرے
فیس کے 50 ہزار روپے جمع کرائے تھے جو کالج انتظامیہ
نے پولیس کو واپس کر دیئے۔ اسی طرح چنگوں والے اور
گڑیا ماں سے بھی رقم واپس مل گئی۔ پولیس نے تینوں کو
عدالت میں پیش کیا۔ جہاں سے انہیں سیدھے جیل بھیج
دیا گیا۔ بینک آف پنجاب نے پولیس کی پوری ٹیم کو
اعزاز بخشا اور اپنے ملازم طارق دگاہک مددگار کو بھی
بلا خوف حوصلہ کھانے کے لئے اعزاز دیا گیا۔

جس طرح کسی خلائی جہاز کو مدار میں کی گرفت سے نکلنے
کے لئے ایک انتہائی بلند رفتار کی ضرورت ہوتی ہے اسی
طرح ہمیں بھی اپنے مخصوص میلانات و تعصبات سے
بالترہونے کے لئے بہت زیادہ قوت لازمی درکار ہے۔



ضربِ سکندری

باعثِ ذلتِ پایا باعثِ شرمندگی

یہ امر حیران کن ہے اور اہل ہند کے لئے مقامِ عبرت بھی کہ ایک تیس کی برتری کے باوجود اور وہ بھی اپنی ہی سرزمین پر ہم غلام بن گئے اور وہ بھی چند دنوں یا چند سالوں کے لئے نہیں بلکہ کم و بیش دو سو سالوں کے لئے۔

☆ سکندر خان بلوچ

برطانوی جنگوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارا سر شرم اور ذلت سے جھک جاتا ہے۔ برطانیہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو کم و بیش بڑے صغیر سے 6 ہزار میل دور ہے۔ خشکی کا کوئی راستہ نہیں کہ وہاں تک پہنچا جائے یا وہاں کے لوگ یہاں تک پیدل مارچ کرتے ہوئے پہنچ جائیں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ وہاں سے لوگ آ کر یہاں حکمران بن گئے۔ جب انگریز بڑے صغیر میں آئے تو وہ محض تاجر تھے اور وہ تاجروں کی طرح مختصر سی جماعت کے ساتھ یہاں پہنچے۔ آئے بھی صرف ایک جہاز میں تھے جس پر اگر قبضہ کر لیا جاتا تو وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتے واپس اپنے وطن نہ جا سکتے۔ (1608 میں ایک ہائیڈرو گرافک 500 ٹن وزنی صرف ایک جہاز جنوبی ہند کی بندرگاہ ”سورت“ پر لشکر انداز ہوا۔ یہ جہاز کمیشن ہائیکنز نامی شخص کمانڈ کر رہا تھا۔) اُس دور میں ہوائی جہاز بھی نہ تھے کہ ایک ہی دن میں واپس

دھکست و فتح جنگ کا حصہ ہوتی ہیں۔ اکثر چھوٹی افواج بڑی افواج پر غالب آ جاتی ہیں جس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جنگ بدر میں بھی یہی کچھ ہوا تھا کہ 313 کا مسلمان لشکر ایک ہزار کفار پر غالب آ گیا۔ اگر اس جنگ کا تجزیہ کیا جائے تو دو وجوہات سامنے آتی ہیں۔ اول: جنگی قیادت اور دوم: جنگی جذبہ۔ اُس وقت مسلمانوں میں یہ دونوں چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جنگی قیادت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں تھی اور یہ منہجی بھر مسلمان جذبہ اسلام سے بھی سرشار تھے۔ جس فوج میں یہ دونوں صلاحیتیں موجود ہوں وہ ہمیشہ فتح سے ہمکنار ہوتی ہے۔ یہی صلاحیتیں مسلمانوں کے اُس لشکر میں بھی تھیں جو طارق بن زیاد کی قیادت میں ساحل اندلس پر لشکر انداز ہوا اور اندلس کا مالک بن گیا۔ اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے جب ہم بڑے صغیر میں

نہ صغیر آسکتے تھے۔ اُس وقت کے برصغیر کی آبادی تقریباً 15 کروڑ تھی۔ اگر پوری برطانوی آبادی کا تناسب بھی نکالا جائے تو اہل ہند کو ایک کے مقابلے میں تیس کی برتری حاصل تھی جبکہ جنگ بدر میں اہل کفار کو ایک کے مقابلے میں تین کی برتری حاصل تھی۔ یہ امر حیران کن ہے اور اہل ہند کے لئے مقام عبرت بھی کہ ایک تیس کی برتری کے باوجود اور وہ بھی اپنی ہی سرزمین پر ہم غلام بن گئے اور وہ بھی چند دلوں یا چند سالوں کے لئے نہیں بلکہ کم و بیش دس سالوں کے لئے۔

یہ امر مزید حیران کن ہے کہ برصغیر میں دوسری جنگ عظیم کے دوران زیادہ سے زیادہ برطانوی فوج جسے گورنر فوج کہا جاتا تھا صرف ساٹھ ہزار تھی اور کسی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ سول پور و کرپٹ بشمول تمام ملازمین دو ہزار سے زائد نہ تھے۔ بالفاظ دیگر انگریزوں نے محض 62 ہزار برطانوی اشخاص کی مدد سے 40 کروڑ ہندوستانیوں اور 37 لاکھ مربع کلومیٹر پر حکومت کی۔ یاد رہے کہ 1941 تک ہندوستان کی آبادی بڑھ کر 40 کروڑ تک پہنچ چکی تھی۔ اس حساب سے تو تناسب فی برطانوی چھ ہزار ہندوستانی بنتا ہے اور اگر فوج کا حساب بھی لگایا جائے تو دوسری جنگ عظیم میں 60 ہزار برطانوی فوج کے علاوہ 21 لاکھ ہندوستانی فوج بھی تھی جنہیں برطانوی آفیسرز کمان کر رہے تھے یعنی ایک گورے سپاہی کے مقابلے میں تقریباً 35 مسلح ہندوستانی سپاہی تھے۔ پھر بھی حکومت انگریزوں کی ہی رہی۔ ایک اچھا اور پھر تھلا گڈریا بھی بیک وقت 20 سے 25 بھیتروں کو قابو میں رکھ سکتا ہے یا 15 سے 20 بڑے جانوروں کو۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک گڈریا ہزاروں کی تعداد میں جانوروں کو اپنے قابو میں رکھ سکے چہ جائیکہ انسانوں کو لیکن ہم تو جانوروں سے بھی بدتر تھے۔ 40 کروڑ کی تعداد میں ہوتے ہوئے 62 ہزار کی غلامی میں رہے..... غلامی

پہنچ سکتے یا مزید کم یہاں آسکتی۔ جب انگریزوں نے سرزمین ہند پر قدم رکھا تو مغل حکومت عروج پر تھی۔ وسائل بھی بے انتہا تھے اور انہی وافر وسائل کی وجہ سے ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا تھا۔ بھوکے ننگی یورپی اقوام ہندوستان پہنچنے کے لئے بے قرار تھیں۔ اُس دور میں نہر سوئز بھی نہ تھی کہ برطانوی ایک دو ہفتوں میں یہاں پہنچ جاتے بلکہ انہیں آدمی دنیا کے گرد چکر لگا کر یہاں آنا پڑتا تھا۔ وہ انگلستان سے روانہ ہو کر مغربی یورپ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے مراکو تک پہنچتے تھے اور پھر پورے افریقہ کے گرد چکر لگا کر سورت جنوبی ہندوستان تک پہنچتے تھے۔ کچھ تاریخی حوالوں سے یہ کم از کم 9 ماہ کا سفر تھا۔ Navigation کے طریقے بھی جدید نہ تھے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کولمبس یورپ سے ہندوستان کے لئے روانہ ہوا اور ہندوستان کی بجائے شمالی امریکہ جا پہنچا..... ان حالات پر جب غور کیا جائے تو کوئی ڈی ہوش انسان یہ قبول نہیں کر سکتا کہ برطانوی تاجروں کی یا ملاحوں کی اتنی دور سے بے سرو سامانی کی حالت میں یہاں پہنچنے والی چھوٹی سی ٹولی اتنے بڑے برصغیر کی مالک بن گئی۔ اتنی بڑی ہندی افواج کو شکست دی اور شکست بھی مکمل برطانوی فوج کے ساتھ نہیں بلکہ ان انگریزی تاجروں کی قائم کردہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم سپاہیوں کے ساتھ یعنی وہی سپاہی جب اپنے وطن کی طرف سے وطن کی حفاظت کے لئے لڑے تو ریت کی دیوار ثابت ہوئے لیکن جب انگریزی کمان کے تحت لڑے تو اپنے سے کئی گنا بڑی اپنے ہی وطن کی افواج کو تھس تھس کر ڈالا۔ سمجھ نہیں آتی ایسا کیونکر ہوا۔

سترویں صدی کے شروع میں برطانیہ کی کل آبادی بمعدہ آئرلینڈ پچاس لاکھ کے لگ بھگ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ تمام کے تمام لوگ فوجی نہ تھے اور نہ ہی یہ سب لوگ

بیٹھی

(پیاری بیٹی شمیمہ انور کے نام جو کسی میں فوت ہو گئی)

محمد اور لیس انور کوٹ

تم نے تو کہا تھا عید پہ آ جاؤں گی
لوٹ آؤ جان پہر عید آئی ہے
پاپا سے پھڑنے کا تب سوچا تھا تو نے
یہ کیسا دھوڑا ہے، کیسی یہ ہدائی ہے
جنت کی فضاؤں میں پہرہ تیری ہر دم
وہ کیسی دنیا ہے جو تو نے بسائی ہے
حوروں نے تجھے ہاتھوں ہاتھوں لپا ہو گا
گستاخ ستاروں نے تیری مانگ سہائی ہے
جدا ہو کے جو ہم سے، رنج سفر ہاندا
مڑ کے بھی نہ دیکھا کیسی قیامت ڈھائی ہے

تھے جو افواج کو لڑا سکتے۔ دوسری بد قسمتی یہ بھی کہ بغاوت کرنے والی فوج میں ہندی آفسرز نہ تھے۔ اُس وقت تک کسی بھی ہندوستانی کے لئے سب سے بڑا رینک صوبیدار تھا اور یہ لوگ زیادہ تر راجوں اور مہاراجوں کی اولادیں تھیں جنہیں یہ رینک ان راجوں کو قابو میں رکھنے کے لئے اعزازی طوطہ پر دیا جاتا تھا اور یہ لوگ برٹش آفسرز اور ہندی فوج کے درمیان محض رابطے کا کام دیتے تھے۔ یہ لوگ جنگی قیادت کے اہل نہ تھے۔

ان حالات میں بغاوت کرنے والے فوجی ملک کے طول و عرض سے بولی کی طرف بھاگے تاکہ بادشاہ سلامت کی قیادت میں لڑیں۔ تقریباً 80 فیصد فوج باغی ہو کر بھاگ گئی۔ بہت سے لوگ راستے کی مشکلات کا شکار ہو کر مارے گئے اور ایک بڑی تعداد کو انگریزی افواج نے جن جن کر مار دیا۔..... مثلاً پشاور اور گردونواح

اور تابعداری اس حد تک کہ کم و بیش اڑھائی لاکھ ہندوستانیوں نے انگریزوں اور انگریزی حکومت کے لئے جان دے دی۔ یہ لوگ مختلف محاذوں پر برطانیہ کی طرف سے لڑتے رہے۔ تقریباً 12 لاکھ ہندوستانی انگریزی پالیسیوں کی وجہ سے مارے گئے ان میں 10 لاکھ افراد تو صرف 1947 کی تقسیم ہند میں مارے گئے حالانکہ انگریز اس مسئلے کو صلح صفائی سے حل کرا سکتے تھے اور تقریباً 2 لاکھ کے لگ بھگ اُن انگریزی جنگوں میں کام آئے جو انگریزوں اور مقامی راجوں مہاراجوں کے درمیان ہوئیں۔

1857 میں جنگ آزادی کے وقت کل انگریزی فوج کی تعداد 45 ہزار برطانوی تھے اور تقریباً اڑھائی لاکھ کے قریب ایٹا کھنی کے زیر سایہ مارے لوگ فوجی ملازمت کرتے تھے جو 'Native Infantry' یعنی مقامی انٹرنی کہلاتے تھے۔ یہ لوگ کلکتہ سے پشاور تک مختلف جھانڈیوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُس وقت جبکہ نقل و حرکت اور مواصلاتی وسائل بھی نہ ہونے کے برابر تھے لہذا 45 ہزار برطانوی فوج کے لئے اڑھائی لاکھ کی فوج جو کہ 37 لاکھ مربع کلومیٹر میں پھیلی ہوئی تھی کو قابو میں رکھنا بالکل آسان کام نہ تھا۔ انگریزی حکومت کی طرف سے فوجی نظم و ضبط قائم رکھنا واقعی قابل ستائش عمل تھا۔ 1857 میں جب فوجی بغاوت ہوئی تو یہ بغاوت میرٹھ سے شروع ہو کر پشاور تک پہنچ گئی۔ ہندی سپاہی انگریزوں کے ساتھ لڑنے کے لئے اور اپنی جان دینے کے لئے تو تیار تھے لیکن بد قسمتی سے اُن کے پاس کوئی قوی سطح کی قیادت نہ تھی جس کے ارد گرد وہ اکٹھے ہوتے اور اُس کی زیر قیادت لڑتے۔ نے دے کر آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر تھا جو بادشاہ سے زیادہ درویش تھا یا شاعر تھا۔ اُس میں بڑی فوج کی قیادت کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی نہ ہی اُس کے پاس کوئی تجربہ کار جرنیل

بھاری تو ہیں بھی تھیں۔ اُس زمانے کے مطابق یہ فوج مکمل تربیت یافتہ اور ہتھیاروں سے لیس تھی۔ انگریزی فوج لارڈ کلایو کی زیرکمان محض 750 برطانوی سپاہیوں پر 150 توپخانہ کے لوگ اور تقریباً 2 ہزار مقامی سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ یہ تعداد ہر لحاظ سے معمولی تھی اور ایک دلیر جرنیل ایک دن میں 50 ہزار کی فوج کے ساتھ اس چھوٹے سے دستے کی جانی لاسکتا تھا مگر کلایو نے سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر کو خرید رکھا تھا۔ لہذا 50 ہزار کی مقامی فوج 750 برطانوی سپاہیوں سے شکست کھا گئی۔ یہی کچھ ٹیپو سلطان کے ساتھ بھی ہوا۔ اسی طرح 1760ء میں اُس وقت کے بادشاہ ہند شاہ عالم اور اودھ کے نواب شجاع الدولہ نے مل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہتھیار سکھانے کے لئے 40 ہزار کا جرنی لشکر تیار کیا۔ اتنے بڑے لشکر کو دیکھ کر ہی ایک کمانڈر کا خون خشک ہو جاتا ہے لیکن انگریز ہندوستانیوں کی کمزوریوں سے واقف تھے۔ لہذا بغیر گھبراہٹ اور پریشانی کے انہوں نے مقابلے کا چیلنج قبول کیا۔ 27 اکتوبر 1764ء کو میجر منرود Munro محض 850 برطانوی تقریباً 18 ہزار مقامی فوجیوں کے ساتھ میدان جنگ میں خیمہ زن ہوا اور اُس نے اس 40 ہزار کے جرنی لشکر کو بڑی طرح شکست دی۔ کہا جاتا ہے کہ کئی ہزار آدمی مارے گئے۔

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی فوج کی اتنی بڑی شکستیں ناقابل فہم ہیں۔ اگر 45 ہزار فوجیوں کو بھڑیں مارنے پر بھی لگا دیا جائے تو وہ پونے دو لاکھ بھڑیں نہیں مار سکتے جو انہوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانی مارے۔ 1840ء کی دہائی میں جنرل جیکب کی زیرکمان جب انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کیا تو اُن کے حوصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ ایک انگریز لیفٹیننٹ نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر اُسے ایک کمپنی برطانوی سپاہیوں کی دے دی جائے تو وہ پورا بلوچستان فتح کر سکتا ہے۔ نتیجاً

نوشہروہ مردان میں تقریباً 3 ہزار انگریز فوج اور 12 ہزار ہندو فوج موجود تھی۔ صرف پشاور چھاؤنی میں دس ہزار مقامی فوج موجود تھی۔ یہ سب لوگ بغاوت کر کے بھاگ گئے لیکن انگریز فوج کی بہادری اور جرأت کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس تین ہزار فوج نے 10 ہزار بھاگنے والی فوج کا پیچھا کیا اور اکثریت کو مار دیا۔ اس جرأت مندانہ قدم سے کم از کم اس علاقے میں مزید بغاوت رک گئی اور بعد میں مقامی فوج نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ انگریزی فوج پنڈی، کوہاٹ، پشاور، نوشہروہ اور جالندھر سے مقامی فوجی یونٹس لے کر مقابلے کے لئے ولی پٹی۔

جنگ کا آخری محاذ دلی شہر تھا۔ 45 ہزار کی انگریز فوج اور اتنی ہی تعداد مقامی افطری کی تھی۔ ان یونٹوں نے دلی کا محاصرہ کیا۔ دلی میں ایک بہت بڑی ہندوستانی فوج موجود تھی۔ اسلحے کی بھی کمی نہ تھی۔ انگریزوں نے مقابلہ کرنے سے پہلے دلی کے اندر رہائش پذیر کچھ نوجوانوں اور دیسی افواج کے سپہ سالاروں کو خرید لیا اور جاسوسی کا ایک مربوط نظام قائم کر دیا اور یوں دلی کی خبریں انگریزوں تک پہنچنے لگیں۔ اس کے بعد دلی کا قبضہ محض رسمی کارروائی ثابت ہوئی۔ اس بغاوت میں مقامی فوج کے کئی ہزار سپاہی مارے گئے اور برطانوی فوج کا بہت کم نقصان ہوا۔

برطانوی بیٹھے بٹھائے تو ہندوستان کے مالک نہیں بنے تھے۔ انہوں نے کئی خوفناک جنگیں بھی لڑیں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ مٹھی بھر انگریز فوجیوں نے اپنے سے کئی گنا بڑی فوجوں کو نہ صرف شکست دی بلکہ وہ اُن کے سامنے محض ریت کی دیواریں ثابت ہوئیں۔ انگریزوں کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ایک موثر نظام جاسوسی اور مقامی سپہ سالاروں کی خرید تھی۔ مثلاً پلاسی کی جنگ میں نواب سراج الدولہ کی افواج کی تعداد 50 ہزار پیادہ اور 18 ہزار گھڑ سوار تھی۔ جنگ کے لئے 53 ہزار

اپنی آزادی کے لئے خطرہ سمجھا۔ ہذا کرکس کے مقابلے کے لئے آگئے۔ اُن کے پاس کوئی خاص ہتھیار بھی نہ تھے نہ ہی فوجی تنظیم تھی۔ انہوں نے فوج کی واپسی کا راستہ بند کر دیا ہے درپے حملے کر کے مکمل فوج کو تباہ کر دیا۔ 18 ہزار کے لشکر میں سے صرف ایک ڈاکٹر زندہ بچا۔

دوسری مثال جاپان کی ہے۔ جاپان اُس دور میں ترقی کے لحاظ سے ہندوستان سے بہت پیچھے تھا۔ 1854ء میں امریکن نیوی کا کموڈور پیری Perri بعد ایک بڑے نیول دستے کے جاپان کے ساحل پر ٹنگر انداز ہوا۔ اُس کا مقصد بھی تجارت تھا اور تجارت کی آڑ میں قبضہ۔ خوش قسمتی سے جاپان کی قیادت بڑی ہوشیار، عقلمند اور دور رس سوچ کی حامل تھی۔ انہوں نے تجویز کیا کہ امریکن ان سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ لہذا انہوں نے امریکیوں کو خوش آمدید کہا۔ امریکن طرز کی تعلیم رائج کی۔ ان سے علم و ہنر سیکھا۔ امریکن طرز پر ان کی مدد سے انڈسٹری قائم کی اور نصف صدی کے عرصہ میں اتنی ترقی کی کہ 1905ء میں جب روس نے ایک بہت بڑے بحری بیڑے کے ساتھ جاپان پر حملہ کیا تو جاپانیوں نے جاپان کے اپنے بنے ہوئے جہازوں سے نہ صرف اس حملے کا مقابلہ کیا بلکہ تمام روسی بحری بیڑے کو سمندر میں غرق کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم لڑنے اور اٹلی حملے برداشت کرنے کے باوجود جاپان آج بھی آزاد ہے اور ایک معاشی طاقت ہے۔ ہم بالواسطہ طور پر آج بھی غلام ہیں اور معاشی طور پر بھکاری اور منہوگ الحال۔ آئیں اپنی کارکردگی کا تجزیہ کریں اور زمانے کے ساتھ چلنے کی کوشش کریں ورنہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے (خدا نخواستہ)۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرمِ خطی کی سزا مرگِ مفاجات



ہم سب کے لئے شرم اور ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ برطانوی افواج اپنے اعلیٰ ہتھیاروں کی وجہ سے کامیاب ہوئی لیکن یہ دعویٰ بھی صحیح نظر نہیں آتا کیونکہ اُس ابتدائی دور میں فوج کے پاس محض دو قسم کے ہتھیار تھے ایک تو توپخانہ تھا اور اُس زمانے میں توپ کی جد فائر محض ایک ہزار گز تک تھی اور رفتار تین منٹ میں ایک گولہ۔ دوسرا ہتھیار ایک بڑوکہ قسم کی بندوق تھی جس کی فائر رینج محض پچاس گز تک تھی اور ہر فائر کے بعد کھوکھا نکال کر دوبارہ لوڈ کرنا پڑتی تھی۔ یوں رفتار ایک منٹ میں ایک گولی تھی۔ ان ہتھیاروں کے ساتھ دلیر سے دلیر سپاہی بھی حملہ آور فوج کا بہت زیادہ نقصان نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دلیر حملہ آور کیلوری کمانڈر تین منٹ میں فائر کرنے والے کے سر پر پہنچ سکتا تھا۔ لہذا یہ مفروضہ غلط ہے کہ انگریزوں کے پاس زیادہ اچھے ہتھیار تھے۔ واحد فرق یہ تھا کہ انگریزوں کے لئے جنگ زندگی اور موت تھی لہذا وہ جرأت سے لڑے اور عقل کا استعمال کیا جبکہ ہندوستانی حکمران اور افواج آرام پسند اور شدید جنگ کے لئے قطعاً نکل نہ تھے۔ لہذا یا تو افواج دوڑ جاتی تھیں یا گاجر مولیٰ کی طرح کٹ جاتی تھیں۔ دلیرانہ مقابلہ کرنے کے قابل ہی نہ تھیں اور نہ ہی اُن کے کمانڈرز لڑنے کے اہل تھے۔ اس کے علاوہ اہم ہتھیار تلواریں تھیں جس میں دیسی لوگوں کا پلہ بھاری تھا لیکن پھر بھی یہ کچھ نہ کر سکے۔ یہ بھی غلط ہے کہ یورپی اقوام دیسیوں سے زیادہ عقلمند اور زیادہ دلیر تھیں۔ جہاں جم کر مقابلہ ہوا یورپیوں کی ہار ہوئی۔ یہاں دو مثالیں قابل غور ہیں۔

1841ء میں 18 ہزار برطانوی فوج افغانستان پر حملہ آور ہوئی۔ شدید جنگ لڑی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ نامراد واپس لوٹی۔ کابل سے واپسی پر افغانیوں نے فوج و بہت زیادہ نقصان کیا لیکن جب انہیں ہمارے موجودہ قبائلی مناتے سے گزرنا پڑا تو قبائلیوں نے انگریز فوج کو

ورودی کا تقدس

میرا ایمان ہے کہ اگر ہمارے معاشرے کو ایماندار پولیس مل جاتی تو کم از کم نصف معاشرتی برائیاں ختم ہو چکی ہوتیں۔



ڈاکٹر مہر حسن ملک

☆

ورودی کی اپنی ایک عظمت ہوتی ہے، تقاضے بھی۔ وردی کسی مشن کے تحت پہنی جاتی ہے جو دھرتی ماں ہاوردی سپوتوں کو سونپ دیتی ہے۔ وہ کڑیل اور جیلا جوان تھا، پولیس افسر، جو تھانگی ڈکیتوں کا مقابلہ کر رہا تھا، پھر سینے میں پیوست گولیاں سجائے شہید ہو گیا۔ میں نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا بدن تابوت میں بند کر دیا گیا تھا اور گنزی کے اس ہا کس پر شہید کے تمنے سجادے گئے تھے۔ ان تمنوں کے ساتھ اس کی کیپ بھی پڑی تھی جو وردی کے اس تقدس کی غمازی کرتی ہے جس کی آن کے دفاع میں شہید نے اپنی جان دی تھی۔ وہ سال ہیرے لڑکپن کے تھے۔ اس دور کے واقعات ذہن پہ گہرا اثر کرتے ہیں۔ پھر یہ تاثر بڑا دیر پا ہوتا ہے، شاید عمر بھر کے لئے اسباق دے جاتا ہے۔ میں

دل چاہتا کہ کاش وہ وہو نو پروں کا سہارا مل جائے اور ہم ساتھیوں کا فاصلہ غلوں میں طے کر لیں۔ ہوم وزٹ کی یہ سہولت کبھی کبھار ملتی تھی۔ ایسا ہی ایک ناخوشگوار سفر میری یادوں میں جاگزیں اور ان مت نقوش چھوڑ گیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے میں اپنی کار میں محو سفر تھا کہ ایک چوکی پر پولیس نے میری گاڑی روک لی، وہاں اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

چوکی کا انچارج مجھے یوں گھورنے لگا جیسے میں کوئی جرائم پیشہ شخص تھا۔ میرا تصور کیا تھا، میں نہ جان سکا۔ مجھے گاڑی سے باہر آنے کا حکم دیا گیا، جو میں نے مان لیا۔ میری گاڑی کی تلاشی کے بہانے میرا سامان سڑک پر بکھرا دیا گیا بعد میں علم ہوا کہ میں صوبہ پنجاب کی حد میں داخل ہو رہا تھا اور میں نے دیگر افراد کی طرح جیب سے سو روپیہ نکال کر چوکی کے باسیوں کی منہ می گرم نہیں کی تھی۔ اس نے سیدھے سادے لفظوں میں فرمائش دہرائی بھی تھی۔ ناکردہ جرم کی یہ سزا ملی تو میں غصے میں لال پیلا ہو گیا۔

”تم کس سرحد کی بات کرتے ہو، ایک سرحد سے تو میں آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ اس کے بعد میں لگا تار بولنے لگا۔ ”سرحد تو وہ ہے، جہاں ماؤں کے تومند لعل ارض وطن اپنے لہو سے سینچ رہے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ تم جیسے حشرات الارض عوام الناس کی حلال کمائی جیبوں سے نکلوا کر ان کے لئے جہنم کا سامان پیدا کریں۔ خدا کا خوف کرو، تم تو مار میں جاؤ گے ہی، ان کو بھی مرگئی کے طور ساتھ لے جاؤ گے۔“

اگلے لمحے ”محافظ“ کی بھری، مگر جرم سے نتھری ہوئی آواز میری سچائی کے نسخے میں دب کر محیف ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے میرے دل و ذہن میں سچا ہوا ہیرہ چنچ مار کر رو پڑا ہو اور امن کا جوان لاش قبر میں ترپ گیا ہو۔ سفر کے دوران اس کی شہادت کا منظر میرے ذہن میں بار بار ت

اس شہید کا نام نہ جان سکا۔ جانتا تو بھی شاید نہ لکھتا کیونکہ وہ میرا ہیرو تھا، صرف ہیرو، جو اپنا نصب العین میرے اوق حیات میں بن گیا تھا۔ میں ایسے تمام جاں نثاروں کو سلام پیش کرتا ہوں جو اپنی جان انسان اور وطن پر قربان کر دیتے ہیں۔

کبھی زندگی میں محافظان وطن کا تصور ابھرا تو وہی شہید میرے ذہنی آفاق پر مسکرانے لگا، پھر جب سی خواہش ہو میں سرایت کرتی گئی کہ کاش اتمام وردی پہننے والے قربانی کے اسی سانچے میں داخل جائیں جسے اہل وطن بے ساختہ تکریم دے سکیں۔ پھر ایک روز قسمت نے مجھ کو بھی فوجی وردی زیب تن کرا دی مگر میں اپنے لڑکپن کے ساتھی ہیرو کو کبھی نہ بھول سکا بلکہ اس کو ان تمام شہیدوں کی جمعیت میں احترام دیتا رہا جو فوجی ادوار میں میری کتاب زیست پر اپنے نقوش چھوڑتے رہے۔

مجھے اپنا ہیرو زندگی میں کئی بار یاد آیا، ان وقتوں میں بھی جب میں اسے خیالوں سے دور رکھنا چاہتا تھا بلکہ شاید یادوں سے محو کر دینا چاہتا تھا تاکہ اسے شرمندگی کے اس لہادے میں نہ دیکھ سکوں جو معاشرے کی ہوس ناکوں نے گزرتے ادوار میں شعبہ ہائے زندگی کو پہتا ڈالا ہے کیونکہ مجھے اپنا ہیرو جب بھی کرب میں نظر آیا، بے حد ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔

ان دنوں کی بات ہے جب ہم ریگزاروں میں دفاع وطن کر رہے تھے۔ مشکل دور تھا گرمی اپنے زوروں پر تھی۔ صحرا میں قدرتی سائے ناپید تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ شمس کی حدت نے ہمارے رنگ و روپ کو جھلسا دیا تھا۔ تپتی دھوپ میں کبھی ریگ صحرا پر نکلنے تو اس طور دیکھتے کہ دشمن ہمارے گرد منڈلاتی صحرائی کھیاں بھی کھوج لیا کرتا تھا۔ ہمیں سوئے گئے فرائض اور ان کی بجائے وردی کے باعث اہلیان وطن جہن کی فیند سو سکتے تھے۔

کبھی چھٹی ملتی تو ہمیں گھر بے تماشا یاد آنے لگتا۔

سپاہی نے تقریباً چلا تے ہوئے کہا۔
"میں مجھے صبر سے روزانہ اتنے ہی ملتے ہیں۔"

نوجوان نے دوبارہ معصوم سا جواب دیا۔
"اوتے، کوئی پٹرول، ڈیزل کے پمپ نہیں ملتے؟
گاڑی ہے، راستے میں اچانک خراب بھی ہو سکتی ہے نا۔"
"میرے پاس اسے نا ایم کارڈ موجود رہتا ہے۔"
نوجوان نے معصوم رویہ برقرار رکھا۔

"کسی دوست وغیرہ کو بلاؤ، اس کے ہمراہ جاؤ اور
تم از کم پندرہ ہزار کے نوٹ ساتھ لے کر آنا۔" سپاہی
نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے وہ اپنی تحویل وصول کر رہا
تھا۔ "نشد آدر اشیاء کا گاڑی سے۔ آدھ ہوان بڑا کیس بن
سکتا ہے۔" اس نے نوجوان کو گھورتے ہوئے بات ختم
کی۔

تمام معاملہ دیکھ کر میرا جی کڑھنے لگا۔ مجھے نوجوان
پر بہت ترس آیا۔ میں نے اپنی گاڑی ایک طرف روکی اور
آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ سب کچھ کہہ دیا جو میں عموماً نہیں کہتا مگر
اس دم موقع کی مناسبت سے ضروری تھا۔ اس روز
میرے ذہن میں بسا سپاہی کا تصوراتی روپ ایک بار پھر
چمکا چور ہوا۔ میں دیر تک بے حد بے چین رہا۔ وہ کام بھی
نہ کر سکا جس کے لئے عازم سفر ہوا تھا۔

اب میں اس واقعے کی طرف چلتا ہوں جس کی وجہ
سے میں نے یہ تحریر مرتب کی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس غیر
متوقع حادثے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور اس میں مجھے
معاشرے کا گھناؤنا چہرہ عیاں نظر آیا۔

ڈرامے کا مرکزی کردار میرا انیس سالہ بیٹا شرجیل
تھا جو ایک بڑے شہر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں نے
اسے کالج کے قریب چھوٹا سافلیٹ کرائے پر دلا رکھا تھا۔
اس کے پاس اپنی چھوٹی سی گاڑی بھی تھی۔ عمارت میں
اس کے کالج کے چند دیگر طلباء بھی مقیم تھے۔

ایک منوں سہ پہر مجھے اجنبی نمبر سے ٹیلی فون کال

رہا۔

اس واقعے کو بہت سالی گزر گئے میرے عروج کا
سورج غروب ہو گیا اور ایک نئی نسل بن کر جوان ہو گئی مگر
ظالم اور محکوم کا رشتہ بہ درجہ، تم موجود رہا بلکہ شاید بڑھتا
گیا۔

میں اپنی گاڑی پر پنجاب کے ایک بڑے شہر میں
داخل ہو رہا تھا۔ ایک بڑا پل عبور کر کے موٹروے سے شہر
کی طرف اتر رہا تھا۔ سیدھا محافظ پولیس کے "مستعد"
ٹاکے میں گھر گیا۔ وہی منظر درپیش ہوا جسے میں ڈیڑھ گھنٹہ
خانوے میں حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ ایک طالب
علم ٹاکے کا شکار ہو رہا تھا۔ نوجوان مجھے اپنے بیٹے کی طرح
دکھائی دیا، جس کے گرد قانون کے محافظ بھیڑیوں کی طرح
جمع تھے۔

"مگر میں نے تو کوئی غلطی نہیں کی؟" نوجوان کے
چہرے پر پریشانی کا پسینہ جھلک رہا تھا۔

"تمہاری کار سے یہ پاؤڈر برآمد ہوا ہے۔" ایک
سپاہی نے اسے لفافہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "نشد کرتے
ہو؟" سپاہی کی آواز بلند ہو گئی۔ ڈانٹ کا لہجہ سن کر
حاضرین کا پتہ پانی ہو گیا۔

"مگر یہ لفافہ میرا تو نہیں، آپ کا ہے۔" نوجوان
نے بھولپن میں اصرار کیا۔

"کار ایک طرف لگاؤ، تلاشی ہوگی۔ تمہاری بھی اور
گاڑی کی بھی۔" ایک دوسرے ہماری بھر کم سپاہی نے اپنا
حکم صادر کیا اور پیٹ سنبھالنے کی سعی کرنے لگا۔

نوجوان نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔
پولیس کا ہماری بھر کم سپاہی نوجوان کی تلاشی پر مامور ہو
گیا۔ چند لمحوں بعد نوجوان کا پرس سپاہی کے ہاتھوں میں
نکل رہا تھا۔ چند دیگر حریص نگاہیں بھی پرس پر ٹپک رہی
تھیں۔

"اوتے، اس میں تو صرف پانچ سو روپے ہیں۔"

سلجھانے لگی۔ بے رہا سی کچھ اور باتیں معلوم ہوئیں۔
شرجیل پر بڑے خطرناک الزامات تھے۔ اس نے
شراب پلائی کرنے کی کوشش کی تھی اور اسی دوران دھریا
گیا تھا۔ بات سن کر میں چکرا سا گیا۔ شرجیل پڑھنے والا
لڑکا تھا۔ سمجھدار بھی ہو رہا تھا۔ ایسا گھٹیا کام کیسے کر سکتا
تھا؟ جبکہ اسے اخراجات کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ ہم اس کی
ضروریات پوری کر رہے تھے۔ انکار میرے ذہن میں
گردش کرنے لگے۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میرا بیٹا
حالات کا شکار ہو چکا تھا اور کسی گہری مصیبت میں پھنس
گیا تھا۔

پرانے شہر میں مجھے اپنے بوٹی کی مدد حاصل ہو گئی،
وہ پولیس کے سینئر افسران سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔
رات ڈھل رہی تھی، ہماری حالت غیر ہو چکی تھی۔
بھوک اور تھکن کا گمان یاں ویم کے جذبوں سے دب چکا
تھا۔ ہر دم بیٹے کی لڑکھائے جاری تھی۔ اس کی عافیت کی
دھائیں لیوں پر تھمنے میں نہ آتی تھیں۔
ٹونی نے بے حد مدد کی۔

”میرا تعلق انڈر ورلڈ سے ہے۔“ ٹونی نے اپنا
تعارف کرایا۔ ”مجھے دیکھ کر پولیس والوں کے بدن میں
خون کی حرکت حیر ہو جاتی ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں رات
حوالات میں بند تھا۔ وہیں شرجیل سے ملاقات ہوئی تھی۔
بے چارہ سدھنہ پریشان دکھتا تھا۔ بھوکا پیاسا تھا اور بُری
طرح رو رہا تھا۔“ ٹونی نے تفصیل بیان کی۔ ہماری طرف
دیکھا، گرد حالات کا جائزہ لیا پھر بات جاری رکھی۔ ”آج
میری ضمانت منظور ہوئی ہے۔ مجھے آپ کا ٹیلی فون نمبر
شرجیل نے دیا تھا۔ میں نے ازراہ ہمدردی آپ سے
رابطہ قائم کیا تھا۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ مجھے آپ
لوگوں کی چتا پر تاسف ہے۔“ اس نے کہا۔ اس دم وہ مجھے
رحمت کا فرشتہ دیکھنے لگا۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا تعلق کسی
مافیا سے تھا، میں نے اس پر بھروسہ کر لیا۔ اس کے علاوہ

موصول ہوئی کہ میرا بیٹا گزشتہ شام سے لاپتہ تھا۔ اس کی
گاڑی بھی عمارت میں موجود نہیں تھی۔ پیغام سن کر میرے
اوسان خطا ہو گئے اور پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔
”مجھے تفصیلات معلوم کر کے بتائیں۔“ میں نے
اجنبی کالر سے درخواست کی اور اپنے دل کی دسڑکن پر قابو
پانے کی کوشش کرنے لگا۔ میری بیگم بے حد پریشان ہو
گئی۔

”علم میں آیا ہے کہ آپ کے بیٹے کو پولیس نے کل
شام اٹھایا تھا اور اب کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا ہے۔“
ٹونی نے ذرا دیر بعد مجھے بتایا۔

یہ کنٹھن وقت ہمت کا تقاضا کرتا تھا۔ بیگم کی کیفیت
سے آگاہ تھا اس لئے اسے ہمراہ لیا، ڈرائیور کو گھر سے
بلایا، گاڑی نکالی اور بیٹے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس
نوع کے سفر بڑی مشکل سے کٹا کرتے ہیں۔

بیگم نے مجھے بتایا کہ شام بیٹے سے اس کی بات
ہوئی تھی۔ وہ اس وقت اپنے فلیٹ میں موجود تھا۔ کہہ رہا
تھا کہ وہ باہر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ بیگم اس سے اداس
ہو چکی تھی اسے ملنا چاہتی تھی۔ اس کے اصرار پر بیٹے نے
اگلے روز گھر آنے کی ہامی بھری۔

میرا ذہن اب کڑیاں ملا رہا تھا۔ میں وقت ضائع
نہیں کرنا چاہتا تھا، بہت سا کام باقی تھا۔ دوران سفر
میل فون سے استفادہ ممکن تھا۔ اسی واسطے سے چند دیگر
تفصیلات حاصل کر لیں۔

”ہم نے کھڑکی کے راستے دیکھا۔“ شرجیل کے
ہمسائے نے مجھے بتایا۔ ”کمرے میں اس کا لپ ٹاپ
آن ہے۔ غالباً انٹرنیٹ چل رہا ہے۔ اس کے دونوں کی
بورڈ بھی آن ہیں۔ کمرے کی تمام بتیاں روشن ہیں۔
اندازہ ہوتا ہے کہ اسے لٹھ بھر کے لئے کہیں باہر جانا پڑا ہو
گا۔“ مجھے بتایا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وحید کی بڑھ کر ابتدائی گتیاں

بھی جلت میں تھے۔ ان کے ہاتھ میں تھیلا سا تھا، جو قد سے بھاری دکھتا تھا۔ مغل صاحب سے قریبی رشتہ داران میں گاہے بگاہے ملاقات ہو جاتی تھی۔ دوستی قطعاً نہیں تھی، بس معمولی سی جان پہچان تھی۔ کہنے لگے کہ مجھے بھی ہمراہ لے جاؤ۔ اگلے چوک پر کچھ کام ہے، ضروری جانا ہے، سواری نہیں مل رہی۔ میں نے ہادل درخواست انہیں ساتھ بٹھالیا۔

اے ٹی ایم سہولت زیادہ دور نہیں تھی۔ مغل صاحب میری کار سے اترے تو فوراً قریب کھڑی دوسری گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ میں بینک کی سمت چلا گیا۔ پیسے نکلا کر لوٹا تو لوارح میں افراتفری مچی نظر آئی۔ مغل صاحب پولیس کے زونے میں تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر اچھٹا سا ہوا۔ پولیس نے چھاپا کالی کروڑا کار پر مارا تھا۔ چند ہاتھوں میں چمکتی بوتلیں دیکھ کر میں اور بھی حیران ہوا۔ معاملہ سمجھ سے ہالانگا۔

ایک ایک کالی گاڑی سے ایک نوجوان اترتا اس نے پرس میں سے ڈھیر ساری رقم نکالی اور پولیس کے حوالے کر دی۔ پھر بوتلوں سمیت کار دوڑاتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔ مغل صاحب کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔ اس دوران میں اپنی کار کے قریب لوٹ چکا تھا۔ نظر آتا منظر پر اپنا معاملہ سمجھ کر میں اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اگلے لمحے پولیس میری کار پر بھی حملہ آور ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میری کینٹی پر ہسپتال تھا اور میں گاڑی انجانہ راہوں پر چلا رہا تھا۔ سفر کتنی دیر جاری رہا، میں نہیں جانتا۔ اسی دم سے طویل مذاہب میرے اوپر جاری ہے۔ معلوم ہوا کہ چند بوتل شراب شرجیل کی گاڑی پر لائی گئی تھی مگر اس پہلو اسے قطعی یقین نہیں تھا، نہ ہی اسے احساس ہوا کہ مغل مہربان اسے ہاتھ دکھا چکے تھے۔

اگلے روز شرجیل کو ضمانت مل گئی۔ عدلیہ نے اس کی کہانی درست مان لی۔ پولیس سے سوال کیا گیا کہ آپ

شاید اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

رات کے اندھیرے میں سڑکوں پر ٹونی کی موٹر ہائیک دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ ہماری گاڑیاں اس کے عقب میں رواں دواں تھیں۔ اس تو اتر میں ہم نے کئی راہیں روند ڈالیں، کئی لمحوں کا عذاب جھیل ڈالا۔ مسافت تھی کہ ہر موٹر پر بڑھتی نظر آتی تھی۔ خدا خدا کر کے ہم آخر منزل شاس ہوئے۔ اونچتی سڑکوں نے آخر ہمارے درد کا درماں کر دیا۔

بے ہوشی عمارت پر رات کی پرچھائیاں پھیل چکی تھیں۔ ہم بو جھل قدموں کے ساتھ عمارت کے پچھلے دروازے میں داخل ہوئے۔ بجلی کے چند تھقے چھائی گہری ظلمت کے خلاف ہیرا زما نظر آتے تھے۔ میں چوکی انچارج کے دفتر کی جانب لپکا۔ ملحقہ چھوٹی سی حوالات میں میرا بیٹا سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ میرا دل اچھل کر گردن میں اٹک گیا۔ میں نے چوٹ کر بڑھتے قدم روک لئے۔ نیم تاریکی میں مجھے بیٹے کا سراپا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے قریب پا کر وہ رو پڑا۔

”ابو، میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ کوئی غلط کام نہیں کیا۔“ رندھی ہوئی تھکی مامی صدا شب کے سکوت میں ابھری اور دیواروں سے ٹکرا کر میرا دل پاش پاش کر گئی۔ بیٹے کو اس طرح اس مقام پر دیکھا تو میں روح تک کاہنے لگا۔

شرجیل نے داستان الم مجھے سنائی جو خوفناک تھی۔ تجویز کریں تو کچھ اس طرح بھائی دیتی تھی۔

”امی نے مجھے گھر آنے کو کہا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس نقد پیسے کم ہیں۔ شام گہری ہو چکی تھی، سوچا کہ قریبی اے ٹی ایم مشین سے تین ہزار روپیہ نکالوا لیتا ہوں تاکہ سفر کے دوران مشکل پیش نہ آئے۔ اندازہ تھا کہ دس منٹ میں واپس لوٹ آؤں گا۔ گاڑی پارکنگ سے نکال رہا تھا کہ مغل صاحب نظر آ گئے۔ میری طرح وہ

اسے مٹھاؤ، کھاؤ۔

دو سپاہیوں نے میری نیچم کا تھیراؤ کر لیا۔ ہم نے آپ کے شہزادے کو جھڑکی لٹک کر لٹکائی۔ وہ بھڑک کر ہم سے اٹھ کھڑیاں پہنا دیتے تو اس کا پسینا خراب ہوتا اور ہاں، ہم نے اسے حوالت میں مارا بھی نہیں۔ وہ بیک زمان ہو کر پڑے۔

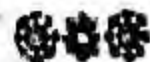
نیچم نے انہیں بساط سے باز کر دیا۔

اب گاڑی واپس بنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ ایک سپاہی ہاتھ میں وہیل پاتا اٹھائے دارو ہوا، بولا "صاحب! پولیس کے پاس آئی ہوئی گاڑی بھی سالم نہیں ملتی۔ لوگ کھوکھا مارتے ہوئے واپس بے جاتے ہیں۔ ہم نے آپ کی گاڑی چلائی ضرور ہے مگر صحیح سالم واپس کر رہے ہیں۔" میں نے اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھا اور کچھ پیسے دے دیے۔

چوکی انچارج اے ایس آئی جوان اصرار تھا۔ تعاون پر آمادہ نظر آیا، اس نے کسی بھی فرمائش سے اجتناب برتا بلکہ میرے بیٹے کو نصائح کرتا رہا اور احتراماً ہمیں گیٹ پر آ کر خدا حافظ کہا۔

ہم واپس کا سفر شروع کرنے والے تھے کہ چوکی کا سب انچارج سرعت سے روال دوبارہ ہمارے پاس چلا آیا۔ اس نے ہمیں شرجیل کا پرس واپس کیا۔ پرس میں تمام کارڈ موجود تھے، درست حالت میں۔ نقدی البتہ ہرن ہو چکی تھی۔ اس نے ہمیں شرجیل کا سیل فون بھی واپس کیا مگر اس دم میرا ڈائی پرس پیسوں سے خالی ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا قیمتی پرس اسے دے دیا۔

پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی میرا ایمان ہے کہ اگر ہمارے معاشرے کو ایماندار پولیس مل جاتی تو کم از کم نصف معاشرتی برائیاں ختم ہو چکی ہوتیں۔



بڑے ٹکر چھوٹوں پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے؟ مغل حضرت نے اعتراف جرم کر لیا۔ شرجیل کی رہائی پر پولیس چوکی میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب میں محافظان وطن کے بارے میں اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔

بیٹے کی جان خلاصی ہوئی تو سب سے پہلے میرے پاس ایک کبڑا سا پولیس من آیا جسے کبڑا عاشق کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کا احسان کچھ اس طرح تھا۔

"مرا میں نے حوالت میں بند شہزادے کو رات تین مرتبہ پیشاب کروایا ہے، جب بھی اس نے کہا۔ میں اسے ٹائلٹ نے گیا۔ سوچیں، اگر میں یہ نہ کرتا تو آپ کے سا جبرائیل کا کیا حشر ہو سکتا تھا؟"

مجھے اس کی بات معقول لگی یا نامعقول، میں نے سخاوت کے لئے پیسے اسے دے دیے۔ اس نے مجھے سیوٹ کیا اور دعا میں دیتا ہوا چلا گیا۔ چند تاکیدیں بھی کیں۔

"ابو! آپ جو ڈھیر سا کھانا رات میرے لئے چھوڑ گئے تھے، وہ اسی شخص نے کھایا تھا۔ اس دوران مجھے یہی کہتا رہا کہ میں کھانا چیک کر رہا ہوں کہ کہیں زہریلا تو نہیں۔ ابو یہ تین بڑی بوتلیں مشروب کی بھی ایک ہی سائس میں پی گیا تھا۔" شرجیل نے مجھے بتایا، میں قطعاً حیران نہ ہوا۔

تھوڑی دیر بعد چوکی کا سب انچارج میرے قریب آیا کہنے لگا۔ "آپ جانتے ہی ہوں گے کہ بچے کو رہائی ہمارے بنائے ہوئے کاغذات کی بدولت ملی ہے۔ کاغذ بنانے والے کا ہزار روپیہ "مقرر" ہے۔ اگر آپ نے وہ نہ دیا تو اس غریب کا دل خراب ہوگا۔ آگے آپ کی مرضی۔ ہم آپ سے رشوت نہیں مانگ سکتے۔" اس نے کہا اور پھسلی ملی بن گیا۔

میں نے رقم ادا کر دی۔ "اور میری مٹھائی؟" اب بلا کی بے شرمی اس کے چہرے پر ناز رہی تھی۔ میں نے

دینی و تاریخی مغالطے اور ان کی حقیقت

ہمارے معاشرے میں ایسی بہت سی باتیں اور تصورات رائج ہو چکے ہیں جو کہ سرے سے غلط ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بعض غیر معتبر کتب میں درج ہیں اور غیر محققین علماء و احنفین اور اساتذہ انہیں بغیر سوچے سمجھے بیان کر دیتے ہیں۔

☆ مجاہد ادیب شیخ

ذیل میں ہم کچھ ایسی مشہور باتیں اور ان کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

مشہور ہے کہ ”سیدنا عبداللہ بن جحش“ جو اپنی بیوی ام حبیبہ بنت ابوسفیان کے ہمراہ رسول اللہ کے علم سے حبشہ ہجرت کر گئے تھے وہاں جا کر عیسائی ہو گئے اور اسی حال میں مر گئے تو نجاشی نے ان کی بیوہ کا نکاح رسول کریم سے کرادیا۔ اس سلسلے میں مختلف دینی کتب میں جتنی بھی روایات پائی جاتی ہیں ان میں واللہ جیسا ناقابل اعتبار راوی موجود ہے جو کہ علماء محدثین و محققین کے نزدیک جھوٹا، روایتیں گھڑنے والا، احادیث میں ہیر پھیر کرنے والا اور متروک الحدیث تھا (تاریخ کبیر 1: 178، تاریخ اوسط 2: 220، تاریخ صغیر 2: 283، بخاری ترجمہ 3: 334، المعجم والحر وکین، نسائی ترجمہ: 334، العلل و معرفۃ الرجال 3: 264 فقرہ 5166، الجرح و تعدیل 8: 21، سیر الاعلام النبلاء 9: 462، 463، 469، سیرت النبی 1: 27) حافظ ذہبی نے اس کہانی کو مکر کہا ہے (سیر الاعلام النبلاء 2: 221) بعض مؤرخین نے اس روایت کو عروہ بن زہیر کی سند سے بیان کیا ہے جن کی پیدائش سیدنا عمر فاروق کے دور کے اوائل میں ہوئی تقریباً 23 ہجری کے لگ بھگ وہ

اس سے آگے اوپر کا سلسلہ بیان نہیں کرتے اس لئے یہ روایت منقطع ہے اس لئے ناقابل اعتبار ہے۔ لہذا ایک کذاب راوی اور منقطع روایات کی بنیاد پر کسی صحابی کو مرتد قرار نہیں دیا جاسکتا چاہے اسے کسی نے بھی نقل کیا ہو اس سلسلے میں ایک صحیح روایت موجود ہے جسے محدثین نے امام ابن مبارک، از معمر، از زہری، از عروہ، از سیدہ ام حبیبہؓ سند سے نقل کیا جو حدیث کے معیارات کے مطابق کھری ہے کہ ”سیدہ ام حبیبہؓ سیدنا عبداللہ بن جحش کی ملکوتہ تھیں جو نجاشی کے ملک میں وفات پا گئے اور سیدہ حبشہؓ میں ہی تھیں کہ ان کا نکاح نجاشی نے رسول اللہ سے کر دیا ان کا مہر چار ہزار درہم نجاشی نے ہی ادا کیا پھر انہیں شرجیل بن حسنہؓ کی امرائی میں مدینہ منورہ بھیج دیا۔“ (سنن ابی داؤد احادیث 2086، 21076، 2108۔ سنن نسائی حدیث 3350۔ دلائل النبوة۔ بیہقی 2: 460) اس صحیح حدیث میں ان کے وفات پا جانے کا ذکر تو موجود ہے مگر ان کے عیسائی ہونے کا کوئی ذکر نہیں یقیناً یہ افسانہ دشمنان اسلام کا گھڑا ہوا ہے اس لئے اس پر یقین کرتے اور بیان کرتے ہوئے مذکورہ حقائق کو مد نظر رکھنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ اس کی زد کہاں پڑتی ہے؟ کیا ہمارے نبیؐ کی تربیت معاذ اللہ اتنی ہی ناقص تھی کہ پہلی ہجرت حبشہ کی

سعادت حاصل کرنے والے جلیل القدر صحابی ہی مرتد ہو گئے۔

مشہور ہے کہ غزوہ احد میں نبی کریمؐ نے جن تیر اندازوں کو پہاڑی درے پر مقرر کر کے وہاں سے کسی حال میں نہ ہٹنے کا حکم دیا تھا اکثر مال غنیمت اکٹھا کرنے کے لالچ میں درے سے اتر آئے اور ان کے اس عمل کا لشکر اسلام کو ناقابل حلائی نقصان ہوا۔ اس میں ایک درست واقعے کو غلط انداز دیا گیا ہے ہوا یوں کہ جب جنگ شروع ہوئی تو جلد ہی مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہو گیا اور کفار گاجر مولیٰ کی طرح کٹنے لگے تو وہ میدان جنگ سے بھاگنے لگے اور پہاڑی لشکر اسلام کی پشت پر تھا جس میں موجود درے پر نبی کریمؐ نے عبداللہ بن جبیرؓ کی قیادت میں پچاس تیر اندازوں کو مقرر کیا تھا تا کہ دشمن پشت سے حملہ نہ کر سکے۔ دشمن نے اس کی کوشش بھی کی مگر تیر اندازوں کی وجہ سے ناکام ہو گئے حتیٰ کہ کفار کو شکست ہو گئی تو کچھ مسلمان ان کے تعاقب میں نکل گئے اور باقی مال غنیمت اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے اس وقت درے پر متعین اکثر تیر اندازوں نے سمجھا کہ جنگ ختم ہو گئی ہے لہذا انہوں نے بھی جوش و خروش میں مال غنیمت اکٹھا کرنے کا سوچا لیکن جب وہ درہ چھوڑنے لگے تو عبداللہ بن جبیرؓ نے ان کو روکا مگر دس کے سوا باقی اتنے جوش و خروش میں تھے کہ وہ نہ روکے اور مال غنیمت اکٹھا کرنے کے لئے درے سے اتر آئے۔

یہ دیکھ کر کفار کے واپس جاتے ہوئے لشکر میں خالد بن ولیدؓ (جو کہ نہایت بہادر جنگجو تھے اور ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے) نے ساتھیوں کے ہمراہ درے کی جانب سے لشکر اسلام پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے تیر انداز ساتھی سب سے پہلے شہید ہوئے اور پھر انہوں نے نبی کریمؐ پر حملہ کر دیا تو کئی جلیل القدر صحابہ ان کے سامنے ڈھال بن کر شہید ہو گئے۔ خود نبی کریمؐ بھی

زخمی ہو گئے۔ جب کفار کے تعاقب میں جانے والے اور مال غنیمت اکٹھا کرنے والے مجاہدین کو اس حملے کا علم ہوا تو وہ پلٹے اور کفار کو بھاگایا لیکن جب تک لشکر اسلام کا ناقابل حلائی نقصان ہو چکا تھا۔ یہ سب واقعی تیر اندازوں کی غلطی سے ہوا لیکن اس کی وجہ مال کی ہوس ہرگز نہ تھی بلکہ یہ غلط فہمی تھی کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور دوسری وجہ مال غنیمت اکٹھا کرنے کا جوش و خروش تھا اس میں بھی لالچ کا کوئی عنصر نہیں کیونکہ اسلام میں مال غنیمت جمع کرنے والے کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا تھا اور مسلمان اسے لوٹتے نہیں بلکہ اکٹھا کرتے تھے اور اکٹھا کر کے امیر لشکر کے حوالے کر دیتے تھے جو کل مال غنیمت کا پانچواں حصہ الگ کر کے اسلامی حکومت کی بیت المال کے لئے دارالحکومت روانہ کر دیتے جسے امور مملکت اور قلاح عامہ پر خرچ کیا جاتا۔ باقی چار حصے مجاہدین میں ان کی کارکردگی اور ذمہ داری کو مد نظر رکھ کر تقسیم کر دیے جاتے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ مال غنیمت اکٹھا کرنے میں ہوس کا قطعاً کوئی دخل نہیں تھا کیونکہ صحابہ مال غنیمت کے لئے نہیں بلکہ اللہ و رسولؐ کی خوشنودی کے لئے لڑتے تھے۔ اس معاملے میں مال غنیمت اکٹھا کرنے میں صحابہ کا جوش و جذبہ ظاہر ہوتا ہے جو کفار پر فتح کے باعث سامنے آیا اور وہ اطاعت امیر کے تقاضے فراموش کر بیٹھے غلطی تو ان سے ہوئی کہ وہ فرشتے تھے نہ نبی کی طرح معصوم وہ اپنی غلطی پر نادم ہوئے تو نبی کریمؐ نے ان کی خطا معاف کر دی اور مال غنیمت سے حصہ بھی دیا اور ان میں اولین مجاہدین و انصار اور بدری صحابہ بھی شامل تھے جن کو جنگ بدر میں حصہ لینے کی وجہ سے خوش خبری دی گئی تھی کہ آج کے بعد اگر وہ گناہ بھی کریں گے تو لکھا نہ جائے گا ایسی ہستیوں کے لئے مال غنیمت کے لالچ، ہوس یا لوث کے الفاظ کا استعمال بہت بڑی گستاخی ہے۔

مشہور ہے کہ عزیز مصر کی وفات کے بعد اللہ نے

مشہور ہے کہ جس مکان میں آیت الکرسی پڑھی جاتی ہے شیطین میں دن تک کے لئے اس مکان سے بھاگ جاتے ہیں اور چالیس راتوں تک چادو نہیں ہو سکتا اور آیت الکرسی شفاعت کرے گی۔ جو آدمی جمعہ کے دن سورۃ آل عمران پڑھتا ہے تو اللہ اور اس کے فرشتے غروب آفتاب تک اس پر رحمتیں بھیجتے رہتے ہیں اور جو آدمی ہر رات سورۃ واقعہ پڑھتا ہے اسے بھی فاقہ لاحق نہیں ہوتا نہ اسے قائلین میں لکھا جاتا ہے اور جو آدمی دو سو سورۃ اخلاص پڑھتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ ڈیڑھ ہزار نیکیاں عطا کرتے ہیں اور جو آدمی قرآن پڑھتا ہے تو اسے دوسو دینار ملیں گے اگر دنیا میں نہ ملے تو آخرت میں ضرور ملیں گے اور جو آدمی جمعہ کے دن نماز عصر کے بعد 80 مرتبہ ایک مخصوص درود پڑھے گا اس کے اسی سال کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور 80 سال کی عبادت کا ثواب اس کے لئے لکھا جائے گا۔ محققین کے نزدیک یہ

زیلخا کو پھر سے جہان اور پاکرہ کر دیا اور اس کا نکاح یوسف علیہ السلام سے ہوا۔ محققین کے مطابق یہ قصہ گو لوگوں کی باتیں ہیں ان کی کوئی بنیاد نہیں اور محدثین کے نزدیک یہ قطعاً قابل اعتبار نہیں (روح المعانی صفحہ 5 جلد 3)۔

مشہور ہے کہ زمین پر دو نبی زندہ ہیں۔ حضرت اور الہاس جن میں سے الہاس جنگلوں پیا بانوں میں اور حضرت پانیوں پر بھولے بھگلوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ بعض اسرائیلی روایات میں اس کا ذکر ہے جو بعض مفسرین نے بھی درج کر دی ہیں لیکن علماء محققین کے مطابق حیات الہاس میں کوئی حقیقت نہیں (روح المعانی صفحہ 139 جلد 23) اور حضرت تو پیغمبر نہیں بلکہ فرشتے تھے جو اللہ کے حکم سے موسیٰ کو کچھ باتوں کی تعلیم دینے آئے تھے اور اس کے بعد وہ واپس آسمان پر چلے گئے۔ اب وہ زمین پر کہیں موجود نہیں (تفہیم القرآن)۔

ISO 9001:2008

النور فین

رجسٹرڈ

النور لیکچرک انڈسٹریز B-75، شمال انڈسٹریز اسٹیٹ، جی ٹی روڈ گجرات

053-3530447 , 0300-9702203 , 0345-6333393

<http://www.alnoorfans.com>

ساتھ لے کر وہاں پہنچے اور ان کو سمجھایا کہ امیر ایک ہی ہو سکتا ہے ورنہ اختلاف پیدا ہو جائے گا اور امیر رسول اللہ کے حکم کے مطابق قریش (مہاجرین) میں سے ہو گا اور قریش میں امارت کے سب سے بڑھ کر اہل صدیق اکبر ہیں جو کہ نبی اکرم کے بارگاہ علم و عمل اور حیثیت میں ممتاز، افضل الصحابہ نبی کریم کے سر اسلام کے لئے سب سے بڑھ کر قربانیاں دینے والے مدبر اور مختلم ہیں اور پھر نبی کریم اپنی حیات طیبہ کے آخری دنوں میں انہیں اپنے مصلے پر کھڑا کر کے اور خود ان کے پیچھے نماز ادا کر کے ہمیں اشارہ دے گئے ہیں کہ ان کے خلیفہ اور ہمارے آئندہ امیر وہی ہوں گے۔

یہ کہہ کر انہوں نے سیدنا صدیق اکبر کی بیعت کر لی دیگر صحابہ کو بھی شرع صدر ہو گیا اور انہوں نے برضا و رغبت فوراً آگے بڑھ کر بیعت کر لی یہ خاص صحابہ کی بیعت تھیں عام بیعت کا سلسلہ اس کے بعد بھی کئی دن جاری رہا۔ اگر کسی نے بیعت نہیں بھی کی تو اس نے خاموشی اختیار کر لی اجماع صحابہ کا احترام کیا اور اختلاف پیدا نہیں کیا۔ حالات نے ثابت کیا کہ ان کا انتخاب نہایت درست اور بر محل تھا۔

انہوں نے اپنے مختصر دور میں کئی خطرناک فتنوں کی سرکوبی کی اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے مسلمانوں کو دین پر ثابت قدم رکھنے کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ پہلا مسئلہ تو وفات نبوی پر ہی پیدا ہو گیا تھا جب سیدنا عمر فاروق یہ خبر سن کر فرط غم سے ہوش کھو بیٹھے اور ننگی تلوار لے کر گھر سے نکل آئے کہ جس نے کہا نبی کریم فوت ہو گئے ہیں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ صدیق اکبر گوان کی اس کیفیت کا علم ہوا تو انہوں نے آکر مسجد نبوی میں ننگی تلوار لے کر گھومتے سیدنا عمر فاروق کو سختی سے نیچے بٹھا کر یہ مختصر سا خطبہ دے کر حقیقت حال واضح کی کہ لوگو! تم میں سے جو کوئی محمد کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ محمد فوت ہو گئے اور جو اللہ کی

تمام اور ایسی سب روایات من گھڑت ہیں سلسلہ الاحادیث الضعیفہ صفحہ 412 جلد 2، صفحہ 305 جلد 1، صفحہ 314 جلد 1، صفحہ 101 جلد 2، صفحہ 138 جلد 2۔ اور یہ روایت بھی موضوع ہے کہ جب کسی قوم کا بچہ سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے سنتے ہی چالیس سال تک اس قوم سے عذاب اٹھا لیتے ہیں (الاسرار المہلیات والمفوضات صفحہ 144) دراصل کچھ لوگوں نے عوام کو قرآن کی طرف مائل کرنے کے لئے اس قسم کی روایات گھڑیں (الاتقان صفحہ 341 جلد 2) اور ان میں سے کچھ مقصد عوام کو قرآن کی تفہیم سے ہٹا کر محض پڑھنے پر لگا کر دراصل قرآن سے دور کرنا تھا (غذابی داستانیں از علامہ حبیب الرحمن کاندھلوی، تفسیری افسانے از عبدالرؤف میاں لوی، انبیائے عظام اور صحابہ کرام پر اعتراضات کا علمی جائزہ از ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف)۔

مشہور ہے کہ نبی کریم کی وفات کے بعد صحابہ میں خلافت کے لئے اختلاف پیدا ہو گیا اور بعد میں صحابہ کے درمیان اقتدار کے لئے جنگیں بھی ہوئیں۔ تو اتنی بات تو درست ہے کہ وفات نبی کے بعد صحابہ میں وقتی اختلاف رائے تو ہوا اور بہت بعد میں ان میں جنگیں بھی ہوئیں مگر ان کی وجہ اقتدار نہیں بلکہ کچھ اور تھی۔ دراصل ہوا یہ کہ نبی اکرم کی وفات کے بعد صحابہ نے فوری طور پر امیر مقرر کرنا چاہا کیونکہ نبی کریم کا یہ حکم ان کے پیش نظر تھا کہ جماعت کو ایک لمحے کے لئے بھی بغیر امیر کے چھوڑا نہیں جاسکتا کیونکہ جمہیر و مخمین تدفین وغیرہ بھی امیر ہی کی ذمہ داری تھی لہذا نبی ساعدہ کے محلے میں مہاجرین و انصار کی ایک جماعت اس مقصد کے لئے اکٹھی ہوئی جس میں یہ تجویز سامنے آئی کہ مہاجرین و انصار دونوں میں سے ایک ایک امیر مقرر کر لیا جائے تاکہ دونوں جماعتیں مطمئن رہیں۔ جب یہ خبر سیدنا عمر فاروق کو ملی تو وہ سیدنا صدیق اکبر کو

کے باعث پسند کیا۔ چند ایک صحابہؓ نے ان کی طبیعت کی سختی کی وجہ سے تحفظات ظاہر کئے تو سیدنا صدیق اکبرؓ نے فرمایا۔ لوگو! میں تم میں سے سب سے بہتر آدمی کو منتخب کر رہا ہوں، ان کی سختی کی وجہ میری نرم مزاجی تھی۔ جب خلافت کی ذمہ داری کا بوجھ ان پر پڑے گا تو وہ مسلمانوں کے معاملات میں نرم ہو جائیں گے۔ اور یہی ہوا آج تک تاریخ ان کے طرز حکمرانی، انتظام اور اداروں کی تشکیل کی مثال پیش نہیں کر سکی، نہ کر سکے گی۔ ان کے دور میں بڑی بڑی اسلام دشمن سپر طاقتیں روم، ایران اور مصر سرنگوں ہو گئیں اور ان کے دور میں کوئی فتنہ سر نہیں اٹھا سکا تو ان فتوحات کا بدلہ لینے اور آئندہ فتوحات سے روکنے کے لئے یہودی، مجوسی اور عیسائی راہنماؤں نے سازش کر کے نماز فجر میں ان پر قاتلانہ حملہ کرا دیا۔ شہادت سے قبل سیدنا عمر فاروقؓ نے جو جلیل القدر صحابہ کی کئی بنیادی کہ اپنے میں سے ایک لرد کو خلیفہ منتخب کر لینا جنہوں نے باہم مشورے اور عام مسلمانوں کی رائے سے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کر لیا جس پر کسی کو بھی اعتراض نہ تھا۔ (صحیح مسلم باب اختلاف، الرضی الختم)

سیدنا عثمان غنی عمر فاروقؓ کے برعکس نرم طبیعت کے مالک تھے اور سزا کی بجائے معافی اور درگزر کو پسند کرتے تھے اور ان کی اس نرمی کا فائدہ دشمنان اسلام نے اٹھایا جو مفتوح ہونے کے بعد بدلے کی آگ میں جل رہے تھے اور منافقانہ طور پر مسلمان ہو کر سازشوں کے ذریعے اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ مسلمانوں کی قوت و شوکت کا راز ان کے اتحاد و ایمان میں ہی مضمر تھا اور عمر فاروقؓ کی شہادت کے باوجود دشمنوں کی توقع کے مطابق مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ رکا نہ تھا اور اسلامی سلطنت روز بروز وسیع ہو رہی تھی اور کفر کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ لہذا عثمان غنیؓ کے

عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ اللہ زندہ ہے۔ پھر انہوں نے سورۃ آل عمران کی آیت 144 کی تلاوت کی کہ ”محمد تو ایک پیغمبر ہیں وہ اگر فوت ہو جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم دین سے اٹلے پاؤں لوٹ جاؤ گے۔“

یہ سن کر تمام صحابہ اور عمر فاروقؓ اس کیفیت سے کلل آئے اور ان کے ذہن نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ انسانی فطرت میں یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنے پیاروں کی موت کو تسلیم نہیں کرتی جب ہستی اتنی عظیم ہو اور اس سے محبت بھی بے انتہا ہو تو یہ کمزوری خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے حسن تدبیر کا ہی نتیجہ تھا کہ اس مسئلے کو پیدا ہوتے ہی ختم کر دیا پھر لشکر اسامہؓ کو روانہ کرنے کا فیصلہ جس کا حکم نبی کریمؐ نے آخری دنوں میں دیا تھا حالانکہ وفات نبویؐ کے سامنے اور اسامہؓ کی کم عمری کے باعث عمر فاروقؓ جیسے جرأت مند صحابی بھی اس لشکر کی نوری رواگی کے حق میں نہ تھے لیکن صدیق اکبرؓ نے لشکر روانہ کیا اور لشکر فتح یاب ہوا پھر انھیں زکوٰۃ سے جگہ کا دلیرانہ فیصلہ حالانکہ عام صحابی بھی اس کے حق میں نہ تھے کہ لوگ اتنی سختی سے اسلام سے متنفر نہ ہو جائیں لیکن صدیق اکبرؓ نے اسلام کے ایک بنیادی رکن اور حکم کو معطل کرنے کی بجائے اس کے ہانیوں کی سرکوبی کو ضروری سمجھا تا کہ آئندہ کوئی اسلام کے بنیادی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے پھر نبوت کے مجملے دعوے داروں سے جگہ میں بھی انہوں نے کوئی کمزوری نہ دکھائی حالانکہ یہ تمام نئے بیک وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور ریاست کی صورت حال نبی کریمؐ کے بعد بے حد نازک تھی۔ پھر ان کی درویشانہ زندگی انہوں نے ہر لحاظ سے خود کو اس انتخاب کا اہل ثابت کیا۔

پھر جب وہ مرضی وفات میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے سیدنا عمرؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کا فیصلہ کیا جسے عام صحابہؓ نے تو ان کی جرأت مندی، بہادری اور قائدانہ صلاحیتوں

تھے کیونکہ اکثر صحابہ بیعت رضوان میں شہادت عثمان کے بدلے کی بیعت کر چکے تھے چونکہ اس وقت عثمان شہید نہ ہوئے تھے اس لئے انہوں نے سمجھا کہ وہ بیعت اس وقت کے لئے تھی لیکن قاتلان عثمان رکاوٹ بنے ہوئے تھے لہذا مسلمانوں کے درمیان جمل اور صلین کی جنگیں ہوئیں اور بے شمار مسلمان شہید ہوئے لیکن یہ جنگیں قصاص عثمان کے لئے ہوئیں نہ کہ حکومت کے لئے جیسا کہ عموماً مخالفہ دیا جاتا ہے جنگوں کے باوجود قصاص کا مسئلہ حل نہ ہوا اور مسلمان دشمنوں کی خواہش کے مطابق دو گروہوں (شیعہ اور سنی) میں تقسیم ہو گئے۔ (تاریخ طبری، تاریخ ابن خلدون، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، الریحی الختم) یہ جنگیں انہی منافقین نے بھڑکانیں مسلمان تو صلح کرنا چاہتے تھے مگر رات ہوتے ہی منافقین دو گروہ ہو کر دونوں لشکروں میں گھس کر تیر اندازی، آتش زنی اور قتل و قمار شروع کر کے جنگ کی آگ دوبارہ بھڑکا دیتے تھے تاکہ وہ پکڑ نہ جائیں اور مسلمان لڑکر کمزور ہو جائیں اور ان کی فتوحات رک جائیں اور ان کا بدلہ پورا ہو جائے۔ یہ یقیناً مسلمانوں کا مخالف گروہ ہی تھا اور مسلمانوں میں ہی شامل تھا۔ اسی گروہ نے سیدنا عثمان بن یاسر کو بھی شہید کیا۔ سیدنا علیؓ جنگ کے باوجود سیدنا امیر معاویہؓ کے گروہ کو مسلمان ہی سمجھتے تھے اس کا ثبوت جنگ بندی کے بعد بھیجے جانے والے کشتی مراسلے کی یہ عبارت ہے۔

”اور ہمارے معاملے کی ابتدا ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا خدا ایک ہی ایک دعوت اسلام ایک اللہ پر ایمان رکھنے میں اور اس کے رسولؐ کی تصدیق کرنے میں نہ ہم ان سے زیادہ ندوہ ہم سے زیادہ بس صرف خون عثمان کے معاملے میں ہم میں اور ان میں اختلاف ہوا حالانکہ ہم اس سے بری تھے“ (بخاری، جلد 1 صفحہ 159)

خلاف ایک خفیہ محاذ بنایا گیا جس نے ہر وہ سگڑا ہم کے ذریعے سیدنا عثمانؓ کی اعمال اور حکومتی ذمہ داریوں پر الزام تراشیاں کیں۔ جب یہ بات سید عثمانؓ تک پہنچی تو انہوں نے تحقیقات کرائیں لیکن حقیقت کچھ بھی نہ نکل۔

اپنا منصوبہ ناکام ہوتے دیکھ ان باغی منافقین نے عین اس وقت سیدنا عثمانؓ کی گھر کا محاصرہ کر لیا جب زیادہ تر مسلمان حج کو گئے ہوئے تھے۔ مدینہ میں جو صحابہ اور فوج موجود تھی انہوں نے عثمانؓ سے ان کے خلاف کارروائی کی اجازت طلب کی تو انہوں نے اپنی ذات کے لئے خون بہانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ باغیوں کا مطالبہ تھا کہ سیدنا عثمانؓ حکومت چھوڑ دیں لیکن عثمانؓ نے جمیع صحابہ کے اجماع سے سپرد کی گئی امانت کو چند باغی منافقین کے کہنے پر چھوڑنے سے انکار کر دیا کہ اس سے عظیم فتنے پیدا ہونے اور مسلم سلطنت کی تباہی کا شدید خطرہ تھا وہ ان کے اصلی عزائم کو بھانپ چکے تھے کیونکہ ان کی ڈوریں یہودیوں اور مجوسیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ لہذا ان کو چالیس روز محاصرے میں بھوکا پیاسا رکھ کر عین اس حال میں شہید کر دیا گیا جب وہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ پھر ان باغیوں نے مسلمانوں کے عتاب اور سزا سے بچنے کے لئے سیدنا علیؓ کو زبردستی خلیفہ بنا دیا اور بزدل شمشیر ان کے لئے بیعت لینا شروع کر دی۔

زیادہ تر صحابہ نے قاتلان عثمانؓ سے قصاص لینے سے قبل بیعت سے انکار کر دیا جو کہ عملاً سیدنا علیؓ کے لئے ممکن ہی نہ تھا کیونکہ وہی باغی اور قاتل تو اصل حکمران تھے، سیدنا علیؓ کو تو انہوں نے ایک طرح سے برہنہ کر دیا تھا۔ انہوں نے بیعت کر کے ہاتھ مضبوط کرنے کو کہا اور وقت مانگا تاکہ وہ قصاص لے سکیں یوں قصاص عثمانؓ کے معاملے پر مسلمانوں میں شدید اختلاف پیدا ہوا۔ سیدنا علیؓ سمیت تمام صحابہ قصاص عثمانؓ لینا واجب سمجھتے

ایسی خلاف حقیقت باتیں درج ہیں ان کی قرآن و حدیث کے سامنے کوئی حیثیت نہیں قرآن تو لاریب ہے جبکہ حدیث کی چھان پھانک بھی کی گئی ہے اور اس کی صحت کے لئے روایت، جرح و تعدیل اور اسما و الرجال جیسے علوم سے کام لیا جاتا ہے پھر بھی خلاف قرآن روایت کی تاویل قرآن کے مطابق کی جاتی ہے یا رد کیا جاتا ہے۔ تاریخ میں ایسی کوئی کسوٹی یا جانچ پرکھ نہیں پھر یہ بہت بعد میں لکھی گئیں ان کی بنیاد پر کسی مقدس ہستی کے خلاف الزام تراشی کو قطعاً تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تاریخ میں صحیح جھوٹ کس سے اس لئے اس پر کسی عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی گو ابن خلدون اور محمد قاسم فرشتہ نے تاریخی روایات کی تشخیص سائنسی بنیادوں پر کی ہے مگر ان کی کوشش کو بھی آغاز کہا جاسکتا ہے مکمل نہیں۔

انہی تاریخیوں کی بنیاد پر یہ مشہور ہے کہ سیدنا عثمان غنیؓ نے اپنے دور میں اقرباء پروری شروع کر دی تھی اور اپنے عزیزوں کو بڑے بڑے عہدے دے دیے حالانکہ وہ اپنے عزیزوں کی بددعا اپنے ذاتی مال سے کرتے تھے نہ کہ بیت المال سے اور یہ ان کا خلافت سے پہلے کا معمول تھا۔ اسی لئے تو غنی کہلائے تھے اور عزیزوں کو عہدے انہوں نے نہیں بلکہ زیادہ تر کو عمر فاروقؓ نے اہلیت کی بنیاد پر دیئے اور وہ ان کے خاندان سے ہرگز نہ تھے۔ تاریخ امیر معاویہؓ پر الزام لگاتی ہے کہ انہوں نے بیت المال کو ذاتی مال بنا لیا مگر کوئی مستند شہادت اس پر نہیں ملتی۔ دوسرا یہ الزام ان پر یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے موروثی خلافت کی بنیاد رکھی تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ باپ کے بعد بیٹے کی خلافت کا آغاز سیدنا علیؓ کے بعد سیدنا حسنؓ کی خلافت سے ہوا۔

(تاریخ اسلام احمد حریری)



یہ مراسلہ جنگ جمل و صفین کے بعد سیدنا علیؓ نے اپنی طرف سے تمام شہروں میں بھجوا یا تھا دونوں طرف کے مقتولین کو انہوں نے شہید کہا اور ان کا اکٹھا جنازہ پڑھایا۔ صحابہ کی پیش قدمی قصاص عثمانؓ کے لئے تھی مگر قاتلوں نے اپنے بچاؤ کے لئے مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا حالانکہ مسلمان آپس میں کوئی جنگ نہ کرنا چاہتے تھے اس لئے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق کچھ صحابہ اگر دونوں گروہوں میں شامل ہو کر جنگ میں شامل ہوئے تو کافی صحابہ غیر جاہلدار بھی رہے، بیعت کی جنگ میں نہ شامل ہوئے کیونکہ وہ ابھمن میں پڑ گئے کہ کس طرف جائیں کیونکہ دونوں طرف جلیل القدر صحابہ تھے اور ہمیں ان کے کارناموں اور قرآن و حدیث میں دی گئی ان کو جنت کی بشارتوں کے باعث ان سب کے بارے میں ٹیک گمان رکھنا چاہئے اور ان کے بارے میں بات کرنے سے پہلے اپنی اوقات کو ضرور دیکھ لینا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ ہم ان کے بغض میں اپنے اعمال ضائع کر بیٹھیں اور اللہ اور رسول کو ناراض کر بیٹھیں۔

مشہور ہے کہ سیدنا امیر معاویہؓ نے سیدنا حسنؓ اور سیدہ عائشہؓ کو شہید کرایا۔ یہ انتہائی خلاف حقیقت الزامات ہیں جن پر کوئی احمق اور عقل کا اندھا مانتی یقین کر سکتا ہے کیونکہ جب سیدنا حسنؓ خود ہی امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے تھے اور بخوشی ان کی بیعت کر لی تھی تو پھر انہیں ان کو قتل کرا کے اپنی ساکھ خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی اور سیدہ عائشہؓ تو جنگ جمل کے بعد سیاست سے مکمل طور پر کنارہ کش ہو چکی تھیں اور امیر معاویہؓ سے ان کی کسی قسم کی کوئی رہنمائی نہ تھی بلکہ سیدہؓ کو امیر معاویہؓ کے دور میں وہی مقام حاصل تھا جو خلفائے ثلاثہ کے دور میں تھا اور مستند روایات سے ثابت ہے کہ دونوں کی وفات قطعاً طبعی تھی نہ کہ حادثاتی۔

جہاں تک ایسی تاریخی روایات کا تعلق ہے جن میں

تھیرو گھنگھی نہیں مرتے

☆ -----farrukhshahbaz03@gmail.com ----- فرخ شہباز وڑائچ

روکنے کی کوشش کی۔ اس 15 سالہ بہادر بچے کا ٹک مچھ
کھلا مٹھوک نوجوان خودکش بمبار تھا، اس نے جب محسوس
کیا کہ یہ بہادر بچہ اس کے ناپاک عزائم کو کسی صورت
کا مہیا نہیں ہونے دے گا تو خودکش بمبار نے اپنے
آپ کو دھماکے سے اڑالیا۔ اس کے ساتھ ہی بہادر اعتراز
کے بی پر فٹے اڑ گئے۔ خودکش بمبار کا چارگٹ سکول اسمبلی
تھا جس میں ہزار کے لگ بھگ بچے شریک تھے۔ یہ بہادر
بچہ اپنی ماں کو رلا کر سینکڑوں ماؤں کو رلانے سے بچا گیا۔
چند روز سالہ اس بچے نے اپنی عمر سے بہت بڑا کام کر دکھایا،
شجاعت کی ایسی لازوال مثال قائم کی کہ رہتی دنیا اس پر
فخر کرے گی۔

عظیم معلم

25 مئی 2013ء کو گجرات کے گاؤں کوٹ لکھ
روڈ پر مچ جناح پرائیویٹ پبلک سکول منگووال کے 24
بچوں کو اور خاتون لیچر کو عراق نامی ڈرائیور دین پر سکول
لا رہا تھا کہ اچانک دین سے آگ اور دھواں اٹھنے لگا اور
اس کے ساتھ ہی دل دہلا دینے والی چیخوں سے فضاء
گو گھٹنے لگی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے آگ اتنی بھڑکی کہ
17 منٹوں میں کلیاں آگ میں جل گئیں۔ شعلے برساتی آگ
جب بچوں کو جلا کر مارا کہہ کر رہی تھی تو دین ڈرائیور نے اپنی
جان بچانے میں عافیت جانی جبکہ دوسری طرف خاتون

بہادر لڑکا

6 جنوری 2014ء کی صبح کا واقعہ ہے، خیر
پختونخواہ کے ضلع ہنگو میں گورنمنٹ ہائی سکول ابراہیم زئی
میں بچے معمول کے مطابق سکول جا رہے تھے۔ انہی
بچوں میں اعتراز حسن بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ علم
حاصل کرنے کی تمنا لیے سکول کی طرف رواں دواں
تھا۔ یہ علاقہ پسماندہ علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کسی
بڑے شہر کے سکول کی طرح یہ سکول بھی آسائش و
سہولیات سے لیس نہیں ہے۔ اس دوران اعتراز نے
ایک انجینی نوجوان کو دیکھا جس نے اسی کے سکول کی
یونیفارم پہن رکھی تھی، سکول جانے والے بچوں سے
قریب واقع سکول کا پتہ دریافت کر رہا تھا۔ اعتراز نے
اس انجینی نوجوان کو مخاطب کر کے کہا آپ تو ہمارے سکول
کے طالب علم نہیں، جس پر اس مٹھوک نوجوان نے جواب
دیا وہ اسی سکول کا طالب علم ہے۔

اب وہ مٹھوک نوجوان تیزی سے سکول کی طرف
بڑھنے لگا تھا، اعتراز کے دوستوں نے اسے خبردار کیا کہ
یہ خودکش بمبار بھی ہو سکتا ہے تم پیچھے ہٹو، لیکن اس نے
جواب دیا آپ لوگ پیچھے ہٹ جائیں میں اس کو قابو
کرنے کی کوشش کرتا ہوں ورنہ یہ سکول کے اندر جا کر
تباہی مچا دے گا۔ اعتراز نے آگے بڑھ کر اس نوجوان کو

2 جون 2014ء کو کراچی کے فنی سکول عثمان پبلک سکول کا ایک گروپ مطالعاتی دورے پر نارمان کاغان جا رہا تھا کہ ہالا کوٹ کے مقام پر پٹر کی دوپہر میٹرک کا طالب علم سفیان عاصم پاؤں پھسل جانے کے باعث دریائے کتھار میں جا گرا۔ نصر اللہ جمیع جو سکول کے پرنسپل بھی تھے انہوں نے استاد اور طالب علم کے رشتے کو اتنا مقدس جانا کہ بغیر یہ سوچے سمجھے کہ میری جان بھی جاسکتی ہے۔ دریا میں ڈوبنے والے طالب علم کی جان بچانے کے لئے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ طالب علم کی جان بچاتے بچاتے خود کو سرکش لہروں کے حوالے کر دیا۔

نصر اللہ جمیع 1970ء میں کراچی کے علاقے حیدر آباد کالونی میں پیدا ہوئے۔ دور طالب علمی میں اسلامی فیض طلبہ سے منسلک رہے، جو فیلی طبیعت کے مالک، امت اور ملت عزم سے بھرپور اس نوجوان نے طلبہ سیاست میں بھرپور کردار ادا کیا۔ نصر اللہ جمیع جماعت اسلامی کراچی کے نائب امیر تھے۔ 2002ء کے عام انتخابات میں ایم ایم اے کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا صرف 30 سال کی عمر میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ سندھ اسمبلی میں متحدہ مجلس عمل کے ڈپٹی پارلیمانی لیڈر کی حیثیت سے رہے ہوئے طبقوں کی گرجدار آواز بنے۔ نصر اللہ جمیع کی زندگی جدوجہد سے بھرپور تھی۔

چاہے وہ طالب علمی کا زمانہ ہو یا سیاست کا دور ہر جگہ

جی ہاں اس معمولی بچے کا دیا گیا فارمولا $E=mc^2$ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ہٹلر کی حکومت نے اعلان کیا جو شخص آئن سٹائن کو قتل کرے گا اس کو ۲۰ ہزار مارک انعام دیا جائے گا۔ اس زمانے میں یہ رقم بہت بڑی رقم تھی۔ مگر آئن سٹائن کی عظمت لوگوں کے دلوں میں اتنی قائم ہو چکی تھی کہ کوئی بھی اس انعام کو حاصل کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ البرٹ آئن سٹائن اپنی محنت کی وجہ سے اتنا مشہور ہوا کہ وہ جہاں کہیں بھی جاتا رپورٹر اس کے پیچھے لگے رہتے۔ ساری دنیا اس کی شکل سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ بادشاہوں کا معزز مہمان بنتا۔ جب وہ کسی شہر سے گزرتا تو لوگوں کا ہجوم اسے دیکھنے کے لیے اٹھ آتا۔ آخری عمر میں اسے ملنے والے لوگوں سے بچانے کے لیے محافظ رکھنا پڑا۔ لوگوں کو اس سے اتنی عقیدت ہو گئی تھی کہ وہ اس کے کوٹ کے بٹن بطور تحفہ اپنے پاس رکھ لیتے کہ ہم اس عظیم شخص سے مل چکے ہیں جس کی دماغی صلاحیت کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی۔

تاریخ میں بہت سی مثالیں موجود ہیں معمولی زندگی سے آغاز کرنے والے بچوں نے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ دراصل مشکل حالات ہی عملی محرک بنتے ہیں۔ پیچیدہ ترین صورت حال ہی انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے۔ ہمیشہ زندگی کے بہترین سبق بدترین قسم کے حالات میں ملتے ہیں۔ معمولی حالات زندگی کا مضبوط ذہن ہیں۔ اس کا انحصار آپ پر ہے آپ مصائب اور طوفانوں میں آگے بڑھ کر کامیابی کی سیڑھی تھامتے ہیں یا مایوس ہو کر موقع گنوا بیٹھتے ہیں۔ کامیابی آپ کے سامنے ہے لیکن یہ بھی آسان راستوں پر چل کر نہیں ملتی!

کیا آپ تیار ہیں محنت کرنے کے لیے؟



آسان سے آسان بھی باتیں نہیں کیے سکتا۔ "کلاس روم کے طالب علموں کی نظریں اس لڑکے پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ طالب علم طنز یہ مسکرا رہے تھے۔

"میں نے تم سے ایک سوال پوچھا تھا اس کا جواب دو۔" استاد نے کہا۔

وہ طالب علم کس سے کس نہ ہوا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ کم سن طالب علم کسی اور ہی دنیا میں گم ہو۔ کلاس روم میں سکوت کا راج تھا۔ لڑکوں میں سسٹنی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے سوچا اب ہر روز کی طرح اس لڑکے کو مار پڑے گی۔ وہ خوش تھے کیونکہ وہ اس لڑکے کو پسند نہیں کرتے تھے اور پھر یہ بھی تو تھا کہ اس طرح ان کو کام سے کچھ فراغت ملتی تھی۔ اسی اثناء میں استاد طعنے سے چلانے لگا تھا۔ "کھڑے ہو جاؤ اور باہر چلے جاؤ اور دوپہر تک وہیں کھڑے رہو۔"

کم سن لڑکے نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ مار کھانے سے بہتر تھا کہ وہ باہر ہال میں سخت سردی میں کھڑا رہے حالانکہ یہ بہت مشکل تھا لیکن کلاس روم کے بے تکے سوالوں اور ڈانٹ ڈپٹ سے بہتر تھا۔

اس لڑکے کی زندگی کا آغاز نہایت معمولی تھا۔ تین چار سال کی عمر تک وہ بولنا شروع نہ کر سکا۔ وہ ایک معمولی بچے کی طرح آسان باتیں بھی نہ کیے سکتا تھا۔ بعد ازاں اسے سکول سے نکال دیا گیا کیونکہ استادوں کا خیال تھا کہ اپنی تعلیمی نااہلی کی وجہ سے وہ دوسرے طالب علموں پر برا اثر ڈالتا ہے۔ مگر پھر اس بچے نے محنت کرنا شروع کر دی وہ اکثر آدمی رات تک اپنے کام میں مشغول رہتا تھا۔ اس کی دن رات کی محنت اسے اس بلندی پر لے گئی جو اس کے ہمعصروں میں سے کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ ایک وقت آیا اس معمولی سے بچے نے نوبل انعام حاصل کیا۔ آج دنیا اس معمولی بچے کو آئن سٹائن کے نام سے جانتی ہے۔

نہ

”مجھے طلاق چاہئے“

لوگوں کی

معاشرے میں طلاق کا بڑھتا ہوا رجحان

ہمارے ہاں کا حاکم مرد و عورت کی زبان بند کروانے اور اس پر اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ہر جھگڑے کے وقت اسی ایک لفظ کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے جو ایسی دھمکی ہے کہ عورت خاموشی میں ہی عافیت سمجھتی ہے۔

ایسے امتیاز احمد کراچی

☆

”ط.....ل.....ق“ ہر حرف پر مشتمل یہ مختصر لفظ ایک ایسا ”طمانچہ“ ہے جو کسی اچلتے ہوئے گرم لاوے سے تم نہیں اور جب یہ لاوا ابل کر پھوٹ پڑتا ہے تو بہت سی زندگیوں اچڑ جاتی ہیں اور اچڑنے کے بعد کی بجی بجی زندگی کسی قبر سے کم نہیں ہوتی۔ یہ لفظ اپنے اندر اس قدر سختی، نفرت و حقارت، دردِ ہاں اور کھن طعن جیسے جذبات لئے ہوئے ہے جسے سنتے ہی روح تک لرز اٹھتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اسے حلال ہونے کے باوجود سب سے منع اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے۔ کیوں کہ ایک عورت کو طلاق دینے کا مقصد صرف ایک عورت کو طلاق دینا نہیں ہے بلکہ خاندان کو سولی پر لٹکانے کے مترادف ہے۔ پورے خاندان کے جذبات کو مجروح کرنا ہے، کتنی سی زندگیوں سے کھیلنے کا نام ہے لیکن سوال

”اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی، جانور نہیں جو تم اس قدر بے رحمی سے مجھے مارتے ہو، گالیاں دیتے ہو، مجھے طلاق (خلع) چاہئے اور اگر تم نے طلاق نہ دی تو میں عدالت تک جاؤں گی اور بچوں کا خرچہ بھی تم سے لوں گی۔“

”تم کیا سمجھتی ہو میں اتنی آسانی سے تمہیں طلاق دے کر بچے بھی تمہیں دے دوں گا۔ تم جیسی عورت بچوں کی کیا خاک تربیت کرے گی، دیکھتا ہوں تم عدالت کیسے پہنچتی ہو؟“ اور پھر شاہد نے حسب معمول روپی کو مارنا شروع کر دیا۔ پردے کے پیچھے چھپی ہوئی 7 سالہ زویہ کے ذہن میں طلاق کا لفظ گونج رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ طلاق کیا چیز ہے جو مہاروزانہ پاپا سے مانگتی ہیں اور پاپا ماما کو یہ چیز لاکر دینے کے بجائے ہر روز مارتے ہیں۔

امناز سے ہمارے معاشرے میں پھیلتی جا رہی ہے کہ ہر چار جانب زوال ہی زوال نظر آ رہا ہے۔ بے حسی، ناتدری، قوت برداشت کی کمی اور ذہان درازی سے ایسے بگاڑ پیدا ہوئے ہیں کہ اب شیرازے بکھرنے میں چند لمحے نہیں لگتے۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات اس قدر محکمہ صورت اختیار کر جاتے ہیں کہ علیحدگی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

محمد بن لامہ کی دفعہ 308 کے مطابق "کوئی مسلمان جو محل صبح رکھتا ہو اور سن بلوغت کو پہنچ چکا ہو، جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا مجاز ہے۔" اسلام میں طلاق کی اجازت صرف اُس وقت ہے جب میاں بیوی میں ہا ہی مصالحت کا کوئی امکان نہ ہو، صرف معمولی بات پر طلاق دینا درست نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد رہا ہے۔ "اگر یہ شک پیدا ہو جائے کہ بیوی بدکار ہے تو اسے سمجھایا جائے اور اس پر معمولی تشدد کیا جائے۔" یعنی انتہائی ناگزیر حالات میں بھی طلاق کی اجازت نہیں دی گئی لیکن آج کل معمولی نوعیت کے اختلاف پر طلاق دینا عام سی بات ہے۔ بیوی شوہر سے محض اس لئے خار کھانے لگتی ہے کہ وہ اس کی آزادی کے خلاف ہے اور اس کی خواہشات پوری نہیں کر رہا۔ دوسری طرف مرد بڑھتی ہوئی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے محض ایک مشین بن کر رہ گیا ہے جس نے اس کے مزاج میں بے چینی اور جھڑپ پیدا کر دیا ہے۔

شادی شدہ زندگی کا آغاز دو انسانوں سے ہوتا ہے جو خوشیوں اور محبتوں سے بھرے گھر کی خواہش اور معاشرے میں ہادقار مقام پانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں جس کے بعد ایک خوبصورت اور پرسکون گھر برانسان کی اولین امنگ بن جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں 85 فیصد سے زائد شادیاں کامیاب ہوتی ہیں حتیٰ کہ بظاہر بے جوڑ نظر آنے والے جوڑوں نے بھی

پیدا ہوتا ہے کہ آخروہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر گھریزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو موجودہ دور میں معمولی نوعیت کے تنازعات کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کی جا رہی ہے اور بچوں کے مستقبل کو پس پشت ڈال کر طلاق دے دی جاتی ہے۔ وہ میاں بیوی جن کے درمیان ڈھلی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث اختلافات پروان چڑھتے ہیں اور جو ہر وقت بچوں کے سامنے اپنے اختلافات یا نفرت کے باعث لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ان کے لڑنے جھگڑنے کی وجہ سے بچوں کے مصدوم ذہن پر ایسے نقوش بننے جاتے ہیں جو مستقبل میں تلخ یادوں اور تکلیف دہ عمل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ بچے کے سامنے جہاں ماں اپنی زبان درازی سے کام لیتے ہوئے لا رہی ہوتی ہے تو باپ صبر و تحمل اور قوت برداشت کو پس پشت ڈال کر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور اس ناساز ماحول میں پرورش پانے والے بچوں کی مؤثر شخصیت سازی نہیں ہو پاتی اور وہ اپنی زندگی میں بے راہ روی اور بے قاعدگیوں کو اختیار کر لیتے ہیں۔ طلاق کی صورت میں بچے کو یا تو باپ کی شفقت کے سائے سے محروم ہونا پڑتا ہے یا ماں کی ممتا کی چھاؤں سے کوسوں دور جانا پڑتا ہے۔ ماں باپ میں سے کسی ایک کی محرومی سے بچے میں خود اعتمادی کی کمی بھی ہو سکتی ہے اور وہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق لڑکپن کی عمر میں جو بچے اپنے اہل خانہ سے قریب ہیں اور جن کی زندگیوں میں ان کے ماں باپ پوری طرح شامل ہیں، ان کا کردار درست رہتا ہے اور وہ آوارگی سے دور رہتے ہیں اور یہی اچھا اثر اچھے اساتذہ یا ایسے بزرگوں کا ہوتا ہے جو انہیں اپنے قریب رکھیں اور ان سے شفقت و محبت کا سلوک کریں۔

کچھ سالوں سے بے ترتیبی اور بے چینی کچھ اس

(جیٹو)

AL-KAWTHER

الحکوتہ

• واشنگ مشین • ڈرائیو • روم اتر گولر • گیزر

سب سے اچھی ہے

حمید الیکٹرک انڈسٹری

لوہیا نوالہ کرسٹ سٹار روڈ انکسپیکٹیو روڈ گوجرانوالہ

فون: +92-55-3894636-7 • فیکس: +92-55-3894638

e-mail: info@unkedwash.com

زندگی کے اختلافات کی گھڑی کو یوں الگ ہاندہ کے رکھا ہوتا ہے کہ تمام عمر صرف چند خوبیوں کو مد نظر رکھ کر ہی زندگی گزار دی تاکہ بچوں کو بہترین ماحول میسر آئے اور خاندان کی مہذب ساکھ بھی متاثر نہ ہو۔

لیکن ایسے والدین بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں جو اپنے اختلافات کی وجہ سے بچوں کے مفادات کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے عدالت تک جا پہنچتے ہیں اور میاں بیوی جنہیں ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ اپنے مفادات کی خاطر جھوٹ اور سچ کو ملا کر ایک ایسا روپ دیتے ہیں کہ دونوں ہی دنیا کے غیر مہذب افراد دکھائی دینے لگتے ہیں۔ معمولی رنجشوں کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے سے جان چھڑانے کی تدبیریں ہونے لگی ہیں اور اس سارے عمل میں بچوں کو کسی کھاتے میں شام نہیں کیا جاتا۔ والدین اپنے درمیان رنجشوں کی جنگ میں ان معصوم بھولوں کو بھول جاتے ہیں جنہیں ان کے کسی غلط فیصلے کی بے نیٹ چڑھنا ہوتا ہے۔ والدین آپس کے لڑائی جھگڑوں اور پھر طلاق کے بعد ان کی تقسیم ایسے کرتے ہیں جیسے یہ بچے نہیں کسی جائیداد کا حصہ ہوں۔ بچوں کی اس کھینچا تانی میں یہ بھول مر جھا کر رہ جاتے ہیں اور ان کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسے بچے کم عمری میں سنجیدگی کا شکار ہو جاتے ہیں جن کے حواس پر خوف اور آنے والے کسی لمحے کا ڈر ایسا سوار ہوتا ہے کہ وہ کبھی مکمل شخصیت لے کر بڑے نہیں ہوتے۔

عمر دی ایسے بچوں کی ذات کا ایک حصہ بن جاتی ہے جس کا اظہار بعض اوقات وہ خود کو اور کبھی دوسروں کو اذیت دے کر کرتے ہیں۔ طلاق ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس میں بچے عدم توجہ اور والدین کے درمیان پڑنے والی نفرت کو لے کر پروان چڑھتے ہیں تو ان میں بے راہ روی بڑھنے لگی ہے جس کے بعد وہ جرائم کی دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں اور کچھ نشہ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

چونکہ بچوں میں سیرت و کردار کی نشوونما اور تشکیل کا عمل والدین کے زیر سایہ ہو رہا ہوتا ہے چنانچہ ان میں گمراہ راستوں کا اثر اور بے راہ روی کا فکار ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ محبت کرنے والے ماں باپ کے زیر سایہ پرورش پانے والے بچے صالح بڑا من شہری اور نیک کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ مادہ پرستی ذمہ داریوں سے غفلت اور قوت برداشت کی کمی کے علاوہ اپنے ساتھی کو خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کرنے کے جذبے کی عدم موجودگی کے باعث پاکستان میں طلاق کی شرح بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ثقافتی یلغار نے خاندانی روایات کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب لڑکیاں سسرال والوں کی عام باتوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کرتیں بلکہ ان سے لڑی، جھگڑتی رہتی ہیں۔ معاشرے میں خود غرضی بڑھ جانے کی وجہ سے لحاظ، مروت اور احترام ختم ہو رہا ہے۔ اب انسان کی قدر دولت سے ہے۔ فیشن کی دوڑ نے عمدہ تہذیب و روایات کو کمزور کر دیا ہے اور لڑکیوں کو تعلیم دلوانے کے شعور کی کمی کے باعث بھی لڑکیاں بیرونی اثرات زیادہ اور جلدی قبول کر رہی ہیں۔ ثقافتی یلغار اور گھریلو جھگڑوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے والے لٹریچر کے باعث نوجوان لڑکیوں کے معصوم ذہن اپنے گھر، بھائیوں، شوہر اور والدین کے خلاف سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں تو کچھ خاندانوں میں والدین بچوں کی پسند کو بد نظر رکھ کر شادیاں نہیں کرتے۔ بے جوڑ رشتے بھی خاندان کے ٹوٹنے کی وجہ ہیں۔ پرانے وقت میں عورتیں سمجھوتہ کر لیا کرتی تھیں لیکن موجودہ حالات میں شعور کی وجہ سے ہمارا خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ ہر لڑکی بہترین گھرانے اور پینڈم مرد کی خواہش کرتی ہے۔ اسی طرح لڑکے بھی خوبصورت لڑکی اور امیر گھرانے میں شادی کرنا چاہتے ہیں اور اگر توقعات پوری نہ ہوں تو اختلافات پروان چڑھنے لگتے

ہیں اور طلاق تک لوہٹ آ جاتی ہے۔ پاکستان مسلم فیملی لاہ آرڈیننس 1961ء کے تحت طلاق کا ایک طریقہ کار مقرر کیا گیا ہے جس کے مطابق شوہر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق سے قبل ایک نوٹس بھیجے۔ نوٹس نہ بھیجنے کی صورت میں ایک سال قید یا 5000 روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں ہو سکتی ہیں۔ اس کارروائی کے آغاز پر ہی متعلقہ چیز میں مصالحتی کمیٹی دونوں فریقین کی طرف سے چند افراد کو جن کو ایک کمیٹی تشکیل دیتا ہے جو فریقین کے درمیان صلح کروانے کی کوشش کرتی ہے اور اگر دونوں صلح پر راضی نہ ہوں تو چیئر مین طلاق مؤثر ہونے کا سرٹیفکیٹ 90 دن میں جاری کرتا ہے اور طلاق ہو جاتی ہے۔

ایک سروے کے مطابق اس وقت عدالتوں میں 30 ہزار کے قریب طلاق کے مقدمات زیر سماعت ہیں جب کہ روزانہ 60 سے زائد نئے دعوے دائر ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مقدمات کی تعداد 1800 ماہانہ سے زائد ہے۔ طلاق کے اس قدر بڑے ہوئے رجحان کا اولین سبب غیر سنجیدہ رویے ہیں۔ قوت برداشت کی کمی کے باعث معمولی معمولی جھگڑوں پر بھی طلاق جیسی سنگین دھمکی دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کا حاکم مرد عورت کی زبان بند کروانے اور اس پر اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ہر جھگڑے کے وقت اسی ایک لفظ کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے جو ایسی دھمکی ہے کہ عورت خاموشی میں ہی عافیت سمجھتی ہے۔

پہلے ہمارے معاشرے میں مشترکہ خاندانی نظام رائج تھا جہاں سب مل جل کر رہتے تھے اور ایک دوسرے سے محبت، مروت اور احترام کے جذبات دلوں میں پائے جاتے تھے۔ لڑکے والدین کے دباؤ کی وجہ سے طلاق دینے سے گھبراتے تھے اور یہی حال لڑکی والوں کا بھی تھا کہ اگر ان کی بیٹی کبھی ناراض ہو کے میسے آ جاتی تو

رجوع کیا۔ آج یاسمین کو دو سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے وہ اپنے والدین کے گھر میں خوش ہے۔ بھائی ہر مہینہ بچاس ہزار روپے بھیجتا ہے جب کہ یاسمین کے شوہر نے اسے واپس لانے کے لئے اپنے والدین کو بھی بھیجا تھا لیکن یاسمین نے جانے سے انکار کر دیا۔ یاسمین کا کہنا ہے کہ خالد بہت اچھا انسان ہے اس نے مجھے خوش رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے میرے والدین سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کیا اور کراچی شفٹ ہونے سے انکار کر دیا۔ ویسے بھی حیدر آباد میں میرے بچے اچھی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے، کراچی سب سے بڑے اسکول میں میرے بچے پڑھ رہے ہیں اور میرا بھائی بچوں کے اخراجات اٹھا رہا ہے۔

یاسمین کے برعکس حسن بانو کا کیس بالکل ہی الگ ہے۔ حسن بانو ایک روایت پسند پٹھان خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کی شادی 17 سال کی عمر میں 40 سالہ شادی شدہ شخص گل نواز سے کر دی گئی جو اسے پشاور لے گیا جہاں گل نواز کی پہلی بیوی حسن بانو کو بہت مارتی تھی اور سارے گھر کا کام کاج اسی سے کرواتی تھی۔ جب حسن بانو گل نواز سے اس کی شکایت کرتی تو وہ اپنی پہلی بیوی کو سمجھانے کے بجائے حسن بانو کو مارتا پیٹتا تھا۔ اسی دوران حسن بانو کو خدا کی طرف سے جو اتھڑے میں ملا جسے پا کر حسن بانو بہت خوش تھی لیکن گل نواز اور اس کی پہلی بیوی اب تک حسن بانو کو مارتے پیٹتے تھے۔ ایک دن حسن بانو موقع پا کر گھر سے فرار ہو گئی اور والدین کے پاس آ گئی لیکن یہاں بھی اسے سکون و آرام نصیب نہ ہوا۔ ماں باپ نے الگ لعن طعن کی اور بھائیوں نے اپنی بیویوں کے کہنے میں آ کر مارنے پیٹنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ بہنیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے ناراض ناراض سی رہنے لگیں تاکہ وہ جلدی ہی اپنے شوہر کے پاس لوٹ جائے لیکن حسن بانو کے لئے واپس جانا

والدین بیٹی کو مصالحت پر آمادہ کرتے اور مجھوتہ کرنے کی تلقین کرتے اور یوں بگڑتے ہوئے حالات گھر سے سنورنے لگتے لیکن اب حالات یہ ہیں کہ لڑکی والدین کو مسئلہ بتاتی ہے اور والدین مسئلے کا حل نکالنے کے بجائے لڑکی کو گھر بٹھالیتے ہیں۔

یاسمین جو کہ امیر والدین کی اکلوتی بیٹی ہے، اس کی شادی ڈاکٹر خالد سے 7 سال قبل والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔ خالد چونکہ حیدر آباد میں رہتا ہے اور وہیں ایک سرکاری ہسپتال میں کام کرتا ہے، اس لئے شادی سے پہلے یاسمین کے والدین نے اسے کراچی شفٹ ہونے کی شرط رکھی تھی جسے خالد نے بخوشی قبول کر لیا تھا لیکن شادی کے بعد یاسمین کراچی شفٹ ہونے کا ذکر کرتی تو خالد بہانے بازی سے کام لیتا کہ میری مستقل نوکری ہے، اتنی جلدی ٹرانسفر نہیں ہو گی وغیرہ۔ اس دوران یاسمین حیدر آباد کی گرمی سے بہت پریشان تھی۔ یاسمین کو جہیز میں اسے سی بھی ملا تھا۔ جب یاسمین نے اسے اپنے کمرے میں لگانے کا ارادہ کیا تو بڑی جیٹھائی نے گھر میں جھگڑا ڈال دیا کہ یاسمین کے کمرے میں انٹرکنڈیشن لگنے کی وجہ سے اس کا کمرہ مزید گرم ہو جائے گا کیوں کہ اسے سی سے لکھنے والی گرام ہوا براہ راست اس کے کمرے میں آئے گی۔ یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یاسمین اپنے لئے الگ کھانا بناتی تھی۔ یاسمین کا بڑا بھائی امریکہ میں رہتا تھا وہ چینیوں میں کراچی آیا ہوا تھا۔ یاسمین بھائی سے ملنے اپنے میکے گئی جہاں اس نے بھائی کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ بھائی نے جوش میں آ کر اپنی بہن کو گھر میں ہی روک لیا اور یاسمین اور بچوں کا خرچہ اٹھانے کا وعدہ کیا۔ ساتھ ہی اس نے ڈاکٹر خالد کو مختلف جائز و ناجائز طریقوں سے کراچی شفٹ کرانے کی کوشش کی مگر وہ ناکام ہوا۔

لہذا اس نے بہن کو خلع دلوانے کے لئے وکیل سے

ورنہ تو ہر عورت اپنے بچوں کی خاطر مصالحت کا راستہ اپناتی ہے جب کہ مرد حضرات اسلام کے اس اصول کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں کہ ایک مرد چار شادیاں کر سکتا ہے۔ مردوں کے لئے ایک سے زائد شادیاں اہم ہیں اس بات کو قطعی بھول کر کہ کن حالات میں اور کن خواتین سے بوقتِ مجبوری شادی کی جاسکتی ہے۔

موجودہ دور میں اقدار اور روایات بدلتی جا رہی ہیں۔ بہت سے مہاں بیوی میں جہنمی ہم آہنگی کا فقدان ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کی لڑکیاں باشعور ہونے کی وجہ سے اپنے دفاع کے لئے لڑتی ہیں تو ان کو طلاق جیسی دھمکیاں بھی ملتی ہیں لہذا لڑکیوں کو چاہئے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں ہوئے سسرال والوں کی معمولی نوعیت کی باتوں کو نظر انداز کریں اور اپنے سسرال والوں سے تعاون کریں تاکہ اچھے تعلقات پروان چڑھ سکیں۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ لڑکیاں چاہے مصنوعی روپ دھار کر ہی سہی سسرال والوں کی ہاں میں ہاں ملائیں تاکہ ان کا دل جیتا جاسکے۔ ہمارے معاشرے میں چونکہ مرد حاکم تصور کیا جاتا ہے اس لئے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا ہر حکم مانا جائے اس لئے عورت کو ہی اس کے رنگ میں ڈھلنا پڑتا ہے۔ لہذا اگر شوہر غصے میں ہو تو بیوی کو خاموش رہنا چاہئے۔ اگرچہ خاوند کو بھی چاہئے کہ وہ اپنی بیوی سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ قوتِ برداشت کا استعمال کرتے ہوئے بیوی کو مارنے پینے سے گریز کرے کیوں کہ جو شخص محض اپنا غصہ کسی عورت پر اتارتا ہے وہ دنیا میں کمزور کردار کا حامل شخص ہوتا ہے لیکن بعض مرد غصے کے زیادہ تیز ہوتے ہیں اور ایسی صورت میں بیویاں بھی زبان درازی کرتی ہیں تو معاملہ بگڑنے لگتا ہے اور طلاق جیسی صورت سامنے آتی ہے۔



جہنم میں جانے کے مترادف تھا۔ حسنِ بالو اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگی جس کی بہت مخالفت کی گئی لیکن حسنِ بالو نے ہتھیار نہیں اٹائے۔

دو سال بعد ایک دن اچانک حسنِ بالو کا شوہر اپنے بیٹے سے ملنے کے بہانے کراچی آ گیا۔ حسنِ بالو کے والدین نے صلح کروانے کی کوشش کی اور گل نواز حسنِ بالو کو ایک کوارٹر میں لے گیا جس کا کرایہ اکثر دیگر حشر حسنِ بالو ہی دیا کرتی تھی۔ گل نواز چونکہ ٹرک ڈرائیور تھا اس لئے مہینے میں ایک دو بار حسنِ بالو کے پاس آ جایا کرتا تھا۔ اس دوران حسنِ بالو کی گود میں ایک بیٹی اور ایک بیٹے کا مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ حسنِ بالو کچھ ہی سالوں کے لئے خوش رہ سکی تھی کہ ایک دن گل نواز کی جانب سے طلاق کا نوٹس آیا جسے دیکھ کر حسنِ بالو سکتے میں آ گئی اور اس کی بساکی دنیا اجڑ گئی۔ گل نواز نے پھر کبھی مڑ کر حسنِ بالو اور بچوں کا حال دریافت نہ کیا۔ اب حسنِ بالو ایک گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتی ہے اور اس کے بچے ننھیال میں ہوتے ہیں جہاں انہیں ڈانٹ ڈپٹ اور طعنوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ حسنِ بالو کا کہنا ہے کہ اپنے ماں باپ کی قلمی کی وجہ سے آج میں اس حال میں ہوں۔ انہوں نے ایک ایسے شخص سے میری شادی کر دی جو پہلے سے شادی شدہ تھا جس نے مجھ پر بہت ظلم کئے اور آج جب میں ان کی قلمی کی سزا بھگت رہی ہوں تو وہ شرمندہ ہونے کے بجائے مجھے ہی قصور وار ٹھہراتے ہیں کہ گھر بسانے کے قابل نہیں ہوں۔

اکثر خواتین کی بد قسمتی یہ کہ وہ ایسے شخص سے بیاہ دی جاتی ہیں جو یا تو شادی شدہ ہوتا ہے یا نشے کا عادی ہوتا ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کے اس دور میں سانسوں کی ڈور کھینچنے کے لئے کمانا نہایت ضروری ہے ایسے ہی بعض حالات کا شکار ہو کر اور کئی خواتین روزِ روز کے درد سے بچنے کے لئے اپنے خاوند سے طلاق لیتی ہیں

جنت کا دربار

”تمہاری مراد پوری ہو جائے گی لیکن جنت کے اس دربار میں تمہیں جب وہ چاہیں حاضری دینا ہو گی اور وہ تمہاری خواہش پوری کر رہے ہیں۔ تمہیں ان کی خواہش پوری کرنی پڑے گی۔“

نی آ کی ساگر



کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ تاحہ جیل کا قادری صاحب تھا۔ ”رات کو سونے سے پہلے ایک سو مرتبہ یار رحیم یا کریم کا ورد کر لیا کرو“۔ قادری صاحب نے کہا۔ ”میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے کیا جرم کیا ہے اور تمہیں کتنی سزا ملی ہے۔ میں تمہاری صرف حالت دیکھ رہا ہوں۔ یہ اچھی نہیں۔ قیدی جب جیل میں آتا ہے تو مہینہ دو مہینے اس کی یہی حالت رہتی ہے۔ تم مسلمان ہو اسی لئے تمہیں یہ وظیفہ بتایا ہے۔ یہ ضرور کرنا خدا تمہیں سکون عطا کرے گا۔“

اُس کے انداز میں مجھے خلوص اور ہمدردی نظر آئی یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ بعض پیشہ ور فراڈ پے کسی فراڈ میں پکڑے جاتے ہیں تو جیل میں آ کر بھی کوئی نہ کوئی فراڈ چلا لیتے ہیں۔ میں نے جیل میں دو تین عادی مجرموں کو پیر اور عامل بنے ہوئے دیکھا ہے۔ جن قیدیوں کے کیس چل رہے تھے یا جن کی اپیلیں ابھی زیر سماعت تھیں وہ ان کو باقاعدہ نذر نیاز دیتے تھے۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ قادری صاحب بھی ایسا ہی فراڈیا ہے لیکن چار پانچ دنوں میں مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص کچھ اور ہے۔

پانچ چھ مہینے گزر گئے۔ اس عرصے میں جیل کے ایک وارڈن اور دس بارہ قیدیوں نے مجھے قادری صاحب کی زندگی کی کہانی سنائی۔ ان قیدیوں میں دو تین ایسے بھی تھے جو قادری صاحب کو باہر بڑی اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ایسے تھے جو ان کی زندگی کی کہانی کے دوسرے کرداروں کو بھی جانتے تھے۔ میں نے اپنے طور پر مختلف ذرائع سے قادری صاحب کی کہانی کی انکوائری کی اور تصدیق بھی کروائی۔ میں آپ کو یہی کہانی سناؤں گا۔

پاکستان بننے سے بہت پہلے کا واقعہ ہے بھوپال شہر میں ایک مسلمان لڑکے کی بارات لڑکی والوں کے ہاں گئی۔ بینڈ باجا ساتھ تھا اور گولے بھی بہت چلائے جا

کھانیاں مل سکتیں۔ ہر قیدی ایک کہانی کا کردار ہوتا ہے۔ ہر جرم کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے۔ وہاں ہر قیدی اپنی کہانی سننے کے لئے چننا رہتا ہے۔ چار دیواری کی دنیا کی چھوٹی چھوٹی باتیں جب واردات کی صورت اختیار کر لیں تو جیل میں جا کر سنسنی خیز کہانیاں بن جاتی ہیں۔

میں جب بھارت میں جاسوسی کے جرم میں پکڑا گیا تو تھرو ڈگری کی بٹھی میں سے گزار کر مجھے تاحہ جیل میں پھینک دیا گیا۔ میری ہڈی پٹی ایک ہو چکی تھی۔ سات آٹھ روز بعد جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو میں نے اچھی طرح دیکھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ اگر میں اپنی اس وقت کی حالت اور وہاں کا ماحول بیان کرنا شروع کر دوں تو اصل کہانی جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں وہ دھری رہ جائے گی۔ میں مزید تمہید کے بغیر اصل کہانی پر آتا ہوں۔

میں ایک ضعیف العمر قیدی کو پہلے روز ہی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی داڑھی اور سر کا ایک ہال بھی کالا نہیں رہا تھا۔ کیا قیدی اور کیا جیل کا عملہ، ہر کوئی اس کی تعظیم کرتا تھا اور سب اُسے قادری صاحب کہتے تھے۔ شاید میں ہی تھا جس کے ساتھ ابھی اُس کا تعارف نہیں ہوا تھا۔ ایک روز میں بیرک سے باہر بیٹھا اپنے خیالوں میں گم تھا۔

یہ سوچ مجھے پریشان کر رہی تھی کہ کس غدار نے میری مخبری کر کے مجھے گرفتار کر دیا ہے۔ مجھے گرفتاری کا افسوس نہیں تھا۔ میں اس حقیقت کو قبول کر کے جاسوس بنا تھا کہ ایک نہ ایک دن دشمن مجھے گرفتار کرے گا اور اس امکان کو بھی میں نے ذہن میں بٹھا رکھا تھا کہ میں دشمن کی گولی سے مارا بھی جاؤں گا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جب میں پکڑا جاؤں گا تو مجھے ظالمانہ اذیتیں دی جائیں گی۔ مجھے افسوس اپنے مشن کا تھا جو ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔

تھے۔ ایسے گھرانوں میں لڑکی کی پسند اور ناپسند نہیں دیکھی جاتی۔ لڑکے کو بھی اپنی پسند اور ناپسند کے اظہار کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس لڑکی کا نام مجھے زریںہ بتایا گیا۔ راز یہ کھلا تھا کہ لڑکی کو ایک اور لڑکا اور اس کا گھرانہ بہت ہی پسند تھا۔ اس نے اس لڑکے کو جس کا نام مجھے فہیم بتایا گیا، دیکھا ہوا تھا اور اس کے متعلق وہ بڑی اچھی باتیں سنتی رہتی تھی۔

فہیم کا گھرانہ کشادہ ظرفی اور خلوص کے لحاظ سے مشہور تھا۔ زریںہ اور فہیم کا آپس میں کبھی آنا سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ دولہا جو گھوڑی سے گرا تھا کمزور اور چھوٹے سے قد کا لڑکا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ اس کے مقابلے میں زریںہ صحیح معنوں میں خوبصورت لڑکی تھی۔ چار دیواری کی دنیا میں کسی کا کوئی راز چھپا نہیں رہ سکتا۔ زریںہ کا رشتہ جب اس لڑکے کے ساتھ طے ہو گیا تو وہ سہیلیوں کے آگے روٹی تھی۔ اُس نے یہاں تک کہا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ کچھ کھا کر مر جاؤں۔

بھوپال شہر کے گرد و نواح میں ایک پہاڑی کے دامن میں چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ وہاں ایک عامل رہتا تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اُس کے پاس ایسا علم ہے کہ وہ ترنگ میں آ جائے تو سپاہ کو سفید کر دے۔ ایسے بعض لوگ کالا علم کہتے اور کچھ لوگ کہتے تھے کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں جو اس کا حکم مانتے ہیں۔ وہ جنات کا باقاعدہ دربار لگاتا ہے۔ انہی جنات کی مدد سے وہ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ زریںہ نے عورتوں کی زبانی اس عامل کی کرامات کے بہت قصے سن رکھے تھے۔ اسے محض اتفاق کہا جاسکتا ہے کہ زریںہ ان عاملوں کو نہیں مانتی تھی۔ اُسے دو سہیلیوں نے مشورہ دیا کہ اس عامل کے پاس جاؤ اور اُسے کہو کہ یہ رشتہ نوٹ جائے اور اُس کی شادی فہیم سے ہو جائے۔

ایک روز زریںہ ان دو سہیلیوں کے ساتھ اپنی ماں کو

رہے تھے۔ بارات جب لڑکی والوں کے گھر کے قریب پہنچی تو دولہا کے ایک دوست نے دولہا کی گھوڑی سے چند رہیں قدم آگے جا کر تین گولے زمین پر رکھے اور انہیں باری باری آگ لگا دی۔ گولوں کے پھٹنے تک دولہا کی گھوڑی گولوں کے قریب چلی گئی۔ بیٹڑ باجے والے گھوڑی کے آگے تھے لیکن وہ سب پیچھے ہٹ آئے کیونکہ تین گولے پھٹنے والے تھے۔ دولہا کی گھوڑی گولوں سے دو تین قدم دور تھی کہ تین گولے پھٹے۔ گھوڑی ایسی بُری طرح ہد کی کہ پیچھے کو مڑ کر دوڑ پڑی اور بے لگام ہو گئی۔ دو بچے کپلے گئے اور دولہا جس نے کبھی گھوڑ سوار کی کا تصور بھی نہیں کیا تھا، کچھ اس طرح گرا کہ گھوڑی کے آگے جا پڑا اور گھوڑی کا اگلہ پچھلا سم اس کے کولہے پر پڑا۔ وہاں سے دولہا کی ٹانگ بہت بُری طرح کھلی گئی۔

دولہا کو اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ وہ بے ہوش تھا۔ عین موقع پر یہ جو حادثہ ہو گیا تھا اس کا ہر کسی کو افسوس تھا لیکن شام کے وقت ڈاکٹر نے یہ بتا کر کہ دولہا کی ٹانگ کولہے کے قریب سے کاٹنی پڑی گی۔ لڑکے والوں کے ہاں صف ماتم بچھا دی۔ پتا چلا کہ ٹانگ پر جہاں گھوڑی کا پاؤں پڑا تھا، وہاں سے ہڈی اس طرح ٹوٹی ہے کہ جوڑی نہیں جاسکتی۔ ٹانگ کا گوشت اس طرح کھلا گیا تھا کہ ٹانگے لگنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر اناڑی ہو لیکن ہوا یہ کہ دولہا کی ٹانگ کولہے کے قریب سے کاٹ دی گئی۔ دولہا میاں کے جسم پر گوشت کی پہلے ہی کی تھی وہ بیچارہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔

لڑکی والوں نے شادی ملتوی نہ کی بلکہ منسوخ کر دی۔ ایک ٹانگ کے آدمی کو کون اپنی اچھی بھلی لڑکی دیتا ہے۔ یہاں سے یہ کہانی چار دیواری کی دنیا کے اندر چلی جاتی ہے۔ جس دلہن کو لانے کے لئے یہ بارات جاری تھی وہ اس دولہا کو پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ راز کچھ عرصہ بعد کھلا تھا۔ لڑکی والے درمیانہ درجے کے شریف لوگ

بالکل ویسے ہی ہو گیا لیکن یہ خبر بڑی جلدی عورتوں میں پھیل گئی کہ زریںہ خوش نہیں اور اُس پر ہر وقت خاموشی طاری رہتی ہے۔ اُس کی سہیلیوں سے پتہ چلا کہ زریںہ اپنے آپ میں کوئی ایسا اثر محسوس کرتی ہے جو اُسے نہ ہنسنے مسکرانے دیتا ہے نہ بات کرنے دیتا ہے۔ بعض اوقات وہ رو بھی پڑتی تھی۔ اس کی ساس بہت پریشان ہوئی کہ لڑکی کو کیوں چپ لگی ہوئی ہے۔ زریںہ بڑی شوخ لڑکی ہوا کرتی تھی۔

زریںہ کا خاوند بھوپال سے کچھ دور کسی ضلع کے شہر میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں اپر ڈویژن کلرک تھا۔ اُس وقت بھوپال ایک مسلمان نواب کی ریاست تھی۔ اس کی حدود کے باہر انگریزوں کا قانون چلتا تھا۔ فہیم شادی کے دوسرے تیسرے مہینے زریںہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ یہ کون سا شہر بتایا گیا تھا۔ بعض عورتیں کہتی تھیں کہ زریںہ ساس کے ساتھ خوش نہیں رہتی اور وہ فہیم کے ساتھ رہنا چاہتی ہے لیکن فہیم کے ساتھ گئی تو بھی اس کی حالت سدھرنہ سکی۔ فہیم اپنے خاندان کے مطابق بڑے اچھے ذہن اور کھلے دل کا آدمی تھا۔ اس نے زریںہ کو خوش رکھنے کا ہر طریقہ استعمال کیا لیکن وہ خوش ہونے کی بجائے رو پڑتی تھی۔ آخر فہیم بار گیا۔ اُس نے زریںہ سے کہا کہ تمہاری دو سہیلیوں نے مجھے بتایا تھا کہ تم مجھے بہت پسند کرتی تھیں لیکن اب مجھ کو شک ہونے لگا ہے کہ تم کسی اور کو چاہتی ہو۔

فہیم کی زبانی یہ بات بھی معلوم ہوئی تھی کہ زریںہ میاں بیوی کے تعلقات میں برف کی مانند سرد رہتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کے اندر اس قسم کے جذبات ہیں ہی نہیں یا وہ فہیم کے معاملے میں ان جذبات کو سرد اور غرورہ رکھتی تھی۔ فہیم نے جب جگ آ کر اُسے یہ کہہ دیا کہ وہ کسی اور کو چاہتی ہے تو زریںہ تڑپ اٹھی۔

"نہیں نہیں"۔ زریںہ نے روتے ہوئے کہا۔ "خدا

بتائے بغیر عامل کے پاس چلی گی۔ عامل نے اُس سے واجبی سے پیسے لئے اور کاغذ پر کچھ ہندسے سے لکھ کر اُسے دیئے اور کہا کہ اس کاغذ پر اپنا تھوک لگا کر اپنے باہر والے دروازے کے قریب کہیں زمین میں دبا دیتا۔ عامل نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ایک خطرہ مول لے رہا ہے۔ خطرہ یہ تھا کہ اُس نے یہ کام اپنے ایک جن کے سپرد کیا تھا کہ اس دروازے سے میں صرف وہی شخص داخل ہو جسے زریںہ پسند کرتی ہے اور اگر اس کی ناپسند کا دولہا آ جائے تو اُس کو ایسا بھگاؤ کہ پھر کبھی ادھر آنے کا نام نہ لے۔ عامل نے زریںہ کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اپنا چہرہ اُس کے بالکل قریب کر کے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تمہاری مراد پوری ہو جائے گی لیکن جنات کے اس دربار میں تمہیں جب وہ چاہیں حاضری دینا ہوگی اور وہ تمہاری خواہش پوری کر رہے ہیں۔ تمہیں اُن کی خواہش پوری کرنی پڑے گی۔"

عامل کا کہا ہوا ایک ایک لفظ پورا ہو گیا۔ زریںہ کا ناپسندیدہ دولہا آیا اور گھوڑی سے گر کر ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا۔ زریںہ کے والدین نے اس خدشے کے پیش نظر کہ لڑکے کی ٹانگ کا زخم ملنے کے بعد اُس کے ماں باپ پیچھے نہ پڑ جائیں کہ اب شادی کرو، فوراً کسی اور جگہ زریںہ کی شادی کرنے کے لئے فہیم ہی کو منتخب کر لیا۔ اس سے پہلے فہیم کے ماں باپ نے بھی زریںہ کا رشتہ مانگا تھا لیکن زخمی ہونے والا دولہا ان کی برادری کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اسی لئے اسے رشتہ دے دیا گیا، اب زریںہ کا رشتہ فہیم کو مل گیا۔ دس بارہ دنوں بعد فہیم کی ہارات آئی اور زریںہ کو لے گئی۔

زریںہ پر عامل کی دھاک بیٹھ گئی لیکن معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ وہ دوبارہ عامل کے پاس نہ گئی۔ اس لڑکی سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہو سکتا تھا کہ جو وہ چاہتی تھی

مجھے یہ بات پہلے ہی بتا دینی چاہئے تھی..... میں پہلے دولہا کے ساتھ رشتہ طے ہو جانے پر اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ اس نقشبندی عامل کے پاس گئی تھی اور اُسے کہا تھا کہ یہ رشتہ منسوخ ہو جائے اور میری شادی آپ کے ساتھ ہو جائے۔ اُس نے مجھے ایک تعویذ سادے کر کہا کہ یہ اپنے گھر کے باہر والے دروازے کے قریب زمین میں دبا دینا پھر تمہارے گھر میں تمہاری پسند کا آدنی بارات لے کر آئے گا۔ اگر کوئی اور دولہا بن کر آ گیا تو میرے جن اُسے ایسے طریقے سے واپس بھیجیں گے کہ وہ ساری عمر یاد رکھے گا.....

"میں نے اُس کا تعویذ اپنے دروازے کے باہر دبا دیا۔ پھر آپ کو بھی معلوم ہے کہ جو آدنی مجھے اچھا نہیں لگتا تھا وہ بارات لے کر آیا تو اُس کے ساتھ کیا ہوا۔ اُس کی ایک ٹانگ ہی کٹ گئی۔ آپ کو میرے رشتے کا جواب مل چکا تھا لیکن میرے ماں باپ نے خود آپ کے ابو اور امی کو پیغام بھیجا کہ ہماری لڑکی کے ساتھ بات چلی کر لو۔ یہ ایک معجزہ تھا لیکن یہ معجزہ میرے لئے سزا بن گیا۔ وہ اس طرح کہ جب آپ کی بارات آئی تو میں بہت ہی خوش تھی لیکن مجھے جب آپ کے کمرے میں بٹھا کر لڑکیاں باہر نکل گئیں تو میرے دل کو کچھ ہو گیا۔ میں نے سنا تھا کہ پہلے روز ہر دلہن گھبرا کر پرتی ہے۔ میں بھی یہ بھی کہ پہلے روز والی گھبراہٹ ہے جو آپ کی ملاقات کے بعد ختم ہو جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا.....

"آپ کمرے میں آئے تو میرا دل اتنا بیٹھ گیا کہ رونے کو جی کرنے لگا۔ میں نے اپنے سارے وجود میں سردی محسوس کی۔ میرا خیال تھا کہ آپ جب میرے جسم کو ہاتھ لگائیں گے تو آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ تمہارا جسم اتنا سرد کیوں ہے؟ میرے وہ جذبات جنہیں آپ جگانا چاہتے تھے وہ مر گئے۔ ایک خوف میرے دل پر بیٹھنے لگا۔ میں نہیں جان سکتی تھی کہ یہ کیا خوف ہے۔ آپ شاید یہ

کے لئے مجھ پر یہ اصرام نہ لگائیں۔"

"پھر مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" فہیم نے کہا۔ "اگر نہیں بتاؤ گی تو میں بھی سمجھوں گا کہ تمہیں میری روجیت پسند نہیں۔ اس کا بھی ایک علاج ہے کہ ہم علیحدہ ہو جائیں۔"

یہ ایسی چوٹ تھی جو زریںہ برداشت نہ کر سکی۔

"مجھ پر کوئی ایسا اثر ہے جس نے میرے خون کو سرد اور میری زبان کو بند کر رکھا ہے۔" زریںہ نے کہا۔ "مور تیں کہا کرتی ہیں کہ دشمن کالے جادو کے تعویذ کرا دیتے ہیں۔ میں ڈرتی ہوں کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہوا ہو۔"

"پھر میری امی کا شک صحیح معلوم ہوتا ہے۔" فہیم نے کہا۔ "اگر یہی بات ہے تو یہ ان لوگوں کی کرکوت ہے جن کی بارات آ کر واپس چلی گئی تھی۔ انہوں نے یہ تو نہیں سوچا کہ ان کا لڑکا بیکار ہو گیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں لڑکی مل جائے۔ تم شاید یہ جانتی ہو گی کہ ہمارے شہر کے قریب ایک نقشبندی عامل ہے جو اس قسم کے کالے تعویذ بھی دیتا ہے اور ان کا توڑ بھی کرتا ہے۔ میں آج ہی ابو اور امی کو خط لکھتا ہوں کہ وہ اس عامل کے پاس جائیں اور وہ اس سے بات کریں۔"

اس عامل کا نام سن کر زریںہ گھبرا گئی۔ اُس نے فہیم سے کہا کہ اُس عامل کے پاس نہ جائیں۔ فہیم نے وجہ پوچھی تو زریںہ نے گول مول ہی وجہ بتا کر نالے کی کوشش کی فہیم غصہ نہ دیا تھا۔ اُسے کچھ شک ہوا اور وہ زریںہ کے پیچھے پڑ گیا کہ اتنے مشہور اور قابل عامل سے وہ کیوں گھبراتی ہے۔

"یہی وہ راز ہے جو میں آپ سے چھپانے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔" زریںہ نے کہا۔ "اور یہی راز مجھے اندر ہی اندر کھاتا رہا ہے۔ اب میں یہ راز آپ کے آگے رکھ دیتی ہوں اور میں اب محسوس کرنے لگی ہوں کہ

تمہیں کام ہو جانے کے بعد بھی یہاں آنا پڑے گا اور جو جن تمہاری خواہش پوری کرے گا وہ ہو سکتا ہے تم سے اپنی کوئی خواہش پوری کرنا چاہے۔ اگر تم نہ آئیں تو یہ جن تمہیں نقصان پہنچائے گا لیکن میں پھر بھی عامل کے پاس نہ گئی۔ اُس نے ایک عورت کی زبانی پیغام بھیجا کہ تم نے جنات کے دربار میں اپنا پھیرا پورا نہیں کیا۔ یہ فوراً پورا کرو۔

فہیم نے زریںہ سے کہا کہ اُسے وہاں جانا چاہئے تھا۔ زریںہ نے اُسے بتایا کہ عورتوں سے پتہ چلا تھا کہ عورت کے معاملے میں اس عامل کی نیت لھیک نہیں ہوتی۔ زریںہ نے فہیم سے کہا کہ اُسے جس طریقے سے عامل نقشبندی نے کہا تھا کہ میں ایک بار اُس کے پاس آؤں، اس سے میں نے اُس کی نیت بھانپ لی تھی۔

”میں نے اس عورت سے کہا تھا کہ انہیں کہنا کہ میرا آنا اب مشکل ہو گیا ہے کیونکہ میری شادی ہو گئی ہے۔“ زریںہ نے فہیم کو بتایا۔ ”میں نے کہلا بھیجا تھا کہ آپ جتنے پیسے کہیں گے وہ میں بھیج دوں گی۔ عامل نے اپنے جن کو سامنے رکھ کر اپنی خواہش ظاہر کر دی اور اسی عورت کی زبانی کہلا بھیجا کہ تم نہیں آؤ گی تو میں تمہارے پہلے دولہا کے باپ کو بتا دوں گا کہ تم نے مجھ سے اُن کے لڑکے کو جان سے مروانے کے لئے لعویذ کر دائے تھے اور اس کے عوض تم نے مجھے اپنا جسم پیش کیا تھا۔ عامل نے یہ بھی کہا کہ میں تمہارے موجودہ سسرال تک بھی یہ بات پہنچا دوں گا اور میں یہ کام بھی کروں گا کہ جس جن نے تمہارا کام کیا ہے وہ تمہیں جین سے نہ بیٹھنے دے۔“

یہ دوسرا خوف یا وہم تھا جو زریںہ پر آسیب بن کر سوار ہو گیا۔ عامل نقشبندی نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ساری عمر ماں نہیں بن سکے گی۔ زریںہ نے فہیم کو بتایا کہ اُسے یقین ہے کہ عامل نے اُسے اس حالت میں لانے کے لئے کوئی عمل کیا ہے۔ زریںہ نے یہ بھی کہا کہ اُس کے

سمجھتے رہے ہو گے کہ میں نے گھر اور نئی زندگی کی وجہ سے گھبرائی ہوئی ہوں.....

”دن کو عورتیں مجھے دیکھنے آتی رہیں۔ اس رونق میں میرا دل لھیک رہا لیکن رات کو پھر وہی حالت ہو گئی۔ آپ نے مجھے کہا کہ تم بہت تھکی ہوئی ہو اور میں بھی تھک گیا ہوں، آج سو جاتے ہیں..... میں سو گئی۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں اپنے پہلے دولہا کو دیکھنے ہسپتال جاتی ہوں۔ وہ لاش کی طرح بے ہوش پڑا ہے اور مجھے ایک آواز سنائی دی۔ اُس شخص کو تم نے قتل کیا ہے۔ میں ڈر جاتی ہوں۔ پھر میرے دل میں یہی خیال بیٹھ جاتا ہے کہ اس آدمی کو میں نے عامل کے تعویذ سے قتل کیا ہے.....

”میری آنکھ کھلی تو دل کی گھبراہٹ سے میرا پسینہ نکل آیا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ خوف کیسا ہے۔ جبکہ اُس آدمی کو میں پسند نہیں کرتی تھی جو میرا دولہا بن کر آیا تھا لیکن میں نے اُسے ساری عمر کے لئے ایک ٹانگ سے محروم کر دیا ہے۔ وہ مجھے زبردستی اٹھا کر اپنے گھر لے جانے نہیں آیا تھا۔ اُس نے میرا رشتہ زبردستی نہیں لیا تھا۔“

مختصر یہ کہ زریںہ کے ضمیر پر اس جرم کا بوجھ آ پڑا کہ اُس نے عامل نقشبندی سے کالے جادو کا ایسا سخت تعویذ لے کر اپنے پہلے دولہا کے راستے میں دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی۔ فہیم نے مان لیا کہ عامل نقشبندی کے علم اور عمل میں طاقت ہے لیکن اُس کے لئے زریںہ نے مسئلہ کھڑا کر دیا۔ فہیم نے زریںہ کا وہم دور کرنے کی بہت کوشش کی لیکن زریںہ کی حالت بہتر نہ ہو سکی۔

”پھر ایک اثر اور بھی ہے۔“ زریںہ نے فہیم سے کہا۔ ”میں یہ راز بھی آپ کو دے دوں تو بہتر ہو گا۔ آپ سے کچھ چھپا کر میں محسوس کرتی ہوں جیسے میں آپ کو اپنا نہیں سمجھتی..... بات یوں ہوئی تھی کہ عامل نے مجھے کہا تھا کہ اُس نے میرا کام کرنے کے لئے ایک جن مقرر کر دیا ہے۔ اُس نے مجھے بڑے عجیب طریقے سے کہا تھا کہ

پاکستان میں چمکے
بنانے کے بانی

SA

ESTD. 1936

ایس اے چمکے



ایس اے - انٹرنیشنل انڈسٹریز - کراچی
053 - 3515327, 3535045, 3533478

جذبات اتنے سرد ہو گئے ہیں کہ اُسے کبھی بچ نہیں ہوگا۔
فہیم کے دل میں زرینہ کے خلاف جو غلط فہمی تھی وہ
کل گئی۔ اس کی جگہ ہمدردی پیدا ہو گئی لیکن فہیم بھی ڈر گیا
کہ جس عامل نے ایک آدمی کو گھوڑی سے گرا کر بیکار کر
دیا ہے اُس نے زرینہ پر بھی کوئی عمل کر دیا ہوگا۔ اس نے
ارادہ کیا کہ عامل نقشبندی کے پاس جائے اور اُسے کچھ
نذرانہ پیش کرے لیکن اُس نے اس خیال سے ارادہ توڑ
دیا کہ عامل یہ مطالبہ نہ کرے بیٹھے کہ اپنی بیوی کو سمجھو۔

فہیم بہت پریشان ہوا۔ اس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ
مسلمان تھا۔ فہیم نے اُس کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔ ڈپٹی
کمشنر کے دفتر کا یہ سپرنٹنڈنٹ جو کوئی رضوی صاحب تھا،
فہم پڑا۔ کہنے لگا کہ بیشتر عامل لو سر باز ہوتے ہیں اور یہ
عامل زرینہ کو بیک میل کر رہا ہے۔

”لیکن اُس نے زرینہ کے پہلے دولہا کو گھوڑی
سے گرا دیا تھا۔“ فہیم نے کہا۔ ”یہ اس کے تعویذ کا اثر
تھا۔“

”کالے علم میں اس سے بھی زیادہ طاقت ہے۔“
بوڑھے رضوی نے کہا۔ ”لیکن یہ نقشبندی جس طریقے
سے تمہاری بیوی کے پیچھے پڑ گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا
ہے کہ وہ کالے علم کا عامل تو ہے لیکن شریف آدمی نہیں۔
کالا علم جاننے والے عموماً شریف نہیں ہوا کرتے۔“

فہیم نے اسے کہا کہ اُس کا مسئلہ باتوں سے حل
نہیں ہوگا۔ وہ تو پوچھ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ورنہ اُس کی
اتنی اچھی بیوی کی کوئی حالت بگڑتی چلی جائے گی اور وہ
پاگل ہو جائے گی۔

ڈپٹی کمشنر کا دفتر ضلع میں سب سے بڑا دفتر ہوتا
ہے۔ پولیس بھی اس کے تحت ہوا کرتی تھی۔ اُس وقت
ڈپٹی کمشنر انگریز ہوا کرتا تھا۔ وہ ضلع کا بادشاہ ہوتا تھا۔
رضوی نے فہیم سے کہا کہ وہ کسی قلعہ آدمی سے معلوم
کرائے گا کہ یہ عامل ہے کون۔

ہی گزرے تھے کہ رضوی نے فیہم کو اپنے دفتر میں بلا کر خوشخبری سنائی کہ عامل نقشبندی ایک آدمی کو قتل کر کے خود ہی ریوالور سمیت ہمارے ضلع کے ایس پی صاحب کے پاس پہنچ گیا ہے۔

”میں اصل بات تو بعد میں سنوں گا۔“ فیہم نے کہا۔ ”وہ ریاست میں واردات کر کے ہمارے ضلع میں کیوں آ گیا ہے؟“

”مجھے ابھی پوری بات کا پتہ نہیں چلا۔“ رضوی نے کہا۔ ”اتنا ہی پتہ چلا ہے کہ وہ جھانسی جیل کا پرانا مفرور تھا۔ شام تک پوری بات کا پتہ چل جائے گا۔ اپنی بیوی کو بتا دینا کہ جس عامل کا خوف اُس نے اپنے ذہن پر سوار کر رکھا تھا وہ مفرور قاتل تھا اور اب اُس نے قتل کی ایک اور واردات کی ہے اور خود ہی پولیس کے پاس آ گیا ہے۔ اپنی بیوی سے کہنا کہ اُس کے پاس اگر کوئی اتفاقات ور علم تھا تو وہ اس واردات کو ہضم کیوں نہ کر گیا اور یہ بھی سوچنے والی بات ہے کہ جو آدمی دعوئی کرتا ہے کہ وہ اپنے کالے علم کے ذریعے جسے چاہے جان سے مار سکتا ہے، اس نے ریوالور سے کیوں قتل کیا؟“

فیہم نے رضوی سے پوچھا کہ پہلے دولہا کا گھوڑی سے گرنا اور اس کی جگہ میرا دولہا بن کر آنا اس عامل کا کرشمہ نہیں تھا؟ رضوی نے اُسے بتایا کہ یہ محض اتفاقات ہوتے ہیں اور بعض اتفاقات معجزے کی طرح لگتے ہیں۔ لوگ چونکہ سمجھ نہیں سکتے کہ ایسے کیوں ہو اس لئے وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ کسی نے اپنے علم کے زور سے معجزہ کر دکھایا ہے۔ ان عیروں کا عاملوں اور ہندوؤں کے منیاسیوں اور سادھوؤں کا کاروبار ایسے ہی اتفاقات پر چلتا ہے۔

چار پانچ روز بعد عامل نقشبندی اور ایک جوان لڑکی کا اقبالی بیان رضوی کے سامنے آیا۔ فیہم اور زرینہ کے لئے یہ معجزہ اس طرح رونما ہوا کہ جب زرینہ ایک وہم

تیسرے چوتھے روز سپرنٹنڈنٹ نے فیہم کو بتایا کہ اُس نے ایک بڑا ذہین اور تجربہ کار مجر نقشبندی کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ یہ مجر سائل کے بہروپ میں اپنا ایک مسئلہ لے کر عامل کے پاس گیا۔ مجر نے آ کر بتایا کہ یہ نقشبندی کا لاطم جانتا ہو گا لیکن وہ ٹھیک آدمی علوم نہیں ہوتا۔ مجر نے عامل کے دو خاص مریدوں یا کارندوں میں ایک ایسے آدمی کو دیکھا جو عادی مجرم اور مزایافتہ تھا۔ اس آدمی نے داری میں موٹھیں اور سر کے بال بڑھا رکھے تھے اور سر کے بالوں پر سادھوؤں کی طرح راکھ اور مٹی ڈال رکھی تھی۔ عامل کے متعلق اُس نے بتایا کہ اپنی اصطلاحوں میں بات کرتا تھا جو اس مجر نے اکثر عاملوں کی زبان سے سنی تھیں۔

سپرنٹنڈنٹ نے فیہم سے کہا کہ یہ عامل اگر ضلع میں کسی جگہ ہوتا تو اُس کے متعلق مزید جاسوسی کرا کے اگر اسے نہیں تو اس کے خاص کارندوں کو ہاتھ میں لے کر باقاعدہ تفتیش کرائی جاسکتی تھی مگر وہ ریاست کی حدود میں ہے۔ وہاں صرف اُس ملزم کو پکڑا جاسکتا ہے جس کے خلاف قابل یقین شہادت مل چکی ہو۔

ادھر زرینہ کی حالت سدھرنے کی بجائے بگڑتی گئی۔ اسی سپرنٹنڈنٹ رضوی صاحب نے فیہم کو بہت ہی پریشان دیکھ کر کہا کہ اتنا مت ڈرو۔ اللہ کے کلام سے بڑھ کر اور کوئی تعویذ نہیں تم اپنے گھر میں ختم قرآن کرو دو لیکن سپہارے پڑھنے کے لئے مولویوں اور اُن کے شاگردوں کو نہ بلانا۔ وہ پیشہ ور لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ کے کلام کی توہین کرتے ہیں۔ تم میان بیوی خود قرآن کریم پڑھو۔ رضوی نے انہیں بتایا کہ رات کو سوتے وقت تم دونوں ”یا رحیم یا کریم“ ایک سو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔

دونوں نے اگلے ہی روز قرآن مجید پڑھنا شروع کر دیا اور رات کو یہ وظیفہ بھی پڑھنے لگے۔ ابھی دس روز

R.T.M 121987

MASTER

ماسٹر

موٹرز اینڈ پمپس



ٹیب ویل پمپ



مونوبلاک پمپ



ٹورکس پمپ

کلائنکس آباد

جی۔ بی۔ روڈ گوجرانوالہ



055-3252468

055-3483695

اور ایک خوف کے کنبے میں آئی ہوئی اندر ہی اندر مگھلتی جا رہی تھی، اس وقت ایک روز اس عامل کے پاس ایک نوجوان لڑکی آئی۔ اس لڑکی کو دراصل عامل کے ایک خاص کارندے نے عامل کے سامنے پیش کیا تھا۔ اُس نے عامل سے کہا تھا کہ تمہارے لئے ایک ایسا تحفہ لایا ہوں جو تم نے پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ کارندے نے یہ بھی کہا کہ میں نے اس تحفے کا ذائقہ چکھ لیا ہے اور اب تم بھی پیش پیش سوچ کر لو۔

یہ تحفہ ایک نوجوان لڑکی تھی جس نے اس عامل کی شہرت اور اس کے کرشمے سن رکھے تھے۔ وہ دیہات کی دو تین عورتوں کے ساتھ آئی تھی۔ عامل کے کارندے نے اس لڑکی کو دیکھا تو اُسے الگ لے گیا۔ اس پر اپنی زبان کا جادو چلایا اور بتایا کہ عامل کسی کسی خوش قسمت کی مراد پوری کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ لڑکی کو اپنے جال میں پھانس کر اُس نے بے آبرو کیا اور اُسے یقین دلایا کہ اب تم جو چاہو گی وہ عامل نقشہ بندی کر دے گا۔

عامل نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ وہ جیل سے بھاگا ہوا قاتل ہے، اُس نے جہانسی جیل کا نام لیا۔ یہ چندہ سولہ سال پہلے کا واقعہ تھا۔ اُسے عمر قید کی سزا ملی تھی۔ ایک روز وہ جیل کے دفتر میں جسے ڈیوڑھی کہتے ہیں کھڑا تھا۔ اُسے کسی سرکاری سلسلے میں بلایا گیا تھا۔ اسنے میں جیل کا بڑا گیٹ راشن والی دستی ریہڑی کے لئے پورے کا پورا کھول دیا گیا۔ عامل نے جو اُس وقت عامل نہیں تھا، دروازہ کھلا دیکھا تو جوں ہی ریہڑی اندر آئی تو وہ تیر کی طرح دروازے سے باہر لٹکا اور اتنا تیز دوڑا کہ تعاقب سے پہلے ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جہانسی کے قریب ہی سے گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ اس جنگل میں درختوں سے ڈھکی بیٹھا چٹانیں تھیں جہاں کسی کا تعاقب بہت مشکل ہوتا تھا۔ رات کے وقت تو اس جنگل میں کوئی بھولے سے بھی نہیں پھٹکتا تھا کیونکہ وہاں وحاری دار شیر

اور بھڑپے کھوتے پھرتے رہتے تھے۔

عادل جیل اور پولیس کے لئے چھلواہ بن گیا پھر وہ سولہ سال گزر گئے لیکن اس کا نام و نشان نہ ملا۔ اس نے اپنے اقبالی بیان میں بتایا کہ جیسا عادل وہ بن چکا تھا ویسا ہی ایک عادل اسے فرار کے تیسرے سال مل گیا۔ اُسے ایسے آدمیوں کی ضرورت رہتی تھی جو جرائم پیشہ یا مفرور ہوں اور اُس کی کرامات کا پروپیگنڈہ ایسے طریقے سے کریں کہ لوگ اُس کے جال میں پھنس جائیں۔ یہ مفرور قاتل اس کی شاگردی میں بیٹھ گیا اور نو سربازی کے ڈھنگ سیکھ لئے۔ اُس نے داڑھی مونچھیں اور سر کے بال بے تحاشہ بڑھائے اور عاتلوں کی اصطلاحیں اور اداکاری بھی سیکھ لی تھی۔ اُس نے اس واقعہ کے سات آٹھ سال پہلے یہاں آن ڈیرہ بھایا اور اپنے استاد کی طرح دو چار جرائم پیشہ اپنے ساتھ ملائے۔

بھارت ہو یا پاکستان، لوگ اپنے مسائل اور حالات سے اس قدر مجبور ہوتے ہیں کہ یہی سہاروں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ جہاں انہیں کسی نئے پیر فقیر یا کسی شاہ صاحب یا عادل کا پتہ ملتا ہے وہ آٹھ دوڑتے اور اُس کے قدموں میں جا گرتے ہیں۔ یہ بھٹکے ہوئے اور فریب خوردہ لوگ اس نئے عادل کے ڈیرے پر پہنچنے لگے۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ اس شخص کا فراڈ اور اس کی نو سربازی کن ذرائع سے اور کن طریقوں سے کامیاب ہوتی رہی۔ بعض لوگوں کی مرادیں اتفاقیہ پوری ہوئیں تو اسے بھی انہوں نے اسی عادل کا کرشمہ سمجھا اور اُس کا خوب پرچار کیا۔ اس طرح ایک مفرور قاتل عادل نقشبندی بن گیا۔

اس شخص نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ اُس کے ایک کارندے نے ایک جوان لڑکی جس کی عمر بائیس بیس سال تھی اُس کے سامنے بٹھا دی۔ اس کے متعلق کارندے نے عادل کو پہلے کہا تھا کہ ایک تھوڑا پیش کر رہا

ہوں جس کا وہ ذائقہ چمک چکا ہے۔ عادل اُس وقت تک ایسی کئی لڑکیوں اور جوان عورتوں کے ساتھ کھل کھیل چکا تھا لیکن یہ لڑکی اُسے اتنی پیاری لگی کہ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے خواہ بھڑپے بنائے یا داشتہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھے گا۔ لڑکی غیر شادی شدہ تھی۔

عادل نے اُس سے پوچھا کہ وہ اُس کے پاس کیوں آئی ہے؟

”میں اپنے باپ کی تلاش میں آئی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔

”کیا تمہارا باپ لاپتہ ہو گیا ہے؟“

”ہاں یہ ہے کہ میرا باپ قتل کے جرم میں گرفتار ہوا تھا۔“ لڑکی نے کہا۔ ”اُسے عمر قید سزا ہوئی تھی۔ ایک روز پولیس نے ہمارے گھر میں داخل ہو کر سارے گھر کی تلاشی لی اور میری ماں کو تھانے لے جا کر مارا چپا۔ ہمیں بتایا گیا کہ میرا باپ جہانسی جیل سے بھاگ گیا ہے۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”میں اُس وقت بچی تھی۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”میری عمر پانچ چھ سال تھی۔ مجھے قتل کا واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔“

”تمہارے باپ نے کسے قتل کیا تھا؟“

”وہ جنگل کے ٹھکے کا ملازم تھا۔“

”اُس کا نام کیا تھا؟“

”کریم الدین۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”اُسے ”کاما، کاما“ کہتے تھے۔“

عادل کو بڑی زور کا دھچکا لگا۔ اُس نے لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پوچھا۔ ”وہ جنگل کے ڈاک بنگلے کا چوکیدار تھا؟“

”آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہمیں کیا معلوم نہیں۔“ عادل نے کہا۔ ”کہو تو

رات کو ڈاک بنگلے میں گئی۔ میرا باپ وہاں ڈیوٹی پر تھا اُس نے اُس عورت سے کہا کہ وہ واپس چلی جائے۔ عورت رو پڑی اور بولی کہ صاحب کا حکم نہ مانا تو کہاں جائیں گے؟ وہ روتی ہوئی ڈاک بنگلے میں صاحب کے کمرے میں چلی گئی۔ صاحب اپنے آپ کو جنگل کا بادشاہ سمجھتا تھا۔ اُس نے دروازہ اندر سے بند نہ کیا۔ اُس نے سب سے پہلے عورت کو شراب پلائی۔ جب صاحب نشے کی حالت میں اس عورت کے ساتھ بے ہودہ حرکتیں کرنے لگا تو میرا باپ اندر چلا گیا۔ اس کے پاس جھگے کی دی ہوئی راتفل بھی اُس نے صاحب کو گولی مار دی لیکن بھاگا نہیں وہیں بیٹھا رہا۔ آدمی رات کے بعد دوسرے ملازموں کی اطلاع پر پولیس آئی اور وہ پکڑا گیا۔ میرا باپ جتنا غیرت مند تھا، میں اور میری ماں اتنے حق بے غیرت ہو گئے ہیں۔

کریم الدین اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے کارندے کو آواز دی۔ کارندہ آیا تو کاسے نے اُس سے پوچھا کہ یہ ہے وہ شخص جس کا تم نے ذائقہ چمکا ہے؟ اس جرائم پیشہ کارندے نے مستانہ سے لہجے میں جواب دیا کہ ہاں بھئی وہ شخص ہے۔ کاسے نے اپنے جفن کے اندر ہاتھ ڈالا اور پوچھو لال کر اس کارندے کو نیچے بعد دیکرے دو گولیاں مار دیں۔ لڑکی کی چیخ نکل گئی اور وہ خوفزدہ ہو کر باہر کو بھاگی۔ کاسے نے لپک کر اسے پکڑ لیا، لڑکی نے جھانا شروع کر دیا۔

”ظہر جا لڑکی!“ کریم الدین نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگا کر کہا۔ ”میں ہوں تمہارا وہ باپ جسے تم ڈھونڈ رہی ہو۔“

اُس نے اپنی بیوی کا، اُس کے باپ کا اور اپنے گاؤں کا نام لیا۔

لڑکی کی حالت ایسی ہو گئی جیسے وہ فحش کھا کر مر پڑے گی۔ کریم الدین عرف کاسے نے اُسے اپنے

تمہارے گھر کی ساری باتیں بتا دیں۔ لڑکی نے بڑے ”آپ کچھ بھی نہ بتائیں۔“ لڑکی نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا اور مال کا ہاتھ چوم کر بولی۔ ”آپ مجھے یہ بتادیں کہ میرا باپ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ اگر زندہ ہے تو بتادیں کہ وہ کہاں ہے۔ یہ بھی بتائیں کہ میں اور میری ماں اُس تک پہنچ سکتی ہیں یا نہیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ آپ نے مجھ سے نقد نذرانہ مانگا تو شاید میں پوری رقم نہ دے سکوں۔ ہم ماں بیٹی بہت غریب ہیں۔ مجھے اپنی لوٹری سمجھ لیں، آپ کا ہر حکم بجالاؤں گی۔“

عال نقشبندی جو دھاصل کریم الدین عرف کا تھا، تڑپ اٹھا۔ اُس نے اپنے اقبال بیان میں کہا کہ اُسے یاد آ گیا کہ اُس کے ایک خاص کارندے نے کہا تھا کہ وہ اس شخص کا ذائقہ چمکا ہے۔

”مجھے سچ بتاؤ لڑکی!“ کاسے نے لڑکی سے پوچھا۔ ”میرے جس آدمی نے تمہیں مجھ تک پہنچایا ہے، اُس نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟“

”اُس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”آپ نہیں جانتے کہ میں اور میری ماں کس طرح زندگی بسر کر رہی ہیں۔ میری ماں ایک بڑے گھر میں نوکرائی ہے۔ کبھی کبھی مجھے بھی اُس گھر سے بلاوا آتا ہے اور مجھے اس گھر کے بڑے بیٹے کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ اسی لئے میں اپنے باپ کی تلاش میں نکلی ہوں۔ وہ کہیں مل جائے تو ہماری عزت کا محافظ بنے۔ میرا باپ بد معاش چور یا ڈاکو نہیں تھا۔ اُس نے جنگل کے ایک ہندوستانی افسر کو اس لئے قتل کیا تھا کہ اُس افسر نے جنگل کے ملازم کی جواہن بیوی کو حکم دیا تھا کہ وہ ڈاک بنگلے میں اُس کے پاس آئے۔ اس کا خاندان نوکری سے جواب ملنے کے ڈر سے چپ رہا۔ میرے باپ کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ اُس ملازم کی بیوی

کیا۔
 ”اچھی طرح دیکھ لو بیٹی!“ رضوی نے زربینہ سے
 کہا۔ ”کیا یہی تھا وہ عامل؟“
 زربینہ نے سر ہلا دیا کہ یہی تھا۔
 ”اسے کہو کہ اس کے ہاتھ میں کسی اُلے سیدھے علم
 کی طاقت ہے تو اس جھکڑی کو توڑ دے۔“ رضوی نے
 زربینہ سے کہا کہ کریم الدین عرف کا مانس پڑا اور بولا۔
 ”میرا کھیل ختم ہے۔“

رضوی زربینہ اور فہیم کو واپس لے آیا اور زربینہ کو بتایا
 کہ یہ کیا نو سربازی تھی اور یہ بھی کہا کہ قرآن حکیم اور
 ’یارجم یا کریم‘ کا کرشمہ تم نے دیکھ لیا ہے۔ اس روز سے
 زربینہ اپنی اصلی حالت میں واپس آنے لگی اور چند روز
 بعد وہ بالکل نارمل ہو گئی۔

مقدمے کی سماعت روز بروز ہوتی رہی اور بھوپال
 کے دیہاتیوں کے عامل نقشبندی کو سزائے موت کی
 بجائے عمر قید دی گئی لیکن اُسے پہلی عمر قید کی سزا جس سے
 وہ فرار ہوا تھا پہلے پوری کرنی تھی اس کے بعد دوسری عمر
 قید کی سزا کو شروع ہونا تھا۔ فرار کی سزا جو آٹھ سال تھی وہ
 الگ تھی۔ اس کے ساتھ زیادتی یہ ہوئی کہ فیصلے میں لکھا
 گیا کہ یہ سب سزائیں ایک دوسری کے بعد پوری کی
 جائیں گی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کو باقی عمر جیل
 میں گزارنی تھی۔

اور جب میں نامہ جیل میں جاسوسی کے الزام
 میں بند تھا وہ عامل نقشبندی جس کا نام کریم الدین
 عرف کا تھا، نامہ جیل میں قادری صاحب کہلاتا تھا
 اور جیل کا تمام عملہ اور قیدی اُس کی بہت تعظیم کرتے
 تھے۔ میرے ساتھ پہلی ملاقات میں اُس نے مجھے کہا
 تھا کہ رات سونے سے پہلے ’یارجم یا کریم‘ ایک سو
 مرتبہ پڑھ لیا کرو۔



ساتھ لیا۔ ریو اور اپنے چنے میں ڈالا اور بھوپال شہر میں آ
 گیا۔ اسے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ بھوپال سے وہ گاڑی
 میں بیٹھا اور اس شہر میں پہنچ گیا۔ اُس نے اپنے اقبالی
 بیان میں کہا کہ اُس نے غیرت کے جوش میں آ کر ایک
 ایسی عورت کی عزت کے پیچھے جو اُس کی کچھ بھی نہیں لگتی
 تھی اپنے گھمے کے ایک افسر کو مار ڈالا تھا۔ یہ تو اس کی
 اپنی بیٹی تھی۔ میں نے پہلے تو یہ ارادہ کیا تھا کہ اپنے آپ
 کو بھی گولی مار لوں کیونکہ اپنی بیوی اور جوان بیٹی کی
 ذلت اور رسوائی کا مجرم میں ہی تھا لیکن مجھے ایک خیال آ
 گیا کہ گورنمنٹ نے میری گرفتاری کے لئے دس ہزار
 روپیہ انعام مقرر کیا تھا۔ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ
 مجھے میری بیٹی نے گرفتار کروایا ہے۔ میں تو پھانسی کے
 تختے پر جا رہا ہوں۔ انیس دس ہزار مل جاتے ہیں تو میری
 بیوی میری بیٹی کو کہیں پیادہ دے گی اور ان کا کچھ سہارا بن
 جائے گا۔“

اُس زمانے کا دس ہزار روپیہ آج کے سوا لاکھ
 کے برابر تھا۔ ایس بی انگریز تھا اسے کا مے اور اس کی
 بیٹی پر ایسا ترس آیا کہ اُس نے کانغدون میں کا مے
 کی گرفتاری اس طرح لکھوائی جیسے کا مے نے اپنے
 آدمی کو قتل کیا اور اپنے گاؤں چلا گیا اور اس کی بیٹی
 نے پولیس کو رپورٹ کر کے اسے گرفتار کروادیا۔ اس
 طرح اس کی بیٹی کو دس ہزار روپے انعام کا حقدار قرار
 دے دیا۔

جب کا مے کا کیس کورٹ میں چلا تو ایک پیشی پر
 رضوی نے فہیم سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے آئے۔
 فہیم بیوی کو ساتھ لے گیا۔ رضوی ڈی سی آفس کا
 سپرنٹنڈنٹ تھا۔ پولیس پر اُس کا حکم چلتا تھا۔ وہ فہیم اور
 زربینہ کو اپنے ساتھ کورٹ میں لے گیا۔ کریم الدین
 جھکڑیوں میں وہاں برآمدے میں دو کاشیلوں کے
 ساتھ کھڑا تھا۔ رضوی نے زربینہ کو اُس کے سامنے اکھڑا

شخصیات

خوش تر اوصاف شخصیت

حاجی محمد رمضان چشتی نے عوام کے لئے صاف پانی کے دو پلانٹ لگوائے

☆..... ابو خالد الحاج محمد رفیع ہاشمی جھیری

ہر ذی شعور انسان کا یہ مکمل ایمان ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا بلکہ راقم کا تو یقین کامل ہے کہ اللہ ابد تک تو کیا بلکہ ہمیشہ رہے گا۔ ابد تک کہہ کر اس کا قائم رہنا تو محدود ہو جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات تو لامحدود ہے اور وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے کہ اللہ کریم 6 پیم میں پوری کائنات کو بنا کر اپنے تخت پر جلوہ گر ہوا۔ قرآن کریم کی سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 30 اور سورہ حجر کی آیت نمبر 29 سے ہمیں آگاہی ملتی ہے کہ جب اللہ کریم نے دنیا آباد کرنا چاہی تو فرشتوں کو اکٹھا کر کے فرمایا "الہی جاعل فی الارض خلیفۃ" کہ میں (یعنی اللہ پاک) زمین میں انسان کو اپنا نائب مقرر کرنا چاہتا ہوں۔

راقم تو خلیفہ کا ترجمہ نائب کی بجائے نمائندہ کرتا ہے کیونکہ نائب سے کچھ اور مطلب بھی نکل سکتا ہے۔ تو فرشتوں نے عرض کی کہ اے اللہ کیا ہم تیری پاکی بیان کرنے کے لئے کافی نہیں؟ انسان تو زمین میں فساد پر پا کرے گا (آیت نمبر 30 سورۃ البقرہ)۔ اگر آج کل کی دہشت گردی، بم دھماکوں، خودکش حملوں، ٹارگٹ کلنگ میں خونریزی کے تناظر میں دیکھا جائے تو راقم کروڑ ہا بار اپنے رب سے معافی طلب کرتے ہوئے یہ کہنے کی

جسارت کرتا ہے کہ فرشتوں کے تحفظات بھی غلط نہ تھے۔ اللہ پاک نے فرشتوں سے فرمایا انی اعلم مالا تعلمون کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (آیت نمبر 30 سورۃ البقرہ)۔ فرشتوں نے عرض کی کہ اے اللہ بیشک تُو بہتر جانتا ہے ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تُو نے ہمیں علم عطا کیا ہے۔ (آیت نمبر 32 سورۃ البقرہ)

خدائے ذوالجلال نے آخر حضرت آدم علیہ السلام کو آب و خاک سے تخلیق فرمایا اور اس سے قبل اللہ پاک نے جنات کو آگ کی لو سے پیدا کیا۔ جیسا کہ سورۃ الرحمن کی آیت نمبر 15 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وخلق الجنان مین مارج من نار جب اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کے پتکے میں روح پھونکی تو راقم کو یقین ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ کہتے ہوئے حالت زبیت میں آگئے ہوں گے۔ جب اللہ کریم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا مگر ابلیس نے جس کا آسمانوں پر نام عزائیل تھا، حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ ایک طرف تو فرمان الہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے سوا کسی کو سجدہ روا نہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کریم

خود ہی اپنے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا حکم دے کیونکہ قرآن پاک ہمیں بتاتا ہے کہ لا تبدیل لکلمات اللہ یعنی اللہ کریم کے احکامات تبدیل نہیں ہو سکتے (سورہ یونس آیت نمبر 64) بہت سے حضرات نے دیکھا ہوگا کہ جب سنا سونے کے زیور میں کچھ بہتری لانے کے لئے ایک موم بتی جلا کر ایک پھونکنی سے جس کا ایک سرانہایت باریک اور دوسرا سر اقدار سے بڑا منہ سے لگا کر باریک حصہ جلتی ہوئی موم بتی کے شعلے میں رکھ کر پھونک مارتا ہے تو اس شعلے سے آگ نکل کر سونے کے زیور پر پڑتی ہے تو وہ چمک اٹھتا ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ کریم نور ہے۔ جب اللہ پاک نے اپنے نور مبارک سے حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے میں روح پھونکی ہوگی تو اللہ کریم کا ذاتی نور مبارک حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے میں داخل ہو گیا۔ جہاں تک راقم کی فہم و فراست کام کرتی ہے اللہ کریم کا حضرت آدم علیہ السلام کے مٹی سے بنے پتلے کو سجدہ کروانا مقصود نہ ہوگا بلکہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے اس ذاتی نور مبارک کو کروانا تھا جو خدائے ذوالجلال کے نور پاک سے نکل کر حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے میں داخل ہوا مگر مغرور ابلیس اس راز کو نہ سمجھ سکا اور اس نے تکبر کیا۔

اگر انسانوں اور جنات کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کیا جائے تو انسانوں کو مٹی اور پانی سے تخلیق کیا گیا اور جنات کو آگ کے شعلے سے تو یہ بات عیاں ہوگئی کہ جب آگ جلائی جائے تو اس کا شعلہ اوپر کو سر اٹھاتا ہے جو غرور اور تکبر کی نشانی ہے لیکن مٹی جب بھی گرتی ہے تو وہ نیچے کی جانب آتی ہے جو کہ عاجزی اور انکساری کا مظہر ہے۔ مٹی کو خواہ اوپر کی جانب ہی کیوں نہ اچھالا جائے تو وہ پھر بھی نیچے کی طرف ہی گرے گی جیسے کہ مٹی سے بنا انسان اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتا ہے۔

جب اللہ کریم نے ابلیس سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کر کے اپنی حکم عدولی کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ مجھے ٹوٹنے آگ سے پیدا کیا جبکہ آدم کو مٹی، گارے سے۔ میں اس سے اعلیٰ ہوں میں اپنے سے کمتر کو سجدہ کیوں کروں۔ سورہ حجر آیت نمبر 33 جیسا کہ قرآن کریم کی سورہ طہ کی آیت نمبر 116 میں بیان ہے کہ اس پر اللہ کریم نے اسے ملعون قرار دیتے ہوئے حکم دیا کہ تم راندہ درگاہ ہو اور نکل جاؤ عرش معلیٰ سے۔ سورہ حجر آیت نمبر 34 میں اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اے آدم تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو اور جو چاہو کھاؤ پیو مگر ایک درخت کے قریب جانے اور اس کا پھل کھانے سے منع فرمایا (القرآن آیت نمبر 35 البقرہ)۔ شیطان کو عرش معلیٰ سے ملعون قرار دے کر نکالنا اور حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کریم کی جانب سے جنت عطا کرنا شیطان کو کھٹکنے لگا اور یہی بات اس کی حضرت آدم علیہ السلام سے دشمنی کا سبب بنی۔ اسی حسد کی وجہ سے وہ اس کوشش میں لگا رہا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوائے اور آخر کار (سورہ طہ آیات نمبر 116 تا 120) اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے بہکاوے میں پھنسا لیا تو ان سے شجر ممنوعہ کے قریب جانے اور اس کا پھل کھانے کا سہو ہو گیا جس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کریم کے حکم کے تحت جنت سے لگنا پڑا۔

انتظار بسیار کے بعد جب حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت محمد کا واسطہ دے کر اپنے سہو کی معافی چاہی تو اللہ کریم کو اپنے بندے پر رحم آگیا اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی اسے یہ دعا "رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَ ان لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا وَ لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ" (القرآن) سکھا کر حضرت آدم علیہ السلام کو معاف فرما دیا (سورہ طہ آیت نمبر 122)۔

آغاز سے لے کر اب تک راقم نے اللہ کریم کے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنانے کا ارادہ، فرشتوں سے

جب اللہ کریم نے ابلیس سے حضرت آدم علیہ

تبخیر معدہ کے مایوس مریض متوجہ ہوں
مفید ادویات کا خوش ذائقہ مرکب

ریمینال شربت

تبخیر معدہ اور اس سے پیدا شدہ عوارضات
مثلاً دائمی قبض، گھبراہٹ، سینے کی جلن، نیند کا
نہ آنا، کثرت ریح، سانس کا پھولنا، تیزابیت
معدہ، جگر کی خرابی اور معدہ کی گیس سے پیدا
ہونے والے امراض کے لیے مفید ہے۔

اپنے قریبی دوا فروش سے طلب فرمائیں

نوٹ

تبخیر معدہ و دیگر امراض کے طبی مشورے کے لئے



ممتاز مطب

سے رابطہ فرمائیں

ممتاز دوا خانہ (رجسٹرڈ) میانوالی

فون: 233817-234816

اس پر تحفقات کا اظہار، آدم علیہ السلام کی تخلیق، فرشتوں
کو آدم کو سجدہ کرنے کا اللہ کا حکم، شیطان کی نافرمانی اور
راندہ درگاہ ہو جانے کا تذکرہ کیا ہے اور اجزائے ترکیبی
کے لحاظ سے انسانوں کا جنات سے خصال کا موازنہ کیا
ہے۔ بیشک اللہ کریم نے انسان کو بہترین شکل شہادت
میں پیدا کیا اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو اللہ کریم کی
اس بہترین تخلیق کا کسی اور مخلوق سے موازنہ بننا ہی نہیں۔
اللہ کریم نے انسانوں ہی میں سے انبیاء و رسل مبعوث
فرمائے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے
"تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ" یعنی
انبیاء و رسل میں بھی بعض کو کچھ معاملات میں بعض پر
فضیلت عطا فرمائی۔

اسی طرح انسانوں میں بھی کچھ کو بہترین اوصاف
عطا فرمائے جو کہ باوجود خوشحالی اور بہتر حالات کے اپنے
رب کے احسانات نہیں بھولے اور وہ اپنے رب سے
ڈرتے اور شکر گزار بندے بنے رہے۔ ان خوشتر اوصاف
لوگوں میں سے ایک جن سے راقم کے تعلقات تقریباً دو
دہائیوں پر محیط ہیں وہ نہایت ہی محترم شخصیت ہے۔ حاجی
محمد رمضان چشتی جن کو اللہ کریم نے نہایت اعلیٰ اقدار سے
نوازا ہے جو کہ سخیل مالک، پوش علاقے میں ایک اچھے
گھر اور دیگر سہولیات کے مالک ہونے کے باوجود نہایت
مٹے ہوئے، انکساری کے پیکر اور درویش منش انسان
ہیں۔ ان کو اللہ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ یہ
ایک نہایت خوش الحان نعت خواں اور ایک بہت ہی مشہور
نعت گو اور نعت خواں جناب عبدالرشید چشتی صاحب کے
فرزند ہیں۔ رواداری، صلہ رحمی، فلق خدا کی خدمت،
ہمدردی اور غمخواری ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ شہر کے
چچ جو نہر گزرتی ہے اس میں کبھی کبھار کاریں وغیرہ گر جاتی
تھیں جس سے جانی نقصان بھی ہو جاتا تھا، حاجی صاحب
نے ان حادثات سے بچاؤ کے لئے نہر کے پشتوں پر آہنی

جگے لگائے۔ چنگ بازی کے باعث بچوں اور بڑوں کی ہلاکتیں ان کے لئے سوہان روح تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر چنگ بازی اور کیمیکل ڈور کے خلاف آواز اٹھائی اور اس پر پابندی کے لئے تحریک چلائی جس کے لئے وہ ہائی کورٹ تک پہنچے۔ اس تحریک میں راقم نے بھی کچھ حد تک حصہ لیا۔ کچھ لوگ حوام الناس کے علاج معالجہ کے لئے ہسپتال بنا رہے تھے لیکن حاجی رمضان صاحب سوچتے اور چاہتے تھے کہ کچھ ایسا کام کیا جائے کہ لوگ بیمار ہی نہ ہوں۔

آلودہ پانی پینے سے لوگوں کا مہلک بیماریوں میں مبتلا ہونا جن میں خصوصاً ہیپاٹائٹس شامل ہے، ان کو بے چین کر دیتا جس کے تذکرے کے لئے انہوں نے ٹھان لی۔ سب سے پہلے ہادامی باغ میں فلٹرز منرل واٹر کا پلانٹ لگا کر لوگوں کے لئے فی سبیل اللہ پانی مہیا کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ جن لوگوں کے پاس کین نہ تھے انہیں کین بھی بلا قیمت فی سبیل اللہ مہیا کئے۔ حاجی صاحب کے ایک شاغ ممبر قاری محمد سعید خان صاحب نے جوڑے پل کے قریب کی آبادیوں میں بھی آلودہ پانی کی وجہ سے لوگوں کی زبوں حالی کا رونا روایا تو حاجی صاحب نے وہاں پر بھی ایک فلٹرز منرل واٹر پلانٹ لگا دیا اور لوگوں کی بے حد دعا میں لے رہے ہیں۔

حاجی صاحب نعت خوانی کا کوئی نذرانہ وغیرہ نہیں لیتے نہ صرف تمام رفاہی کاموں میں کسی سے چندہ وغیرہ بھی اکٹھا نہیں کرتے بلکہ منرل واٹر پلانٹ بھی لاکھوں روپے اپنی جیب سے خرچ کر کے لگوائے ہیں۔ ابو بن ادھم کے بارے میں زمانہ طالب علمی میں پڑھی ہوئی انگریزی نظم کی یاد راقم کے ذہن میں چل رہی ہے۔ حضرت ابو بن ادھم ایک اللہ والے بزرگ گزرے ہیں لیکن خلق خدا کی خدمت ان کا شعار تھا۔ ایک رات انہوں نے دیکھا کہ کوئی ان کے بیڈ روم میں بیٹھا کچھ لکھ رہا

ہے۔ پوچھا تم کون ہو اور کیا کر رہے ہو۔ جواب دیا کہ میں فرشتہ ہوں اور لہرست بنارہا ہوں۔ پوچھا کن لوگوں کی لہرست بنا رہے ہو۔ کہا کہ ان لوگوں کی جو اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ پوچھا کیا میرا نام ہے تو فرشتے نے جواب دیا کہ نہیں اور چلا گیا۔ کچھ دن بعد پھر حضرت ابو بن ادھم نے ایسا ہی منظر دیکھا کہ کوئی ان کے کمرے میں موجود کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا کون ہو جواب ملا کہ فرشتہ۔ پوچھا کیا کر رہے ہو۔ کہا کہ لہرست بنارہا ہوں ان لوگوں کی جو اللہ کی مخلوق سے محبت کرتے ہیں اور ان کی خدمت کرتے ہیں تو اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ پوچھا کیا میرا نام ہے تو فرشتے نے جواب دیا کہ آپ کا نام سر لہرست ہے اور چلا گیا۔ تو ثابت ہوا کہ خلق خدا کی خدمت کر کے بندہ اللہ کی محبت حاصل کر لیتا ہے جو کہ کتنے اعزاز کی بات ہے اور یہ کتنا بڑا انعام ہے۔

راقم کوئی درباری قصیدہ گو یا چاہیوں انسان نہیں ہے۔ اگر اللہ کریم نے کسی انسان کو اوصاف حسنہ سے نوازا ہو تو انہیں اجاگر کرنا اور بیان کرنا اور تعریف کرنا کوئی معیوب بات نہیں بلکہ یہ تو اوصاف حسنہ عطا کرنے والے خالق اور مالک کی ہی تعریف ہے۔ اس تحریر سے راقم کی منشاء صرف یہی ہے کہ دیگر اہل ثروت صاحبان بھی حاجی رمضان صاحب کی تقلید کرتے ہوئے مخلوق خدا کی خدمت کے لئے میدان میں آئیں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ میں اکیلا نکلا تھا لوگ ملتے گئے کارواں بن گیا۔ اس طرح مجبور اور ضرورت مند بندگان خدا کے آلام و مصائب ختم ہو جائیں تو ہمارا ملک جنت ارضی بن جائے گا۔ آمین!

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انساں کو
دردِ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کردیاں



گپ کا گھاگ

”سہما! یقین کرو میں تمہارے ساتھ ضرور نکاح کر لیتا۔“
ایک دن زمان خان نے کہا۔ ”لیکن میری کچھ مجبوری ہے۔“
میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میری اولاد جوان ہے۔“

عبداللطیف بھٹو



نام کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔ آئندہ تم مجھے اس قسم کی فضول باتیں مت سنایا کرو۔

”میرے سرتاج! ایک نہ ایک دن تم ضرور پچھتاؤ گے۔“ عارف رضا کی سعادت مند بیوی اپنے خاوند کی الٹی سیدھی اور بے ٹکی قسم کی باتیں سن کر کہتی۔ ”اور اس وقت تمہیں میری باتیں ضرور یاد آئیں گی۔ یاد رکھو، وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ اگر آج اچھے دن ہیں تو کل کو بُرے دن بھی آ سکتے ہیں۔ انسان کو اپنی زندگی میں میانہ روی اختیار کرنی چاہئے۔ ہمارے دین میں بھی فضول خرچی کی ممانعت ہے۔“

عارف رضا لاہور شہر کی ایک جدید قسم کی آبادی میں ایک عالی شان کوٹھی میں رہائش پذیر تھا۔ اس کا مختصر سا کنبہ تھا۔ بیوی جس کا نام سیما تھا۔ ان کی ایک لڑکی جس کی عمر تقریباً پانچ چھ سال ہوگی وہ ایک عرصے سے کالے بریقان کی مریضہ تھی اور دو لڑکے ایک کی عمر چار سال اور دوسرے کی عمر دو سال۔

عارف رضا کی ایک اویڑ عمر ماں تھی جو اوائل عمر میں ہی بیوہ بن چکی تھی۔ اس کا خاوند اسے چھوڑ کر انگلینڈ چلا گیا تھا۔ اس کے بطن سے صرف ایک لڑکا عارف رضا تھا جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتا۔ عارف کی معمر نانی ماں بھی ان کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ کچھ عرصہ آگے چل کر عارف کی ماں نے اپنے خاندان کے ایک شخص سے نکاح کر لیا۔ جس کو عارف رضا کے ماموں یعنی ماں کے سگے بھائی پسند نہ کرتے اور اپنا شریک سمجھتے تھے۔ وہ چال چلن کا بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ عارف رضا اور اس کے ماموں کو یہ سخت ناگوار گزارا۔ عارف رضا کے دونوں ماموں عرصہ دراز سے بعد اہل و اعیال امریکہ میں مقیم تھے۔ عارف کی ماں نکاح کے بعد اس کو چھوڑ کر اپنے خاوند کے گھر چلی گئی۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس کی نانی ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔

عارف رضا بچے کے لحاظ سے گورنمنٹ لے کلاس کا کنٹرکٹر تھا۔ وہ بڑا خوش لباس اور خوش خوراک تھا۔ دیے کہنے کو تو وہ ٹھیکیدار تھا لیکن اپنی چال ڈھال بول چال اور عادات اور شکل و صورت سے بالکل نواب زادہ ہی لگتا تھا۔ وہ ”آج“ پر یقین رکھتا تھا۔ ”کل“ کو بالکل نہیں مانتا تھا۔ اس کی فضول خرچی کا یہ عالم تھا کہ اس نے گھر کی ضرورت کے لئے اگر بازار سے کوئی معمولی چیز بھی خریدنا ہوتی تو وہ ہزار اپنی گاڑی پر بی جاتا۔ اس کی شاہ خرچیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ گھر سے اپنی جیب میں جتنے بھی پیسے لے کر لگتا جب تک وہ ختم نہ کر لیتا واپس گھر نہ آتا۔ جب وہ گھر آتا تو اس کی جیب خالی ہوتی۔ اس کی بیوی اس سے اکثر بحث مباحثہ کرتی کہ انسان کو بُرے ذہن کے لئے کچھ نہ کچھ تو بچا کر رکھنا چاہئے۔ وہ جواب میں بڑے فخر اور غرور سے کہتا۔ ”باہر بہ پیش کوٹھ، عالم دو ہارہ نیست۔“ بیوی جو باہانس کر کہتی۔

”یہ ضرب الشل بادشاہوں یا پھر بڑے بڑے امیر کبیر لوگوں پر تو صادق ہو سکتی ہے ایک عام شخص پر اس کا اطلاق ممکن نظر نہیں آتا۔“

عارف رضا اس صورت میں غصے سے جھڑک کر اپنی بیوی کو کہتا کہ تم مجھے اس قسم کی چھوٹی چھوٹی اور دقیانوسی قسم کی باتیں مت سنایا کرو۔ میرا حوصلہ بڑھانے کی بجائے پست کرتی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ سکندر اعظم جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو کیا وہ اپنی دولت اپنے ساتھ قبر میں لے کر اتر گیا؟ نہیں، وہ خالی ہاتھ قبر میں اتر۔ تمہاری سوچ فکر اور حرکات ایک عام سی گھریلو قسم کی عورت جیسی ہیں جس کو میں ہرگز نہیں مانتا۔ یہ بات جان لو کہ میں ہر وہ کام کروں گا جو میری مرضی ہوگی۔ انسان دنیا میں ایک بار آتا ہے تو پھر کیوں نہ وہ اپنی زندگی کا بھرپور مزالے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ عورتوں میں دانائی

شکار ہو جاتے ہیں۔ جب زمان خان کو پتہ چلا کہ اس کے دوست کی مالی حالت خاصی کمزور ہو چکی ہے تو اسے پریشانی ہوئی لہذا اس نے اس کی مدد کے لئے ایک راہ نکالی۔ زمان خان کی بہن کا ایک پلاٹ تھا۔ زمان خان کا بہنوئی کویت میں ملازمت کرتا تھا۔ اس نے مکان تعمیر کروانا تھا لہذا اس نے زمان خان کو کہا تھا کہ کسی ٹھیکیدار کو تلاش کرو۔

اپنے بہنوئی اور بہن کا مکان تعمیر کرنے کے سلسلہ میں زمان خان نے سوچا کہ اس مکان کی تعمیر کا کام عارف رضا کے سپرد کرتے ہیں۔ اس طرح اس کی مالی مدد بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ زمان خان نے عارف کو اپنے گھر لایا اور اپنی بہن کے مکان کی تعمیر کا کام اس کے سپرد کر دیا اور ساتھ ہی اس کو پچاس ہزار کی رقم بھی ادا کر دی کہ وہ اس پیٹلی رقم سے مکان کی تعمیر کا کام اس ہفتے کے اندر اندر شروع کر دے۔ ہاں اگر اسے اس سلسلے میں مزید رقم کی ضرورت پڑے تو وہ بھی فوراً ادا کر دی جائے گی۔ عارف رضا یہ سب کچھ جان کر بہت خوش ہوا اور اپنے دوست زمان خان کا شکر گزار بھی ہوا کہ اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی ہے۔

دوسری طرف زمان خان کے دوستوں کو جب یہ پتہ چلا کہ اس نے اپنی ہمیشہ کے مکان کی تعمیر کا کام عارف رضا کے سپرد کیا ہے تو وہ حیران رہ گئے اور چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ زمان خان کا یہ فیصلہ کوئی دانشمندانہ فیصلہ نہیں، اللہ بہتر کرے۔ زمان خان عارف کے متعلق اس قسم کی باتیں سن کر قدرے پریشان ہو گیا کہ کہیں ان کی باتیں سچ نہ ہوں۔ وہ تو اپنے دوست کی ایک طرح کی مدد کرنا چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی مالی حالت سنور جائے اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو بلکہ اپنے پاؤں پر پھر سے کھڑا ہو جانے کے قابل ہو جائے۔

زمان خان نے کسی کی پروا کئے بغیر عارف رضا کو

پھر وقت نے اپنی چال بدل لی اور اس چال کی زد میں عارف بھی آ گیا۔ اس کے حالات خراب ہونے لگے۔ آمدنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی مگر اس کی شاہ خرچیاں جاری رہیں۔ اس طرح تو بادشاہوں کے خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ یہی عارف کے ساتھ بھی ہوا۔ صبح و شام ماہ و سال گزرتے رہے دیکھتے ہی دیکھتے عارف رضا کی خوشحال زندگی نہایت ہی عسرت اور کمپرسی میں بدل گئی اور اس کا زوال شروع ہو گیا۔ عارف کی مالی حالت دن بہ دن بدتر ہوتی چلی گئی۔ کوئی جمع پونجی تو اس کے پاس نہ تھی جو کچھ یا پھر جہاں کہیں سے بھی اسے روپیہ پیسہ آتا وہ بند ہو گیا۔ اسے نرے دلوں کا وہم و گمان تک نہ تھا۔

کچھ عرصہ تک تو اچھا زمانہ وقت گزرتا رہا پھر آگے چل کر اس نے اپنے گھر کا مکن چلانے کے لئے اپنی کار فروخت کر دی۔ کچھ وقت گزرا یہ پیسے بھی ختم ہو گئے۔ حالات نے اسے مزید مجبور کیا پھر اس نے آہستہ آہستہ گھر کا قیمتی سامان مثلاً فریج، اسے سی فریج پر تک بیچ دیا۔ وقت یوں ہی اچھا زمانہ گزرتا رہا۔

عارف کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اس پر نہ وقت بھی آ سکتا ہے۔ وہ جو بھی اپنی بیوی کی باتوں پر غور کرتا تو پھر آنسو بہاتا کہ کاش وہ اس کی باتیں مان کر مکمل کرتا تو پھر شاید اسے یہ وقت دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ویسے بھی گزرا ہوا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا اور انسان اپنے کئے پر شرمندہ اور تادم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی کچھ عارف کے ساتھ ہوا۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی ہی رحیم و کریم ہے۔ وہ اپنے بندے کے لئے کوئی نہ کوئی سبب بنا ہی دیتی ہے۔ عارف رضا کا ایک بھین کا دوست تھا جس کا نام زمان خان تھا، ایسے حالات میں دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔ بھائی، بہن، رشتہ دار یہ سب رشتے ناٹے کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ پھوٹ کا

رضا سے شکایت کی کہ وہ کام پر پابندی سے کیوں نہیں آتا۔
تو عارف نے اپنی بیٹی کی بیماری کا بہانہ بنا کر کہا کہ وہ بیٹی
کے ساتھ ہسپتال گیا تھا۔
"ایسی بات نہیں۔" زمان نے کہا۔ "تم جھوٹ
بولتے ہو یہ بہت بُری بات ہے میں نے تم پر اعتماد کر کے
ہمیشہ کے مکان کی تعمیر کا کام تمہارے سپرد کیا ہے کہیں تم
مجھے شرمندہ نہ کروانا۔"

عارف یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ حالات و واقعات
کیسے بھی درپیش ہوں۔ انسان اپنی فطرت کے ہاتھوں
مجبور ہے۔ وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو فطرت اسے کہتی
ہے۔ آہستہ آہستہ عارف رضائے کام پر آنا چھوڑ ہی
دیا۔ اس بات کا علم زمان خان کو بھی ہو گیا۔ دوستی یاری کا
معاملہ تھا وہ عارف کے ساتھ سخت رویہ بھی اختیار نہ سکتا
تھا۔ زمان خان خاصا پریشان ہو گیا تاہم اس نے عافیت
اسی میں سمجھی کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ زمان خان نے دل ہی
دل میں خیال کیا کہ عارف رضا کو ایسا ہرگز نہیں کرنا
چاہئے تھا۔ وہ تو اس کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے
عارف نے یہ سب کچھ کس مجبوری کے تحت کیا۔ اتنے یہ
بھی خیال آتا کہ جب اس نے عارف کو مکان کی تعمیر کا
کام سپرد کیا تھا تو اس کے دوستوں نے اسے ٹھیک ہی کہا
تھا کہ زمان خان نے عارف پر اعتماد کر کے کوئی درست
فیصلہ نہیں کیا۔ حالات کو سمجھتے ہوئے زمان خان اس نتیجے
پر پہنچا کہ اب وہ خود مکان کی تعمیر کروائے گا۔ بصورت
دیگر اگر اس کی ہمیشہ کو یہ خبر ہوئی تو وہ ناراض ہوگی۔

ایک دن زمان خان مکان کی تعمیر کے سلسلے میں
پلاٹ پر کام کاج میں مصروف تھا کہ ایک انجینیئر شخص وہاں
آ یا اور زمان خان سے مخاطب ہوا کہ اس نے عارف رضا
کو ملنا ہے۔ وہ مکان کی تعمیر کے سلسلے میں اس کی ڈکان
سے کچھ عمارتی سامان ادھار لایا تھا۔ زمان خان یہ سن کر
پریشان ہو گیا اور انجینیئر شخص سے جواباً کہا کہ وہ اب یہاں

مکان کی تعمیر کا کام جاری رکھنے کو کہا۔ ہفتے کے اندر اندر
مکان کی تعمیر عارف رضا نے شروع کرائی۔ دیکھتے ہی
دیکھتے مکان کا ابتدائی کام عارف نے بڑی ذمہ داری اور
نگن سے بروقت مکمل کر لیا۔ زمان خان بھی اس کے کام
سے بہت خوش ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ عارف کے
متعلق اس کے دوست غلط بیانی کا مظاہرہ کرتے رہے
ہیں۔

اب لوہے، سیرپے، سینٹ کی مزید ضرورت پڑی
اور کچھ دیگر عمارتی سامان عارف اپنی ذمہ داری پر مارکیٹ
سے خرید لایا کہ ادائیگی بعد میں کر دی جائے گی جو تقریباً
چالیس ہزار کے قریب تھی۔

زمان خان بھی وقت نکال کر دو چار دن بعد پلاٹ
پر آتا جاتا اور ہلکی پھلکی نگرانی بھی کرتا۔ اس نے نیا خریدا
ہوا سامان دیکھا، بہت خوش ہوا۔ تاہم بل عارف نے
زمان کو دے دیا اور ادائیگی کے لئے کہا۔ زمان خان نے
کہا۔ ٹھیک ہے دوسرے دن عارف رضا کو بل کی ادائیگی
کر دی گئی۔ بل ادا کرتے وقت زمان خان نے عارف
سے سرسری طور سے کہا۔ یاد سریا وزن میں کچھ کم لگتا ہے۔
یہ وزن ہے یا ڈیڑھ ٹن، کیا تم نے اپنے سامنے وزن کروایا
تھا؟

"نہیں دوست! ایسی کوئی بات نہیں۔" عارف رضا
پہلے تو قدرے گھبرایا پھر کہا۔ "جس شور سے سریالا ہوں
ان کا تول پورا ہوتا ہے۔ مطمئن رہو کوئی نگر والی بات
نہیں۔" زمان خان نے بھی زیادہ بحث کرنا مناسب نہ
سمجھا اور اپنے دوست کی بات پر یقین کر لیا۔

عارف رضا کے ہاتھ مزید نقد چالیس ہزار کی رقم آ
گئی، وہ بہت خوش اور قدرے مطمئن تھا۔ اب وہ اپنی
عادت کے مطابق کام پر پابندی سے نہ آتا اور گھومنے
پھرنے چلا جاتا۔ زمان خان کو بھی خبر مل گئی کہ عارف
اپنے کام پر اب کم توجہ دیتا ہے۔ جب زمان نے عارف

RTM 234574

بولو فتین

سیلنگ فین
پیڈسٹل فین

ایگزاسٹ فین



اے، جے، سکھے

سیلنگ فین پیڈسٹل فین
ایگزاسٹ فین

اے۔ جے الیکٹریک انڈسٹری

محکمہ نور پور شرقی گجرات

053-3521165, 3601318

نہیں آ رہا۔

”تو پھر اس صورت میں یہ بل کون ادا کرے گا؟“

اجنبی شخص نے زمان خان سے غصے کی حالت میں کہا۔

”کتنا بل ہے؟“ زمان خان نے پوچھا۔

”چالیس ہزار سات سو روپے کی رقم واجب الادا

ہے۔“ اجنبی شخص نے زمان خان کے ہاتھ میں بل دیتے

ہوئے کہا۔

”لیکن یہ رقم تو میں نے عارف رضا کو ادا کر دی

ہے۔“ زمان خان نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے اجنبی

شخص سے کہا۔ ”کیا اس نے تمہیں نہیں دی؟“

”عارف رضا نے یہ بل کی رقم ہمیں بالکل ادا نہیں

کی۔ اگر اس نے ادا کر دی ہوتی تو پھر میں یہاں کیوں

آتا؟“ اجنبی شخص نے جوابا کہا۔

”تو بھائی میرے اس میں میرا کیا قصور ہے؟ جس

شخص نے تمہاری دکان جسے سودا سلف خریدا ہے اس کو

بچرو..... دیے ایک بات تو بتاؤ۔“ زمان نے باتوں

باتوں میں کہا۔ ”اس بل میں سریا دوٹن لکھا ہے کیا واقعی

سریا دوٹن تھا۔ مجھے تو وزن میں کچھ کم لگتا ہے۔“

”نہیں! جب! وزن میں سریا دوٹن تھا۔“ اس

آدمی نے کہا۔ ”لیکن عارف کے کہنے پر ہم نے بل دوٹن

کا بنا دیا۔ خرید و فروخت کے سلسلے میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔

بل کا کم زیادہ کرنا بھی کاروبار کا حصہ ہوتا ہے۔“ اجنبی

شخص نے اپنے حق میں صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر میرے کارندے

عارف رضا نے بے ایمانی کا ارتکاب کیا ہے تو پھر آپ

بھی اس جرم میں برابر کے حصہ دار ہیں۔“ زمان نے کہا۔

”لہذا بہتر یہی ہو گا کہ تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ

کیونکہ میں غلط قسم کے اور بے ایمان لوگوں سے بات

چیت کرنا پسند نہیں کرتا۔ حرام کھانے والوں کی کبھی پوری

نہیں پڑتی۔ جاؤ چلے جاؤ اور عارف رضا کو تلاش کرو اور

ماجرہ ہے اور میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ عارف بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ زمان خان وہاں رکنہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے دوست سے پوچھے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے اور کس مشکل سے دور چار ہے لیکن زمان خان کے ضمیر نے اسے ایسا نہ کرنے دیا کہ اس حالت میں اس کا دوست اسے دیکھ کر کہیں شرمندہ نہ ہو۔

زمان خان کو عارف کی یہ حالت دیکھ کر سخت دکھ ہوا کہ اس کے گھریلو حالات اتنے سخت خراب ہیں کہ اس کے گھر آٹا تک نہیں اور بھیک مانگ رہا ہے۔ تاہم زمان خان نے عارف کو اس حالت میں ملنا مناسب نہ سمجھا کہ اس وقت دیکھ کے وہ میرا سامنا کیسے کر سکے گا۔ لہذا زمان خان اسے ملے بغیر سیدھا گھر آیا اور در پر تک عارف رضا کے متعلق سوچتا رہا۔ پریشانی کی حالت میں پانچ ہزار کی رقم اپنی جیب میں ڈالی اور سیدھا عارف رضا کے گھر پہنچا۔ اس وقت تک عارف اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ اتنی غربت میں بھی وہ کوٹھی میں رہ رہا تھا۔ دراصل یہ کوٹھی اس کے ماموں کی تھی اور نہ وہ یہ کوٹھی بھی بیچ دیتا۔

زمان خان نے عارف کے گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دی لیکن دروازہ نہ کھلا۔ تاہم دو چار منٹ بعد اترتے اترتے عارف رضا نے دروازہ کھولا۔ زمان خان کو اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا۔

”عارف! فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ زمان خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ مت میں تمہارا دوست ہوں۔ تم کیا اندر بیٹھنے کے لئے نہیں کہو گے؟“

”کیوں نہیں، آؤ آؤ اندر بیٹھتے ہیں۔“ عارف نے کہا۔ دونوں ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے اور بیٹھک میں جا بیٹھے۔

”میں، ابھی تمہارے لئے کولڈ ڈرنک لاتا ہوں۔“

عارف نے کہا۔

”نہیں..... نہیں دوست! رہنے دو۔“ زمان نے

اسی سے اپنے پیسے وصول کر۔“ زمان خان نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔

اجنبی شخص جو بل کی وصولی کے لئے آیا تھا قدرے ڈر سا گیا کہ اس نے غلط بل کیوں بتایا۔

”صاحب! کم از کم اس کے گھر کا کوئی اتنا پتہ بتا دیں۔“ اجنبی شخص نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔“ یہاں بھی زمان خان نے دوستی کا حق نبھایا کہ اگر وہ اس شخص کو اس کے گھر کا پتہ بتائے گا تو ہو سکتا ہے یہ شخص اس کے گھر جا کر کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرے۔ ایسی صورت میں عارف رضا مزید مشکل میں پھنس جائے گا۔ وہ تو پہلے ہی زیرِ عتاب ہے اور مسئلے مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ کافی دیر تک اجنبی شخص ٹھکرا کر رہا لیکن زمان خان نے عارف کے گھر کا پتہ اسے نہ بتایا۔ آخر کار مایوسی کی حالت میں اجنبی شخص وہاں سے چلا گیا اور کہہ گیا کہ ابھی نہ بھی تو عارف رضا سے آنا سامنا ہو گا تو پھر اس صورت میں اس سے اصل پیسے وصول کروں گا۔

مکان کی تعمیر کا کام جاری رہا اور دو ڈھائی مہینوں میں مکان کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ جو رقم زمان خان سے عارف رضا لے گیا تھا اس نے اپنی جیب سے ادا کر دیئے کیونکہ وہ اپنی ہمشیرہ کو یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ یہ رقم اس کا دوست لے اڑا ہے۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ اتفاق سے ایک دن زمان خان اپنے دفتر سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا، جب وہ گلبرگ ٹوارہ نمبر ایک سے اپنی کار پر گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ عارف رضا ٹھکن آلود لباس میں ملبوس مردنی شکل بنائے لب سڑک بھیک مانگ رہا ہے اور ایک آدمی کار روک کر اپنی جیب سے ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کو دے رہا ہے۔ زمان خان نے جب یہ منظر دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ اس کا دماغ چکر سا گیا کہ یا اللہ یہ کیا

ارشاد باری تعالیٰ

☆ رات کے وقت جب کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے تو اللہ کی پناہ مانگا کرو کیونکہ وہ ایسی مخلوق دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے اور جب رات کو ضروری کام نہ ہو باہر کم ہی نکلا کرو کیونکہ رات کے وقت اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہے زمین پر پھیلا دیتا ہے۔ بسم اللہ پڑھ کر دروازے بند کیا کرو کیونکہ شیطان وہ دروازے نہیں کھول سکتا جنہیں بسم اللہ پڑھ کر بند کیا گیا ہو۔ پانی کے برتن، خاص طور پر پینے کے پانی کے برتن رات کو ڈھانپ کر رکھا کرو۔ اچھی اور پرسکون نیند کے لئے درود پاک پڑھ کر سویا کرو۔ (شاگونڈل)

پانچ ہزار کی رقم لے جایا کرے تاکہ اس کے بیوی بچوں کی گزر اوقات باعزت ہوتی رہے۔ اس نے عارف کو یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ اس نے اسے بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ زمان خان کسی بھی حالت میں اپنے دوست کو بھیک مانگتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اسے یہ احساس ہونے دیا کہ وہ بھیک مانگتا ہے اور آج کل ایک بھکاری کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ زمان خان نے وہاں سے اجازت لی، میاں بیوی نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

دو تین مہینے اسی طرح گزر گئے کہ عارف زمان خان کے دفتر پر مہینے کی پہلی تاریخ کو چلا جاتا اور وہ اسے وعدے کے مطابق تقریباً تین ہزار کاراشن اور دو ہزار نقد ادا کر دیتا۔

ایک دن زمان خان اپنے دفتر سے گھر پہنچا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ زمان خان نے فون جلدی جلدی اٹھایا۔ دوسری طرف سے فون پر عارف رضا کی بیوی سیمانے

کہا۔ ”میں گھر سے پڑ پاش ہو کر آیا ہوں۔ کسی قسم کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ عارف نے کہا۔

”اچھا، ٹھیک ہے۔“ زمان نے کہا۔ ”اگر مناسب سمجھو تو شندے پانی کا ایک گلاس پلا دو۔“

عارف فوراً گھر سے پانی کا گلاس لینے چلا گیا۔ زمان خان نے بیٹھے بیٹھے اس کے کمرے کا ایک نظر جائزہ لیا۔ صوفے، کرسیاں، میز وہاں کسی چیز کا نام و نشان تک نہیں تھا صرف اور صرف کمرے میں ایک پھٹی ہوئی چٹائی فرش پر پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سب کچھ بک چکا ہے۔ اس چٹائی پر عارف لیٹا ہوا تھا۔ عارف پانی کا گلاس لے آیا زمان خان نے پیسا اور دوست کا شکر یہ ادا کیا۔

”عارف! ذرا ایک آدھ گھنٹے کے لئے میرے ساتھ آؤ۔“ زمان نے کہا۔ ”کینال پارک مارکیٹ تک جانا ہے۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔ پھر واپس تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔“

عارف نے بیٹھے ہوئے دل سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔“ دونوں کار میں سوار ہو کر پانچ سات منٹوں میں مارکیٹ پہنچ گئے۔ زمان خان نے پورے مہینے کا راشن خریدا اور بل ادا کیا پھر واپس عارف کے گھر پہنچے۔

”راشن اپنے گھر کے اندر لے جاؤ۔“ زمان نے کہا۔ ”یہ تمہارے بیوی بچوں کے لئے ہے۔“

عارف یہ سن کر حیران ہو گیا۔ وہ ضرورت مند بھی تھا، راشن اٹھایا اور گھر کے اندر لے گیا۔ اس دوران اس کی بیوی بھی آگئی۔ زمان خان کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئی۔ رکی سلام دعا ہوئی۔ زمان نے دو ہزار نقد اس کی بیوی سیمانے کو دیا اور کہا کہ یہ رقم اس کی بچی کے علاج معالجے کے لئے ہے۔ پھر اپنے دوست عارف کو تاکید کی کہ وہ آئندہ سے ہر مہینے یکم تاریخ کو اس کے دفتر آ کر

آخر وہ کون سی وجہ یا پھر کیا محرکات تھے جو عارف بھیب مانگنے پر مجبور ہوا اور یہ سب کچھ عارف کی بیوہ سیما سے بھتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے عارف کی بیوہ سے پوچھ ہی لیا کہ وہ آج اسے وجہ بتائے کہ اچانک ان کے گھریلو حالات کیوں بگڑے حالانکہ کچھ عرصہ پہلے وہ ایک آرام دہ اور خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔

”اس کی وجہ صرف ایک ہے۔“ سیما نے کہا۔ ”اور وہ یہ ہے کہ ہم لوگ یہاں جس کوٹھی میں رہائش پذیر ہیں یہ دراصل میرے مرحوم شوہر عارف کے ماموں کی ملکیت ہے۔ وہ لوگ ایک عرصہ سے امریکہ میں مقیم ہیں، پاکستان سے روانگی پر وہ لوگ یہ کوٹھی اپنی بہن کے سپرد کر گئے جو عارف کی ماں تھی۔ اس کے بطن سے صرف ایک لڑکا تھا عارف اور ایک مرحوم عارف کی نانی۔ وہ لوگ اپنی کوٹھی کرائے پر دینے کے حق میں نہ تھے۔ ازراہ ہمدردی انہوں نے اپنی بیوہ بہن کو وہاں رہنے کی اجازت دی اور ساتھ ہر ماہ وہ مبلغ پچاس ہزار روپے کی رقم بھی اپنی بیوہ بہن اور نانی ماں کو بھیجتے تھے۔ آپ اس کو مدد یا خیرات کہہ لیں۔ عارف کی ماں ساری کی ساری رقم اپنے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے عارف کو دے دیتی۔ عارف دل کھول کر ساری کی ساری رقم مہینے کے آخر تک اڑا دیتا۔ جیسے مثال ہے ”مال مفت دل بے رحم“ ٹھیکیداری بھی اس نے ایک قسم کی چھوڑ رکھی تھی اور نہ ہی وہ اس کام میں کوئی زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ اس طرح وقت گزرتا رہا اور ہم لوگ ایک خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ پھر کچھ آگے چل کر عارف کی ماں نے اپنی برادری میں ایک آدمی سے دوسرا نکاح پڑھوا لیا۔ جس کا اس کے بھائیوں نے جو امریکہ میں مقیم تھے، بہت سخت بُرا منایا اور اپنی بیوہ بہن سے ناطہ توڑ دیا۔ دوسرا عارف کی ماں بھی عارف کو چھوڑ کر اپنے خاوند کے گھر جا کر رہنے لگی۔ اب عارف کے پاس نانی ماں رہ گئی تھی جو اکثر بیمار رہتی یا

رونے کی آواز سنائی دی۔ روتے روتے کہا۔

”بھائی جان! آپ کے دوست کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں بچوں سمیت بے آسرا ہو گئی میرا اب کون پُرساں حال ہوگا۔“

زمان خان نے جب عارف کے انتقال کی خبر سنی تو اسے سخت صدمہ پہنچا۔ ایک طرح کا وہ سکتے میں چلا گیا اس کے ہاتھ میں پکڑا لوالہ ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ اس نے مزید وقت ضائع کئے بغیر اپنی بیوی کو عارف کے انتقال کی خبر سنائی۔ دونوں میاں بیوی فوراً عارف کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں رونا دھونا مچا ہوا تھا۔ ارد گرد کے ہمسائے اور رشتہ دار آچکے تھے۔

زمان خان نے سب سے پہلے اپنے مرحوم دوست عارف رضا کی تجہیز و تکفین کے انتظامات مکمل کئے اور مرحوم کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس کو قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ دوسرے دن رسم قلم پر زمان خان نے اپنی بیوی کے ذریعہ عارف مرحوم کی بیوہ کو پیغام بھیجا کہ اس کا خاوند اب اس دنیا میں نہیں رہا لیکن اسے کسی قسم کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں پہلے اپنی عدت پوری کرو، تمہارے بچوں کے لئے راشن خرچہ وغیرہ گھر پر تمہیں ہر ماہ پابندی سے ملتا رہے گا۔ اس کے علاوہ بھی تمہیں کسی قسم کا کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مطلع کرنا۔ ان شاء اللہ تمہاری ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ اپنے آپ کو بے سہارا مت سمجھنا۔

اسی طرح کچھ وقت گزرا سیما جواب بیوہ تھی اس کی عدت کا وقت ختم ہوا۔ اب زمان خان اپنی بیوی کے ساتھ سیما کے گھر ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ جاتا اور اس کی اور اس کے بچوں کی خیر و عافیت پوچھتا۔

زمان خان کو بڑا تجسس تھا اور وہ یہ جاننا چاہتا تھا عارف رضا کی زندگی جو بڑی خوشحال تھی دیکھتے ہی دیکھتے کیسے معاشی بد حالی کا شکار ہوئی۔ نہ تو وہ جو اکیلے، نہ شراب چیتا اور نہ ہی بظاہر اس میں دیگر کسی قسم کی برائی نظر آتی تھی

ڈائجسٹوں کی دنیا کے معروف قلم کار

یہ دیانہ بجھنے پائے

محمد سلیم اختر



☆ محمد سلیم اختر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بہت سادہ اور سہل لکھتے ہیں اس لئے ان کی تحریر قاری کے دل و ذہن سے براہ راست مکالمہ کرتی ہے۔

☆ منظرہ سہام، ایڈیٹر و ڈائریکٹر، جی کہانیاں

☆ محمد سلیم اختر نثری کائنات میں ایک معتبر نام ہے۔

☆ انہیں قارئین کو اپنے فن میں منہمک رکھنے کا فن آتا ہے۔

☆ ایم اے ادب

☆ محمد سلیم اختر کہانی اور قاری کے ذہن پر غلبہ کی گرفت رکھتے ہیں۔

☆ انہیں قاری کی کہانوں کے بل پر چڑھنا کمال تصور کرتا ہوں۔

☆ پرویز بکرمی

☆ جاسوسی ڈائجسٹ، نئی دہلی کی شہرہ آفاق

نواب سنز پبلی کیشنز

1182/1 مکہ میں جامعہ اسلامیہ، مکہ، پاکستان

Ph: 051-5555275

پھر عارف کے بچے تھے۔ عارف کے ماموں پھر بھی بچاؤ ہزار کی رقم عارف کو بھیجتے رہے کیونکہ عارف کی نانی امریکہ میں جو دو ماموں تھے ان کی ماں تھی۔ پھر تھوڑا آگے چل کر نانی ماں کا بھی انتقال ہو گیا اور ساتھ ہی امریکہ سے پیسے آنا بھی بند ہو گئے۔ عارف کے ماموں اب یہ سوچنے لگے کہ ان کی ماں بھی انتقال کر گئی اور ان کی بہن نے بھی دوسرا نکاح کر لیا اور اپنے گھر چلی گئی عارف سے اب رشتہ بس نام کا ہے۔ دوسرے وہ لوگ عارف کے خیالات اور ترکات سے بھی کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے لہذا انہوں نے ماہوار خرچہ بند کر دیا۔ کوئی بیع پونجی وہ رکھتا نہ تھا میرا مرحوم خاوند بس یہی سمجھتا رہا کہ اس طرح پابندی سے پیسے آتے رہیں گے اور اس طرح وقت گزرتا رہے گا۔

بس یہی ایک وجہ تھادی معاشی بد حالی کا سبب بنی۔ میرے مرحوم شوہر کے انتقال کے بعد ان کے جو ماموں ہیں انہیں یہ گمان گزرا کہ کہیں میں بھی کسی سے دوسری شادی نہ کر لوں تو پھر اس صورت میں وہ لوگ کوٹھی پر قابض ہو جائیں پھر ان سے کوٹھی خالی کروانا مشکل ہو جائے گا۔ اب ایک ماموں ہم سے کوٹھی خالی کروانے آ رہا ہے۔

چنانچہ اگلے ماہ ہی عارف کا ایک ماموں پاکستان آیا اور سیماسے کہا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر یہ کوٹھی خالی کر دے اور اپنی رہائش کا بندوبست کسی اور جگہ کر لے۔ انہیں ہر حالت میں کوٹھی خالی چاہئے۔

یہ صورت حال عارف کی بیوہ کے لئے پریشان کن تھی۔ عارف مرحوم کے ماموں اب سارے رشتے ناٹے بھول گئے تھے اور ٹھیک ایک ماہ گزرنے کے بعد عارف کی بیوہ کے گھر کا سامان باہر گلی میں پھینک دیا۔ اور کہا کہ ہمارا تمہارا کوئی رشتہ نہیں جس کے ساتھ رشتہ تھا وہ مر گیا۔ جہاں تجھے پناہ ملے چلی جاؤ۔

جب اس صورت حال کا علم زمان خان کو ہوا تو اس کو مرحوم دوست عارف یاد آیا۔ فوراً عارف کی بیوہ کے

کرتا رہا۔ سکول ماسٹر ایک ادھیڑ عمر شخص تھا، اس کی کوئی اولاد نہ رہی تھی۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی جس کی عمر پانچ سال تھی اور وہ ماسٹر جی کے والدین کے پاس رہتی تھی۔ زمان خان نے یہاں بھی دوستی کا حق سمجھا۔ اپنے دوست سکول ماسٹر کو عارف کی بیویہ سیمہ کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے رضامند کر لیا۔ ماسٹر جی سے نکاح کر لینے کے بعد سیمہ ماسٹر زبیر کے نام سے منسوب ہو گئی۔ سیمہ اپنے لئے بلکہ اپنے بچوں کے لئے جینا چاہتی تھی۔

ماسٹر زبیر نے بھی نہایت پیار محبت اور شفقت سے سیمہ کو اپنے گھر میں رکھا۔ سیمہ کوئی طور پر اپنے بچے سارے غم بھول گئی اسے اب ایک پیار کرنے والا شوہر مل گیا جو اس کی اور اس کے بچوں کی ہر ضرورت پوری کرتا۔ بچے بھی بہت خوش تھے۔ ماسٹر زبیر ان کی تعلیم و تربیت پر پوری پوری توجہ دیتا۔

اس طرح شب و روز گزرتے رہے پھر تھوڑا آگے چل کر سیمہ کے بطن سے ایک لڑکا تولد ہوا۔ ماسٹر زبیر کی خوشیاں مزید بڑھتی چلی گئیں۔ اب اس کے گھر اسی کی جگہ خوشیاں اور بہاریں ہی بہا رہی تھیں۔ سیمہ نے اپنے خاوند کی جو پہلی بیوی کے بطن سے لڑکی تھی اس کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ زمان خان بھی گا ہے بگا ہے ان کی خبر رکھتا اور گھر میں ان کو ایک خوش و خرم زندگی گزارتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ سیمہ زمان خان کی بہت ممنون تھی کہ اس نے ہر موڑ پر اس کی مدد کی بلکہ اس کا ماسٹر زبیر سے نکاح کروا کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تحفظ فراہم کیا۔ وہ زمان خان کو کہتی کہ جو نیکی اس نے کی ہے اس کی جزا وہ تو نہیں اللہ تعالیٰ اسے ضرور دے گا۔ جواب میں زمان خان کہتا اس نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا، اس نے فقط دوستی سمجائی ہے۔



پاس پہنچا اور عارف کی بیویہ اور اس کے بچوں کو حوصلہ دیا کہ لگ کر نہ کریں ایک در بند ہوتا ہے تو سو در اوپر والا حوصلہ دیتا ہے۔ زمان خان کا اس کے گھر کے قریب ایک سرورٹ گوارڈ تھا جو اس نے اپنے پار دوستوں اور مہمانوں کے لئے خالی رکھا ہوا تھا فوراً عارف کی بیویہ کا سارا سامان اس میں رکھ کر بعد اس کے بچوں کو اپنے گوارڈ میں لے آیا اور بیویہ سے کہا کہ اب آپ لوگ بے فکر ہو کر اس جگہ قیام کریں۔ اب تمہیں کسی قسم کا کرایہ ادا کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی اور حسب توفیق تمہیں بچوں کی پرورش کے لئے ماہوار خرچہ بھی ملتا رہے گا۔ تمہیں یہاں ہر قسم کا تحفظ ملے گا۔

”سیمہ! یقین کرو میں تمہارے ساتھ ضرور نکاح کر لیتا۔“ ایک دن زمان خان نے کہا۔ ”لیکن میری کچھ مجبوری ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میری اولاد جوان ہے۔ بے شک تم ایک بلند کردار باوقار اور کفایت شعار عورت ہو، میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی قسم کا لنگر رکھنے کی ضرورت نہیں۔“

عارف کی بیویہ کو یہ سب کچھ جان کر قدرے حوصلہ ملا۔ اس دوران عارف مرحوم کی بیٹی جو کالے برقعان کی مریضہ تھی اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ عارف کی بیویہ کے لئے یہ غم بھی کچھ کم نہ تھا۔ تاہم اس نے اللہ کی رضا سمجھ کر برداشت کیا۔ زمان خان نے عارف کی بیویہ کو گھر میں مصروف رکھنے کے لئے بازار سے ایک نئی سلائی مشین خرید کر لا دی اور کہا کہ وہ مکی محلے میں لوگوں کے کپڑوں کی سلائی وغیرہ کیا کرے اس طرح اس کا وقت بھی مصروفیت میں گزرے گا۔ دوسرے آدمی بھی کچھ ذریعہ ہوگی۔

اس کے دونوں بچوں کو بھی زمان خان نے محلے کے ایک دوست جو پرانے سکول ماسٹر تھا، اس کے پاس ٹیوشن رکھوا دی تاکہ بچے مکی محلے میں آوارہ نہ بھرتے رہیں۔ بچوں کی ٹیوشن فیس زمان خود اپنی جیب سے ادا

اپنی جوانی کیوں برباد کرتے ہو میں تمہیں ایک ایسا طریقہ بتاتا ہوں
کہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور مالاٹھی بھی بچ جائے۔

جب بیٹی ماں کی چھوٹی



محمد نذیر ملک

☆

کہتے ہیں ساس اگر ماں بھی ہو تب بھی بیٹی کے حق میں اچھی نہیں ہوتی اور بہو اگر بیٹی بھی ہو تو ماں کو ساس ہی سمجھتی ہے۔

یہ ضرب المثل اس وقت حقیقت کا روپ دھار گئی جب ایک مکی بیٹی اپنی ماں کی بہو بن گئی۔

نام تو اس کا ارشاد بی بی تھا لیکن سب اُسے شاداں کہتے تھے۔ شاداں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے نام طے ہوئے ناز و نعم کے ساتھ پلی تھی۔ وہ بچپن سے ہی نہایت خوبصورت تھی۔ اوپر سے جب اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو غضب اُحسانے لگی۔ گاؤں کے لوجوان شاداں کے حسن کے گن گاتے اور اس سے عشق و محبت کے من گھڑت قصے سننے سنانے لگے۔ ہر کوئی اس کا سچا عاشق ہونے کا دعویدار تھا اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اکثر اسے ہیر کہتے۔

شاداں کسی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔

نظر اٹھات تو دور کی بات تھی۔

ایک روز شاداں کے ان نام نہاد عاشقوں پر یہ خبر بجلی بن کر مگرمی کہ شاداں کی اپنے ماموں زاد سے منگنی ہو گئی ہے سبھی کو اس بات سے بڑا قلق ہوا اور حیرانی بھی کہ یہ محل کو کوٹاٹ کا بیوند کیسے لگ گیا۔ کیونکہ شاداں کا منگیتر کسی طور بھی شاداں کے قابل نہ تھا۔ وہ پستہ قد، نحیف و نزار اور نہایت سادہ سا لڑکا تھا جبکہ ان نام نہاد متوقع امیدواروں میں سے ہر کوئی اپنے آپ کو راہنما ہی گردانتا تھا۔ ان میں سے ہر کوئی اسے اپنی حق تلفی جاننے لگا لیکن چونکہ یہ شاداں کے ماں، اب کا فیصلہ تھا لہذا کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں سے کسی کو اس بات کا علم نہ ہوسکا کہ آیا اس فیصلہ میں شاداں کی اپنی مرضی بھی شامل ہے یا نہیں۔ وہ ایسا وقت تھا جب والدین کی اکثریت شادی کے بارے میں اپنی بیٹیوں کی مرضی معلوم کرنے کی روادار نہ تھی۔ اس بارے سے کہ بیٹی اگر خدا خواستہ ”نہ“ کر گئی

نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ان کے اپنے عزیزوں میں لڑکا موجود ہے اور یہ کہ بچوں کی نسبت بچپن سے ہی ملے ہو چکی ہے۔ ان کا جواب سن کر شفاعت کے گھر والے مایوس لوٹ آئے لیکن عشق کی جو آگ دونوں نے اپنے دلوں میں جلائی تھی اسے شاداں کی شادی کا بندھن بھی نہ بچھا سکا۔ کہتے ہیں نفرت اگر دل میں ہو تو اس کا اظہار کبھی نہ کبھی ہو ہی جاتا ہے۔

آخر اسی دوران ایک روز شاداں نے اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ شوہر شاداں کے منہ سے نکلی یہ بات سن کر ہکا بکا رہ گیا اور وہ اپنا منہ کھول کر شاداں کا منہ دیکھنے لگا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ تو کسی طور بھی شاداں کو طلاق دینے اور اسے کھونے پر آمادہ نہ تھا۔ بات لوگوں تک پہنچی تو کہرام مچ گیا لیکن شاداں اب چپ کا روزہ توڑ چکی تھی وہ سر عام کہنے لگی کہ اس کا اپنے خاوند کے ساتھ گزارہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ شاداں کا باپ یہ رسوائی اور جگ ہسائی سہہ نہ سکا اور ایک روز سوتے میں ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

آخر عشق کی آگ جو الہ بن کر پھٹنے لگی اور شاداں نے کسی بھی طور سے اپنے خاوند سے ہٹکارہ حاصل کرنے کی ٹھان لی اور اپنے عاشق کو راز دار بنا لیا۔ پھر ایک روز لوگوں نے سنا کہ شاداں کے شوہر کو رات کو سوتے میں سانپ نے ڈس لیا ہے اور صبح وہ اور سانپ دونوں بستر پر مرے ہوئے پائے گئے۔

امر واقع یہ تھا کہ شاداں کے گاؤں کے قریب ایک میدان میں جھلی نشین آباد تھے جن میں ایک سنیا سی بابا بھی تھا۔ شفاعت اس سے جا کر ملا اور اس سے زہر طلب کیا۔ سنیا سی بابا سمجھ گیا کہ جوان کے ارادے خطرناک ہیں سنیا سی نے کہا کہ زہر تو وہ دے سکتا ہے لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ زہر دینے والے خود بھی بچ نہیں پاتے اور پکڑے جاتے ہیں۔ اپنی جوانی کیوں برباد کرتے ہو میں تمہیں

تو یہ ان کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا اور لوگ طرح طرح کی باتیں بتاتے کہ دیکھو فلاں کی بیٹی بول پڑی ہے۔ بیٹی کا یہ بول پڑنا شرم اور بے عزتی خیال کیا جاتا۔ ادھر بیٹیاں بھی اپنے ماں باپ کی عزت کا اپنی پسند ناپسند سے بڑھ کر خیال کرتی تھیں کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں ان کی عزت پر حرف آئے۔ ایک روز شاداں بھی ایسے ہی روتی رلاتی ڈولی میں بیٹھ گئی اور اپنے دولہا کے گھر میں جا اتری۔

شاداں کی شادی ہو گئی۔ شاداں سے عاشقی کا دعویٰ کرنے والوں نے صبر کا گھونٹ پی تو لیا لیکن ساتھ ہی وہ اس نوہ میں لگ گئے کہ کیا وہ اپنے خاوند کو پسند کرتی ہے یا نہیں اور کیا یہ شادی اس کی مرضی سے ہوئی ہے۔ انہوں نے دیواروں کے ساتھ کان لگانے شروع کر دیئے۔ ادھر شاداں کے خاوند کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ رات چلتے میں اس پر طرح طرح کے آوازے کتے لیکن شاداں کا خاوند نہایت دھیمے مزاج کا صابر شاگرد انسان تھا وہ ان کی چھیڑ چھاڑ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ قانع تھا اور جانتا تھا کہ کھسیانی بلی ضرور کھسا نوچے گی۔ بہر حال بات زیادہ دیر چھپی نہ رہی۔ کہتے ہیں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور وہاں تو لوگوں کے گھروں کی چھتیں بھی آپس میں مشترکہ اور ہلکی ہوتی تھیں۔ گھر کے اندر کئی جانے والی باتیں سفر کرتے کرتے دور تک پہنچ جاتی تھیں۔ بات وہی نکلی کہ شاداں نے کبھی بھی اپنے خاوند کو پسند نہیں کیا تھا اور نہ ہی شادی کے بعد اسے قبول کیا ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ شاداں کے مراسم خفیہ طور پر ایک نوجوان کے ساتھ تھے جس کا نام شفاعت تھا۔ وہ ایک دوسرے پر جان چمڑکتے تھے اور دلوں آپس میں پڑوسی تھے۔ وہ چوری چھپے ملتے بھی تھے۔ ان کی محبت پاک صاف تھی۔ شفاعت کے کہنے پر اس کے گھر والے شاداں کے گھر رشتہ مانگنے آئے تو شاداں کے والدین

حکایت کے نامور قلم کار محمد رضوان قیوم کے قلم سے

گروہ ماضی

11 انعام یافتہ
کلاسک سچی کہانیوں کا مجموعہ

یہ کہانیاں من گھڑت قصے یا افسانے نہیں
بلکہ انسانی زندگی سے لپٹی حقیقی وارداتیں
ہیں جو لوگ دوسرے سے نہیں، اپنے آپ
سے بھی چھپاتے ہیں

قیمت
250/- روپے

ملک بک ڈپو، کمیٹی چوک
دراکٹی بک، بینک روڈ صدر راولپنڈی

ایک ایسا طریقہ بتاتا ہوں کہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور علاج بھی نفع بخش جائے۔ تم مجھ سے ذہری کی بجائے ذہریلا سانپ لے لو اور اپنے شکار کو سانپ سے ڈسوا دو۔ شفاعت حیران ہو کر سنیا سی بابا کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سانپ کا ڈسنا بھی تو جاتا ہے اور تمہارے جیسے سنیا سی بھی سانپ کے ڈسے کو بچا لیتے ہیں۔ سنیا سی نے کہا کہ میرے پاس ایک ایسا سانپ ہے جس کے ڈسے کو میں بھی نہیں بچا سکتا اور پھر مارگزیدہ مجھ تک پہنچے گا تو میں اس کا علاج کروں گا ناں میرے اس سانپ کا ڈسنا تو پانی نہیں مانگتا۔ لیکن اس کے پیسے بہت لگیں گے۔

پیسوں کی فکر نہ کرو تم ڈسوانے کا طریقہ بتاؤ۔

سنیا سی نے کہا کہ وہ سانپ کو اس ڈولی میں ڈال کر ڈولی کے منہ پر کپڑا رکھ کر اسے رسی سے باندھ دے گا۔ تم رات جا کر جس کسی کو بھی ڈسوانا ہے رات کو جب وہ شخص سو جائے تو احتیاط سے ڈولی کے کپڑے کی رسی کھول کر سانپ اس کے پہلو کے ساتھ کے بستر پر ڈال دینا۔ سانپ ذہری کے نشے میں نرم نرم بستر پر پڑا رہے گا جو فی اس شخص نے ذرا سی بھی حرکت کی تو سانپ اس کو ڈس لے گا۔ اس بات کا خیال رہے کہ مطلوبہ شخص کے جوتے بھی اس جانب پڑے ہوں جس جانب سانپ ہوتا کہ وہ شخص بستر پر سے اس طرف سے اترے جہاں سانپ پڑا ہو گا اور اترتے وقت لامحالہ وہ سانپ کے اوپر سے ہو کر اٹھے گا لہذا سانپ اسے فوراً ڈس لے گا۔ بہر حال یہ ترکیب کامیاب رہی اس کے بعد سنیا سی بابا کے کہنے کے مطابق سانپ کو بستر پر ہی مار دیا گیا اور وہ پڑا رہا۔ صبح لوگوں نے دیکھا کہ شاداں کا شوہر مرا پڑا ہے اس کا جسم نیلا پڑ گیا اور منہ سے جھاگ ابل رہا تھا۔ پاس ہی سانپ مرا پڑا تھا۔ مکانوں کی چھتیں مٹی تھیں یہی باور کیا گیا کہ سانپ چھت سے بستر پر گرا ہے اور اس نے شاداں کے

شوہر کو ڈس لیا ہے۔

یہ سب باتیں بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔

چنانچہ شاداں طلاق لینے سے پہلے ہی یہ ہو گئی۔

اب شاداں اور اس کے محبوب کے راستے کی رکاوٹ ختم

ہو گئی۔ عدت گزرنے کے بعد شاداں شفاعت کی بیوی

بن گئی۔ ادھر شفاعت کی ماں کو مرے 8 ماں گزر چکے تھے

اور اس کا باپ رطو وا تھا چند مہینوں میں اس نے شاداں کی

ماں کے ساتھ نکاح کر لیا۔ یوں دونوں ماں بیٹی کا رشتہ

ساس اور بہو کے رشتہ میں بدل گیا۔ شاداں کا نیا خاندان

و جان سے اس پر فدا تھا۔ ادھر شاداں بھی اس کی بے پناہ

محبت میں گرفتار تھی۔

ادھر جب ان ماں بیٹی کا رشتہ ساس اور بہو میں

تبدیل ہوا تو ماں ماں نہ رہی اور بیٹی بیٹی نہ رہی۔ وہ

روایتی ساس بہو بن گئیں۔ اس وقت جوائنٹ فیملی سسٹم

تھا۔ ایک ہی جگہ کھانا پکنا اور سب اکٹھے بیٹھ کر کھانا

کرتے۔ ان باپ بیٹوں کا زمیندارہ تھا۔ باپ بیٹے

دونوں مل چلاتے اور مویشی پالتے۔ کبھی کھانا لے کر

کھیتوں میں ماں جاتی کبھی بیٹی۔ وہ اپنے اپنے خاندانوں

کی بقا پر خدمت گار تھیں۔ وہ گھر بار کا کام بخوبی انجام

دے رہی تھیں کہ اچانک ایک واقعہ ہو گیا۔

شفاعت کے باپ نے دیگر مویشیوں کے علاوہ

ایک بہت ہی خوبصورت بیل پال رکھا تھا اس وقت اکثر

زمیندار لوگوں نے اس طرح کا ایک آدھ بیل شوقیہ طور پر

پال رکھا ہوتا تھا۔ بیل شفاعت کے باپ سے بے حد

مانوس تھا۔ دونوں کے درمیان دوستی ہی تھی۔ دونوں ایک

دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ کیا ہوا کہ ایک دن

دونوں باپ بیٹا علی الصبح مل چلانے کے لئے نکلے تو اس

بیل کو بھی ساتھ لے گئے۔ بیل صبح دن چڑھتے ہی رسی توڑ

کر گھر آ گیا۔ شاداں کی ماں نے بیل کو جو اس حالت

میں دیکھا کہ اس کے ناک اور گلے میں ڈالی ہوئی آدمی

ری لٹنی ہوئی بیل کے ساتھ لنگ رہی ہے اور بیل مالک کو

چھوڑ کر گھر آ گیا ہے تو یہ منظر دیکھ کر شاداں کی ماں نے

فورا کہا کہ آج اس کا خاندان مارا گیا ہے۔ ورنہ بیل کبھی

یوں اکیلا گھر واپس نہ آتا۔

فی الواقع یہ بات اس وقت سچ ثابت ہو گئی جب

لوگوں نے کھیتوں میں جا کر دیکھا تو شفاعت کا باپ

وہاں مرا پڑا تھا اور شفاعت وہاں موجود نہ تھا۔ پتہ چلا کہ

وہ ایک پہاڑی چڑھ کر اس کی دوسری جانب سے اتر کر

گد حالہ (جگہ کا نام) چلا گیا ہے۔ اسے پیغام بھیجا گیا کہ

اس کا باپ مر گیا ہے۔ متونی کو اٹھایا گیا۔ یعنی شاہدین کا

کہنا تھا کہ متونی کے سر پر گہرے زخم دیکھے گئے تھے۔ بیٹا

بھی راستے بھر میں روتا پینٹا گھر آ گیا۔ کسب نے مل کر

متونی کو اندر دھسے (اندر والے کمرے) میں لے جا کر

فصل دیا اور جلدی جلدی میں اسے دفنا بھی دیا گیا۔ کسی

نے پولیس کو خبر کر دی کہ متونی کو قتل کیا گیا ہے۔ تھانیدار آ

گیا اور ساتھ اپنا عملہ بھی لایا۔ متونی کی قبر کشائی کی گئی۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوائی گئی۔ اگلے روز رپورٹ

آئی تو متونی کی موت سر پر لاٹھی یا کسی وزنی چیز کی شدید

ضربوں کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ لہذا پولیس نے اپنے

طریقے سے قتل کے اس کیس کی تفتیش شروع کر دی۔

تفتیش کی ابتدا مقتول کے بیٹے شفاعت سے کی گئی کہ

جب باپ بیٹا دونوں اکٹھے کھیتوں کو گئے تھے پھر کیا ہوا؟

بیٹے نے کہا کہ وہ راستہ سے ہی باپ سے انگ ہو گیا اور

لکڑیاں لانے کے لئے گد حالہ چلا گیا تھا۔ وہیں پر اسے

اطلاع ملی کہ اس کا باپ فوت ہو گیا ہے۔ موقع کاغذی

شاہد کوئی نہیں تھا ماسوائے بے زبان بیل کے۔

بیل نے گواہی دے دی

تھانیدار کوئی سیانا شخص تھا اس نے کہا کہ اُسے وہ

بیل دکھایا جائے جو رسی توڑ کر کھیتوں میں سے گھر آ گیا

جنگماتی باتیں

ہم اسلام میں داخل ہوتے ہیں تو سمجھوا من مل گیا اور جب اسلام ہمارے اندر داخل ہو جاتا ہے تو ہم جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ہم وحسد کرنے والے کے لئے یہی سزا کافی ہے کہ جب تم خوش ہوتے ہو تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔

(حضرت علیؓ)

☆ آپ کی زندگی میں آپ کا خیال رکھنے والی شخصیت ایسے ہی ہے جیسے دل کی دھڑکن۔ جو نظر نہیں آتی لیکن خاموشی سے آپ کی زندگی کو تحفظ دیتی ہے۔ (شاگرد)

☆ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں، پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔ (نسیم سیکینہ صدف)

☆ تعلیم سے زیادہ ہمارا رویہ اہم ہوتا ہے کیونکہ بعض اوقات ہماری تعلیم ناکام ہو جاتی ہے اور رویے ہی معاملات سدھارتے ہیں۔

☆ محبت زندگی بدل دیتی ہے جناب! اگر مل جائے تب بھی اور نہ ملے تب بھی۔ (حکیم محمود۔ ساہیوال)

☆ اللہ کے خوف سے گرنے والے آنسو بے شک چھوٹا کیوں نہ ہو، اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ سمندر کے برابر گناہ دھو دیتا ہے۔ (نبیلہ نازش۔ اڈاکاڑہ)

☆ سے باپ پر حملہ کر دیا۔ باپ کے منہ سے اتنے الفاظ نکلے کہ بیٹے یہ کیا کرنے لگے ہو۔ پھر دوسرے تیسرے وار پر وہ خاموش ہو گیا۔ وہ گر گیا اور مرنے لگا۔ میں اسے مرنا دیکھ ہی رہا تھا کہ دیکھا تو بتل رہی توڑ کر ہماری طرف بھاگا آ رہا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے ہی نشانہ بنائے گا۔ اس نے نزدیک آ کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ مجھے اس

تھا۔ چنانچہ تھانیدار کو اپنے استھان پر بندھے بتل کے پاس لے جایا گیا۔ جب تک بتل کے گلے سے لوٹی ہوئی رسی نکال کر دوسری رسی ڈال دی گئی تھی۔ تھانیدار بتل کے گرد گھوم گیا۔ جب اس کی نظر بتل کے سینگوں پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ ایک سینگ کی لوک پر ہلکا سا خون لگا ہے۔ بتل نے کسی کو ڈنسی کیا یا یہ خون مقتول کے جسم کا ہے۔ تھانیدار گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اسی دوران شفاعت کو جو تھانیدار کے قریب بیٹھا ہوا تھا کسی نے آواز دی وہ اٹھا اور لنگڑاٹا ہوا چلنے لگا۔ اچانک تھانیدار کی نظر شفاعت پر پڑی تو اسے جھٹکا سا لگا۔ وہ شفاعت کو لنگڑا کر جاتے آتے تھوڑی دیر دیکھتا رہا۔ تھانیدار نے اس سے پوچھا کہ تم لنگڑا کر کیوں چل رہے ہو جنہیں کیا ہو گیا ہے۔ شفاعت کا رنگ بدلا۔ فوراً سنبھل کر بولا کہ اسے جب باپ کے مرنے کی خبر ملی تو وہ گھر کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ راستے میں اچانک ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر گر پڑا وہیں سے کولھے پر چوٹ آئی ہے۔ تھانیدار نے اسے کہا کہ وہ اسے چوٹ یا زخم دکھائے۔ اس نے پس و پیش کی لیکن سرکار کا حکم تھا اسے چادر ہٹا کر زخم دکھانا پڑا۔ وہ عجیب طرح کا زخم تھا۔ تھانیدار نے اب تک کئی چوٹیں اور زخم دیکھے تھے کئی پٹی لاشیں بھی دیکھیں تھیں لیکن اس جیسا زخم نہیں دیکھا تھا۔ زخم ایسی جگہ تھا کہ اس کی چادر پر بھی خون لگا ہوا تھا۔

تھانیدار شفاعت کو تھانے لے گیا۔ زیادہ تفصیل تو سامنے نہ آئی کہ کس طرح شفاعت نے راتوں رات اقبال جرم کر لیا کہ باپ کو اس نے قتل کیا ہے اور یہ کہ بیوی کے کہنے پر کیا ہے۔ البتہ اس نے بتایا کہ اس نے کھیتوں میں لے جا کر باپ کو قتل کیا۔ ہم علی آج باپ بیٹھا ڈبہ (بتل) اور مل والے دیگر بتل لے کر کھیتوں میں پہنچے۔ ڈبہ کو باپ نے ایک چھوٹی سی بھری کے ساتھ باندھا اور اس جو تھنے کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے اچانک لاش

باپ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا کہ اُس کا باپ اس پر بری نظر رکھتا ہے اور اشاروں کنایوں سے اسے درغلا تا ہے انہیں یہ بات صحیح ثابت کرانے کے لئے اس نے ایک دو ہار شفاعت کے سامنے اس کے باپ سے جھگڑا مول لیا۔ اس پر تہمت لگائی اور اسے برا بھلا کہا۔ نتیجتاً ماں بیٹی کی منہ ماری ہوئی۔ ماں نے لامحالہ اپنے خاوند کی طرف داری کی اور بیٹی کو برا بھلا کہا۔ ادھر شاداں برابر باپ کے خلاف شفاعت کے کان بھرتی رہی اور اسے بھڑکانا ہی۔

یہ کہ اس کے باپ کی نظر اس کے بارے میں صاف نہیں اور وہ بہت تنگ ہے اس گھر میں۔ یہاں تک کہ شاداں نے باپ بیٹے کو آپس میں ٹکرا دیا۔ بیٹے نے باپ پر کھلم کھلا بدکاری کا الزام لگا دیا۔ باپ بھی طیش میں آ گیا اس نے کہا کہ تُو نے بدچلن عورت گھر میں رکھی ہوئی ہے جو خود خراب ہے اور مجھ پر جھوٹا الزام لگاتی ہے۔ اس عورت سے شادی سے پہلے تمہارے ساتھ تعلقات تھے۔ باپ بیٹے کی ٹوٹکار بدھ کر ہاتھ پائی میں بدل گئی۔ عورتوں کے شور مچانے پر محلہ دار اکٹھے ہو گئے جنہوں نے باپ بیٹے کو چھڑا لیا۔ ادھر شفاعت جوان تھا اور باپ ادھیڑ عمر کا بوڑھا۔ شفاعت نے فیصلہ کر لیا کہ وہ باپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

آخر موقع ملنے پر شفاعت نے اسے کہتوں میں لے جا کر لاشی کی ضربوں سے مار ڈالا۔ شفاعت کو عمر قید ہو گئی۔ یہ قید بحال رہی اور اسے کانتی پڑی۔ پیچھے کچھ عرصہ کے بعد شاداں کی ماں مر گئی اور شفاعت کے گھر آنے تک شاداں کی قابل رشک جوانی بھی بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی۔ کچھ عرصہ ہوا شفاعت بھی اس دنیا فانی سے کوچ کر گیا۔ شاداں ابھی بقیہ حیات ہے۔ جوانی میں ہیر کھلانے والی شاداں کا حسن بڑھاپے میں بھی ناند نہیں پڑا ہے۔



رودت کو لٹے پر گرماری کہ میں دور جا گرا۔ اس کا نوکیلا سینک میرے کولھے میں اتر گیا تھا اور مجھے زخمی کر گیا۔ تیل پھر میری طرف دوڑا۔ میں اپنی پوری قوت مجتمع کر کے اٹھ کھڑا ہوا اگر میں نہ اٹھتا تو تیل مجھے مار ڈالتا۔ میں دوڑا پڑا۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا، میں نے باپ کو مرتے دیکھا تھا۔ وہ بہت اذیت ناک موت مرا تھا۔ میں دوڑنے کے قابل نہیں تھا لیکن موت کے ڈر سے دوڑ پڑا۔ تیل بھی میرے پیچھے بھاگا لیکن تھوڑی دور بھاگنے کے بعد رک گیا اور واپس میرے مرے ہوئے باپ کی طرف چلا گیا اور اسے جا کر چاٹنے لگا۔ میں بھاگ آیا اور گدھالہ چلا گیا۔ وہاں پر گھرتے ہی مجھے ہوئے شخص نے مجھے کہا کہ تمہارا باپ مر گیا ہے۔ میں روتا پیتا گھر کو دوڑا دیکھا کہ لوگ باپ کی میت گھر لے آئے تھے۔

اس کا سارا سر زخمی تھا۔ اس پر خون جما ہوا تھا اور رت بھی رہا تھا۔ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ میں نے کہا جلدی کرو اسے دفن کر دیں۔ میت کو اندروٹھے (اندرو والے کمرے) میں لے جا کر غسل دیا اور جلدی جلدی میں میت دفنادی۔

جب قاتل سے پوچھا گیا کہ اس نے باپ کا قتل کیوں کیا؟ تو اس نے بتایا کہ اس نے یہ قتل اپنی بیوی شاداں کے کہنے پر کیا ہے جس کی کہانی کچھ یوں تھی کہ جب ماں بیٹی ساس بہو بن کر اس گھر میں آئیں تو ان کے مابین روایتی رقابت کا جذبہ جاگ اٹھا۔ برتن سے برتن ٹکرانے لگے۔ وہی آٹا گوند جتنے ہلتی کیوں ہو والی بات۔ منہ ماری شروع ہو گئی۔ ایک روز باتوں باتوں میں بیٹی نے ماں کو طعنہ دیا کہ تم تو وہ ہو جو میرا باپ کھا گئی تھی۔ میرے باپ کو تم نے مارا تھا، وہ اپنی موت نہیں مرا تھا اور وہ بھی اپنے اس یار کے پیچھے جواب تمہارا خاوند ہے لیکن تم دیکھنا میں تمہارا یہ ماں بھی توڑ کر رکھ دوں گی۔ میرا نام بھی شاداں ہے۔ اسی روز سے شاداں نے شفاعت کو اپنے

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

انتقام

"میں حماس کے شیطانی بچوں کو نیست و نابود کر دوں گا"۔ یمن ہاؤس نے گرج کر کہا۔ "یہ انتقامی کارروائی ایسے کی جائے کہ اخبارات یہ نہ کہیں کہ اسرائیل نے بدلہ چکایا ہے..... یہ انصاف اور کئے کی سزا نظر آنا چاہئے۔"

قسط: 6 ☆ 00447424014120 میاں محمد ابراہیم طاہر



”ابو جہاد“ کا قتل

اکتوبر 1995ء کے وسط کی بات ہے، موساد انٹرنل سکیورٹی کا ایک انجینئر دتی ٹیکنر کے ذریعے ملے جلے ایپ کے نواح میں ہسکر سٹریٹ (Plinsker St.) پر واقع ایک اپارٹمنٹ کا جائزہ لے رہا تھا جہاں وہ اندر کی کھنگو اور بات چیت سننے کے لئے ”ہنگ ڈیوائس“ لگاتا چاہتا تھا۔ یہ اپارٹمنٹ ان بے شمار گھروں میں سے ایک تھا جو موساد نے شہر بھر میں اپنی خفیہ سرگرمیوں کے لئے بطور محفوظ ٹھکانے، حاصل کر رکھی تھیں۔ ہنگ ڈیوائس لگانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہاں کچھ ہی دیر بعد موساد کے بڑوں کی انتہائی اہم میٹنگ ہونے والی تھی۔

اپارٹمنٹ میں موجود فرنیچر معمولی قسم کا تھا۔ کچھ معمولی قسم کی اسرائیلی سیاحوں کی تصویریں ستے قسم کے لریوں میں لگی دیواروں پر لٹک رہی تھیں۔ ہر کمرے میں الگ ٹیلیفون موجود تھا جس کا کسی ڈائریکٹری میں اندراج نہ تھا۔ ہاورچی خانے میں گھریلو استعمال کے برتنوں کی جگہ کپیوٹر موزیم، کاغذات کترنے والی مشین، ٹیکس مشین اور چولہے کی جگہ پر ایک سیف نصب تھی۔

ایسے اپارٹمنٹ یا محفوظ ٹھکانے موساد کے زیر تربیت جاسوسوں کی رہائش، ٹریننگ عملی تربیت، دوسروں کا شہر میں پھینکا کرنے، اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے، ہلاکت خیز لیٹر بکس تیار کرنے، نظر نہ آنے والی سیاسی رپورٹ لکھنے اور اشاروں کنائیوں میں ایک دوسرے کو اطلاعات پہنچانے کی تربیت دی جاتی تھی اور زیر تربیت جاسوس جو یہیں گھنٹے اپنے اساتذہ کی نظروں میں رہتے تھے۔ عام لوگوں سے دوستی اور پیار محبت کے تعلقات پیدا کرنے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے ٹر سکھائے جاتے تھے۔ انہیں ذہن نشین کرایا جاتا تھا کہ ”وہ کام جو موساد اور اسرائیل کے

مخالف میں ہو غلط یا صحیح کر گزر رہا۔“

1991ء میں موساد کے ایک جوئیرالسر وکٹر اوٹنر وکی کے انکشاف کے مطابق دنیا بھر میں موساد کے تربیت یافتہ جاسوسوں کی تعداد 35000 ہزار تھی۔ ان میں سے عربوں کو بلیک ایجنٹ اور ہاقیوں کو وائٹ ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ ان میں سے 20 ہزار ہمہ وقت اپنی نظریہ کارروائیوں میں مصروف رہتے تھے اور 15 ہزار ایسے تھے جو اشارے کے منتظر رہتے تھے، انہیں سلیپر کہا جاتا تھا۔

اسی روز بعد دوپہر شد کردہ اپارٹمنٹ یا محفوظ ٹھکانے پر اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سینئر حکام کا اجلاس ہوا جس میں ”ایک شخص“ کے قتل کی منظوری دی گئی اور اس کا طریق کار طے کیا گیا۔ وزیراعظم یزہاک راہن (Yitzhak Rabin) کی طرف سے پہلے ہی اس شخص کے قتل کا منصوبہ منظور کیا جا چکا تھا۔

عین سال قبل، جب سے راہن وزیراعظم بنے تھا، وہ فلسطینی دہشت گردوں کے ہاتھوں اسرائیلی فوجیوں، جاسوسوں اور شہریوں کے جنازوں کو کندھا دیتے دیتے تھک چکا تھا۔ اس قتل کی نگرانی اُس نے اپنے ذمہ لے لی تھی جبکہ وہ 1988ء میں وزیر دفاع تھا۔

یاسر عرفات کا نائب غلیل الوزیر جو عرب دنیا اور اسرائیلی انٹیلی جنس موساد کے حلقوں میں ابو جہاد کے نام سے مشہور تھا۔ اسرائیلی جاسوسوں، مجرموں، فوجیوں اور شہریوں کو نشانہ بنانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ مل ایپ کی ہسکر سٹریٹ کے اسی اپارٹمنٹ میں ابو جہاد کی ہلاکت کا فیصلہ ہوا تھا۔ ابو جہاد کا معنی تھا ”مقدس جنگ کی آواز“۔

غلیل الوزیر معروف ہے ابو جہاد 1988ء میں تونس (Tunisia) میں رہتا تھا۔ اُس کا رہائشی بنگلہ تونس کے لواح میں سدی یوحید کے علاقے میں تھا۔ دو مہینے تک

ایک جہاز میں وزیرو دفاع بن ہاک راہن اور دوسرے اعلیٰ ملٹری افسر تھے۔ ان کا جہاز مسلسل محفوظ ریڈیو کے ذریعے قاتل ٹیم سے رابطے میں تھا جو موقع واردات پر پہنچ چکی تھی۔ اس قاتل ٹیم کے نگران کو "کوار" کا کوڈ نام دیا گیا تھا۔ دوسرے جہاز میں جنرل اور نگرانی کے آلات گئے ہوئے تھے۔ دوسرے دو بونگ 707 لیول ٹینکر کے طور پر اڑ رہے تھے۔ ابو جہاد کے ہنگے کے اوپر، انتہائی بلندی پر اب یہ جہاز چکر لگا رہے تھے اور اپنے محفوظ ریڈیو کے ذریعے زمین پر ہونے والی ہر حرکت کی نگرانی کر رہے تھے اور ابو جہاد کے ہنگے میں پہلے سے نصب کئے گئے آلات سماعت کے ذریعے ہنگے کی ہر آواز انہیں صاف اور واضح سنائی دے رہی تھی۔ 17 اپریل کو، آدمی رات کے کچھ ہی دیر بعد انہوں نے اپنے آلات کے ذریعے سنا کہ ابو جہاد اپنی مرشدین کار کے ذریعے ہنگے میں آیا ہے۔ یہ مرشدین کار اسے یا سر عرفات نے شادی کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ اب قاتل ٹیم بھی ہنگے کے اندر ہونے والی ہر حرکت اور آواز کو سن رہی تھی۔ ٹیم کے لیڈر کوار نے اپنے لیڈوں کے ساتھ گئے مائیکروفون میں سرگوشی کی کہ وہ ابو جہاد کو میزبیاں چاہتے ہوئے سن رہا ہے۔ اپنی بیوی سے کھسکھسرتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں اپنے سوئے ہوئے بیٹے کا بوسہ لے رہا ہے۔ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہا ہے۔ آخر میں وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں، جو چھٹی منزل پر تھا چلا گیا ہے۔ یہ تمام لمحہ بہ لمحہ کی تفصیل الیکٹرانک آلات سے حرین جہاز کے ذریعے راہن کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ صبح 12:17 بجے راہن نے حکم دیا۔ "گو۔"

ہنگے کے صحن میں ابو جہاد کا ڈرائیور مرشدین کے اندر ہی سو رہا تھا۔ کوار کی ٹیم کے ایک رکن نے اپنے سلفر گے بریٹا پستول کی ایک گولی اس کے کان کے اندر فائر کر کے فرنٹ سیٹ پر موت کی نیند سلا دیا۔ کوار

موساد کے ٹھکانے ایجنٹ اور جاسوس ابو جہاد کی نگرانی کرتے رہے۔ جن راستوں سے وہ گھر سے نکلتا تھا، جن سڑکوں سے گزرتا تھا، اس کے ہنگے کے ارد گرد گئے ہنگے کی مضبوطی، اونچائی، دروازوں، کھڑکیوں، ٹالوں کی قسم، حفاظتی حصار، محاطوں کی تعداد، اس کی گھر میں آمد و رفت کے اوقات، غرضیکہ موساد کے ٹھکانے ایجنٹوں نے ہر چیز نہایت احتیاط، ہر ایک مٹی سے بار بار چیک کی۔ انہوں نے ابو جہاد کی بیوی کو اپنے گھر میں اپنے بچے کے ساتھ کھلتے ہوئے بھی دیکھا اور جب وہ شاپنگ کے لئے بازار گئی اور ہال کٹوانے میجر ڈریس کی دکان میں داخل ہوئی تو انتہائی قریب سے اس کا جائزہ لیا۔ انہوں نے اس کے خاوند کی ٹیلیفون کالیں بھی سنیں اور اس کی خواب گاہ میں خفیہ بات چیت سننے کے آلات (ہلنگ ڈیوائس) بھی لگا دیں اور میاں بیوی کے ہم بستر ہونے کی آوازیں بھی ریکارڈ کیں۔ جاسوسوں نے ابو جہاد کے گھر کے کمروں کا فاصلہ بھی نوٹ کر لیا اور ان کے مسابو کی سرگرمیوں پر نظر رکھی اور ان تمام گاڑیوں کی رجسٹریشن نمبر، میک اور ماڈل بھی نوٹ کئے جو اس کے گھر میں آیا جا رہا کرتی تھیں۔

اپنے کام سے مطمئن ہو کر موساد کے ایجنٹوں کی ٹیم واپس تل ابیب چلی گئی۔ اگلا مہینہ انہوں نے اس ہلاکت خیز مشن کی عملی تکمیل کے لئے حید کے لواحق میں ابو جہاد جیسے ہنگے میں بار بار پریکٹس کی۔ قاتل ٹیم کے ذہن میں یہ بات بنی تھی کہ ابو جہاد کے ہنگے میں داخلے کے بعد 22 سیکنڈ کے اندر اسے قتل کر کے ٹیم کو ہنگے سے نکل آنا ہے۔

16 اپریل 1988ء کو مشن کی تکمیل کا حکم صادر کر دیا گیا۔

اس رات اسرائیلی ایئر فورس کے بونگ 707، کئی جہازوں نے تل ابیب کی جنوبی اتر میں سے اڑان بھری۔

کی مدد سے بائیو کیمیکل اہتیار بنائے جاسکتے تھے۔ موساد کی طرف سے کدو کو اس طرح قتل کیا گیا تھا کہ اُس کے دلوں بازو اور ٹانگیں دھڑ سے الگ کر دی گئی تھیں۔

جوہانسبرگ پولیس کے پیپ تحقیقاتی انسپٹر کرنل چارلس لینڈ مین نے بتایا کہ اس قتل کا صاف مقصد اسرائیل کی طرف سے موساد کے ذریعے ایک پیغام دینا تھا کہ اسرائیل دشمنوں کی خفیہ مدد کرنے والے "مساد" کی پہنچ سے دور نہیں ہیں۔

ابو جہاد کی ہلاکت سے چھ ہفتے قبل موساد نے ایک اور قتل عام میں حصہ لیا تھا جبکہ جبل الطارق میں آرٹس ری پبلک آرمی (IRA) کے تین غیر مسلح ممبران کو برطانیہ کی سوشل انٹروسوز کی وردیوں میں ملہوں افراد نے اتوار کی سہ پہر کو گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔ برطانوی انٹیلی جنس کے ممبران کو ایسے قتلوں کی تربیت گزشتہ سالوں میں مل ایب میں دی گئی تھی اور انہیں دکھایا گیا تھا کہ موساد کے خفیہ ایجنٹ بیروت شہر کی گلیوں اور لبنان کی بقاء ویلی میں کس مہارت اور چابک دستی سے عرب دہشت گردوں کا شکار کرتے ہیں۔

آئی آر اے کے ان تین ممبران کے قتل سے چار ماہ پہلے موساد کے ایجنٹوں نے ان تینوں مائی ریڈ فاریل زبان ساوتج اور ویٹیل میک کان کی گمرانی شروع کر دی تھی کیونکہ موساد کو شبہ تھا کہ وہ آئی آر اے (IRA) کے لئے عربوں سے اسلحہ خرید کر بلقاسٹ پہنچا رہے ہیں۔

موساد اور برطانوی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے درمیان تعاون اور رابطوں کا آغاز اُس وقت پیچھے کی وزارت عظمیٰ کے دور میں ہوا تھا جب انتہائی خفیہ طور پر موساد کے سربراہ رانی ایٹان کو بلقاسٹ بلایا گیا تھا تاکہ وہ سیکورٹی اداروں کو آئی آر اے اور حزب اللہ کے درمیان بڑھتے ہوئے رابطوں اور تعاون ہارے ثبوت اور معلومات مہیا کر سکیں۔ ایٹان کے اپنے الفاظ میں:

اور قاتل نیم کے ایک دوسرے ممبر نے رہائش گاہ کا لوہے کا بھاری گیٹ ایک ایسے پلاسٹک دھماکہ خیز مواد سے اڑا دیا جو آواز ہلکے پیدا نہیں کرتا۔ گیٹ کے اندر ابو جہاد کے وہی لفٹ گیٹ کے اچانک گرنے سے شدید کھڑنے تھے کہ سلعس لگے پستول کی دو گولیاں دلوں کے دماغ سے آ رہی ہو گئیں۔ مطالعے کے کمرے کی طرف بھاگتے ہوئے تلواریں دیکھا کہ ابو جہاد تحریک آزادی فلسطین کی ایک ویڈیو دیکھ رہا ہے۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر جیسے ہی اُس نے اٹھنے کی سعی کی تلواریں نے اپنے خاموش پستول کی دو گولیاں اُس کے سینے میں اتار دیں اور جیسے ہی وہ فرش پر گرے تلواریں نے دو مزید گولیاں اُس کے دماغ کے آ رہی پار کر دیں۔ تلواریں جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا ابو جہاد کی بیوی اپنا بچہ گود میں اٹھائے سامنے آ گئی۔ تلواریں نے اُسے عربی زبان میں حکم دیا۔ "واہس اپنے کمرے میں چل جاؤ۔"

پھر قاتل نیم رات کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔ جگہ میں داخل ہونے سے لے کر اپنا مشن مکمل کر کے باہر نکلنے تک انہیں صرف 13 سیکنڈ لگے۔ اُس سے نو سیکنڈ کم جس کا انہوں نے اپنی پرنکٹس اور ٹریٹنگ کے دوران اندازہ لگایا تھا۔

اس قتل کے بعد پہلی دفعہ اسرائیل میں رد عمل سامنے آیا۔ کابینہ کے وزیر ایزر وائزمن (Ezer Weizman) نے کہا۔ "اس طرح کے انفرادی قتلوں سے امن بحال نہیں ہو سکتا۔"

لیکن موساد کی طرف سے قتل و غارت گری کا عمل پھر بھی جاری رہا۔

دو ماہ بعد ساؤتھ افریقہ کی پولیس بھی زبان کھولنے پر مجبور ہو گئی جسے اسرائیل نے خاموشی اختیار کرنے کے لئے دباؤ ڈالا تھا کہ جوہانسبرگ کے ایک معروف تاجر الان کڈگر (Allan Kidger) کو جو ایران اور عراق کو انتہائی جدید ترین ٹیکنیکی ساز و سامان سپلائی کر رہا تھا جس

بہت سی کھنچیں موساد نے مخبری کر کے بلقاٹ کو جاتے ہوئے رستے میں پکڑا دیں۔

اکتوبر 1995ء کے جس اجلاس کا ذکر اس باب کے شروع میں کیا ہے اس میں ایک اور عرب مجاہد اور مذہبی رہنما اسلامک جہاد کے قائد فاتی شکا کی (Fathi Shakaki) کے قتل کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ موساد نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ اسی سال جنوری میں بیت لد (Belt Lid) کے مقام پر دو خودکش حملہ آوروں کے ذریعے اسرائیلی بس پر حملے کی منصوبہ بندی اس کی تنظیم نے کی تھی جس میں 20 سے زائد مسافر ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے تھے اور بس بالکل تباہ ہو گئی تھی۔

دہشت گردی کے اس حملے نے چوتھائی صدی کے دوران ایسے حملوں کی تعداد دس ہزار سے اوپر پہنچا دی تھی۔ اس میں چار صد اسرائیلی مارے گئے اور ہزار سے زائد پانچ بن گئے تھے۔

اس بے رحم دنیا میں شکا کی (Shakaki) کو اس کے لوگ "شیر" بنا کر پیش کرتے تھے۔ یعنی انتہائی بڑے بہادر اور جی دار۔ اس نے خودش بمبار لڑکوں کو قرآن کی خودکشی بارے پابندی کے خلاف، مغفرت کی دعا دیتے ہوئے دہشت گردی کی اجازت دی تھی۔ اس نے جواز پہ پیش کیا تھا کہ مظلوموں کے حق کے لئے جان قربان کرنا جائز ہے۔

اس طرح مذہب کی غلط تعبیر سے، مذہبی جوش و جذبے کے تحت دونوں جوان دوسروں کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

بعد ازاں شکا کی نے نہ صرف جہادی اخبارات میں ان کے تعزیت نامے چھپوائے بلکہ نماز جمعہ کے بعد دعائیں بھی، ان کی قربانی کی تعریف کی اور ان کے والدین کو یقین دلایا کہ ان کے بچے سیدھے جنت میں گئے ہیں۔

"میں جب آئرلینڈ پہنچا تو بارش برس رہی تھی۔ وہاں ہر روز ہی بارش ہوتی رہتی تھی۔ میں نے برطانویوں کو وہ سب کچھ بتا دیا جو ہمارے علم میں تھا۔ پھر میں نے صوبے کا دورہ کیا اور ریپبلک کی سرحد تک چلا گیا۔ میں غلط تھا کہ کہیں سرحد پار نہ کر جاؤں۔ اگر ریپبلک والے مجھے پکڑ لیتے آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ان کا کیا رد عمل ہوتا۔"

"واپسی سے قبل میں نے پیش آرمی سروں (SAS) سے کہا کہ وہ اسرائیل آئیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ ہم دہشت گردوں سے کس طریقے سے نبھتے ہیں۔"

چنانچہ انہی ابتدائی دنوں سے ایس اے ایس اور موساد کے درمیان قریبی تعاون کے تعلقات پیدا ہو گئے۔ موساد کے سینئر اسرائیلی اے ایس کے ہنر فورا میں واقع ہیڈ کوارٹر کے دورے کر کے موساد کی طرف سے مل ایسٹ میں کئے جانے والے آپریشنوں ہارنے کو شل فورمز کو آگاہ کیا کرتے تھے کم از کم ایک دفعہ موساد اور ایس اے ایس نے باہمی اشتراک سے آئی آر اے کے سینئر رہنماؤں کی بلقاٹ سے بیروت تک گھرائی کی اور حزب اللہ کے رہنماؤں سے ملاقات کرتے ہوئے ان کی تصویریں بھی اتاریں۔

اکتوبر 1987ء میں بیروت میں موساد کے ایجنٹوں نے ایک بحری کشتی ایکسوند (Eksund) کا سراغ لگا جو سیڈی ٹیرین سمندر میں محو سفر تھی۔ اس کشتی پر 120 ٹن ہتھیار لدے ہوئے تھے جس میں زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل، راکٹ پروپیلنڈ گرینینڈ اور فوجی مشین گنز، دھماکہ خیز مواد اور ڈیٹونیٹر وغیرہ شامل تھے اور یہ تمام اسلحہ آئی آر اے کے آدمیوں نے بیروت میں اپنے رابطوں کے ذریعے خرید لیا تھا۔ اس بحری کشتی کو فرانسیسی حکام نے پکڑ لیا۔ اسی طرح کی اسلحہ کی اور بھی

اُس کا لباس لندن کے ساول دو سنور کے بہترین کپڑے سے بنا ہوا چنڈ اور پاؤں میں روم سے خریدے ہوئے مہنگے ترین جوتے ہوتے تھے۔ وہ عام چپل نہیں جو وہ لوگوں کے سامنے آتے وقت پہنا کرتا تھا۔

اپنے پسندیدہ کھانے کی میز پر بیٹھا وہ اپنی اہلیہ کو یقین دہانی کرا رہا تھا کہ اُس کا آئندہ کالیسیا کا سفر انتہائی محفوظ اور ہر لحاظ سے کامیاب رہے گا اور وہ لیبیا کے انقلابی لیڈر معمر قذافی سے دس لاکھ ڈالر کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس کی اُس نے اپنے فلمس پیغام کے ذریعے لیبیا کی انقلابی کونسل کے ہیڈ کوارٹر سے درخواست کر رکھی تھی۔ معمول کے مطابق یہ رقم لیبیا کے سرکاری بینک کے ذریعے ترکیبولی سے مالٹا کے ذریعے دلیتا بینک کی برانچ میں منتقل کر دی جائے گی۔

شکا کی ایک دن کے لئے طیارے پر جائے گا اور رقم لکھوا کر اگلی فلائٹ سے واپس گھر آ جائے گا۔

اُس کے دو کمسن بیٹوں کو جب اپنے ابا کے مالٹا جانے کی بجھک پڑی تو انہوں نے بھی اپنے تحائف کی لہرست اُسے تھما دی جس میں آدمی درجن شیش بھی شامل تھیں جو مالٹا کے اس شور کی بنی ہوئی تھیں جہاں سے وہ پہلے بھی خریداری کیا کرتا تھا۔

فاطمہ کو یاد آتا ہے کہ "اُس کے میاں کا خیال تھا کہ اگر اسرائیلیوں نے اُس کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہوتی تو اب تک کر چکے ہوتے کیونکہ یہودی انتقام لینے میں دیر نہیں لگاتے۔"

فاطمہ شکا کی حریف کہتی ہے کہ "میرے خاوند کو یقین تھا کہ اسرائیلی اُس کے خلاف کوئی ایکشن لے کر شام کی ناراضگی کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔" (شام اور اسرائیل کے درمیان امن کا معاہدہ ہو چکا تھا)

تین مہینے پہلے تک تو تل ابیب کا رویہ وہی تھا جس کا شکا کی نے اندازہ لگایا تھا۔ 1995ء کی گرمیوں کے

چنانچہ جس علاقے اور گلی محلوں میں شکا کی کا اثر و رسوخ تھا وہاں کے والدین بڑے فخر کے ساتھ اپنے نوجوان بچے جہاد کے لئے اُسے پیش کرنے لگے۔ اب تک جو قربان ہو چکے تھے ان کے حق میں ہر اذان کے بعد لاڈلہ سیکر پر دعا میں کی جاتی تھیں اور جنوبی لبنان کے معتدل مومنین والے علاقوں میں مسجدوں میں شہدا کو یاد کیا جاتا تھا۔

شکا کی نے اپنے لئے مجاہد تیار کر لئے۔ ان کا ہدف مقرر کر لیا گیا اور شکا کی نے انہیں بم سازوں کے سپرد کر دیا۔ یہ وہ ماہرین تھے جو اپنے ہدف کی تصویر دیکھ کر یہ فیصلہ کرتے تھے کہ اس کی بتائی کے لئے کتنا دھماکہ خیز بارود چاہئے۔ وہ اپنے تجربے اور جبلت کے تحت کام کرتے تھے۔ کام کے دوران ان کی زبان پر ہمیشہ الحمد للہ، استغفر اللہ، انشاء اللہ، ماشاء اللہ جیسے کلمات جاری رہتے تھے کیونکہ وہ شکا کی کے معتقد تھے۔ وہ انہیں بتاتا تھا کہ "ہم اسی لئے زندہ ہیں کہ ہم اپنے دشمن اسرائیل کا مقابلہ کر رہے ہیں۔"

اکتوبر کی اس سہ پہر کو جب کہ تل ابیب کے ایک حفاظتی مرکز میں اُس کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ شکا کی اپنی بیوی فاطمہ کے ساتھ اپنے گھر دمشق (شام) میں موجود تھا۔ مہاجر کیمپ کے عام گندے ماحول کی نسبت اس کا اپارٹمنٹ بڑا صاف ستھرا اور خوبصورت تھا اور اس کی عزت اور احترام تھا۔ اس کے گھر میں قیمتی قالین اور دیواری سجادیں ایران کے آیت اللہ سے ملے ہوئے تحائف تھے۔ سونے کے فریم میں لگی ہوئی شکا کی اور معمر قذافی کی تصویر لیبیا کے رہنما کا نقشہ تھا۔ پانچویں کا بنا ہوا ایک کافی سیٹ شام کے صدر کا عنایت کردہ انعام تھا۔ اس کے کپڑے اس سادہ سے گون سے بہت اعلیٰ قیمتی تھے جو وہ اپنے جنوبی لبنان کے غریب عوام کے درمیان نماز کے خطبات کے دوران پہنا کرتا تھا۔ گھر کے اندر

موجود اپنے بلیک لیٹس کو حکم دیا کہ وہ شکا کی کے پارلمنٹ کی الیکٹرانک نگرانی شروع کر دے۔ اسرائیلی ایجنٹ کے پاس سر ویلیس اور نگرانی کے امریکن ساختہ جدید ترین الیکٹرانک آلات موجود تھے جبکہ شکا کی کے پارلمنٹ میں لگے ہوئے روسی ساختہ حفاظتی اور وارننگ دینے والے آلات کم معیار اور گھنٹیا قسم کے تھے جنہیں ناکام اور بیکار بنانا اسرائیلی ایجنٹ کے لئے مشکل کام نہ تھا۔

شکا کی نے اپنے دور، لیویا اور مالٹا کی جو منصوبہ بندی کر رکھی تھی اُس کی تمام تفصیل موساد کے ایجنٹ نے تل ابیب پہنچا دی کیونکہ ہنگ ڈیوائسز کے ذریعے گھر کے اندر ہونے والی ہر بات اُسے سنائی دے رہی تھی۔ اب اکتوبر 1995ء کی سہ پہر کو اسرائیل کی تین نہایت طاقتور ایٹمی جنس ایجنسیوں کے سربراہ ہنسرک شریٹ کی پُر جھوم ٹریک میں سے راستہ بناتے ہوئے اپنے محفوظ ٹھکانے پر جمع ہوئے تھے۔ ہر ایک نے اسرائیل کے خود ساختہ دشمن کی ہلاکت کے فیصلے کی تائید و توثیق کر دی۔ میئر امیت (Meir Amit) جب موساد کا ڈائریکٹر جنرل تھا (1963-68) تو اُس نے اُن ہلاکتوں کے سلسلے میں ایک طریق کار اور رہنما اصول وضع کیا تھا جس میں کہا گیا تھا۔

”سیاسی رہنماؤں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اُن سے سیاسی طریقے سے ہی نبھا جائے گا۔ دہشت گردوں کے اہل خاندان کو ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ ہاں اگر کسی دشمن سے بچنے وقت اس کے خاندان کا کوئی فرد بچ میں آ جائے تو یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہوگا۔ ہر قتل کی منظوری اُس وقت کا موجودہ وزیراعظم (اسرائیل) دے گا اور ہر اقدام تو اعداد و ضوابط کے تحت اٹھایا جائے گا۔ قتل کے فیصلوں کو تحریر کیا جائے گا۔ ہر کام امتحان سنائی اور عمدگی سے انجام پانا چاہئے۔ ہمارے اقدامات کو ریاستی سرپرستی میں قتل کی نظر

شروع میں رابن (وزیراعظم) نے موساد کا یہ منصوبہ رد کر دیا تھا کہ دمشق کے نواح میں شکا کی کے پارلمنٹ کو آتش گیر مادے سے جاہ کر دیا جائے۔ یورپی ساؤئی (Uri Saguy) جو اس وقت اسرائیلی طہری ایٹمی جنس کا سربراہ اور تمام خفیہ ایجنسیوں کا نگران تھا اور موساد بھی جس کی ماتحتی میں آتی تھی نے رابن کو بتایا تھا کہ اُس نے دمشق کے روپے میں بہت بڑی تبدیلی محسوس کی ہے اور (صدر حافظ) اسد (شام) اب بھی ہمیں سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے۔ اس کی قتل کے لئے ہمیں کوئی غیر متوقع اقدام کرنا چاہئے ہمیں گولان ہائٹ (Golan Heights) کو مکمل طور پر خالی کر کے وہاں سے اپنے ہر آدمی کو نکلنے کا حکم دینا چاہئے۔ اگرچہ یہ بہت بڑی قیمت ہے لیکن دیر پا امن کے لئے ہمیں یہ قیمت ادا کر دینی چاہئے۔“

وزیراعظم نے اُس کی بات توجہ سے سنی۔ اُسے معلوم تھا کہ گولان کے دفاع کے لئے یورپی گوئی نے کس قدر قربانیاں دی ہیں اس کے طہری کیریئر کا بیشتر حصہ گولان کی پہاڑی چٹانوں کے دفاع میں لڑتے ہوئے گزرا ہے۔ اس دوران وہ چار مرتبہ زخمی بھی ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ سب کچھ بھلا کر اسرائیل کے لئے طویل المدت پائدار امن حاصل کرنا چاہتا تھا۔

وزیراعظم نے شکا کی کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے کو اُس وقت تک کے لئے معرضہ التوا میں ڈال دیا تھا، جب تک یورپی ساگوئی امن کی کوششوں میں ناکام نہ تھا۔

لیکن اس ریجن کے گرمائی موسم میں ان کی امن کی امیدیں مرجھا چکی تھیں اور وزیراعظم رابن نے، جواب امن کا نوبل انعام (یا سر عرفان کے ساتھ مشترکہ) بھی حاصل کر چکا تھا، شکا کی کے قتل کی منظوری دے دی۔

موساد سربراہ شہجائی شاول (Shavit) جس کا یہ آخری آپریشن تھا، نے دمشق میں

پوری ساگوئی کہنے لگا۔ "ہم شاید ہی کبھی ایک دوسرے کا مقابل کرتے ہیں۔ میں امان کے سربراہ کی حیثیت سے آپ دونوں پر نظر رکھتا ہوں۔ ہمارے درمیان کام کا مقابلہ رہتا ہے لیکن ہمارے مختلف طریقوں سے کام کرنے کا مقصد وحید وہی ہوتا ہے، اسرائیل کی حفاظت لہذا سب ٹھیک رہتا ہے۔"

وہ تینوں دو گھنٹے تک رہائی کرے کی میز کے گرد بیٹھے فوجی شکاک کی قتل کے منصوبے پر غور کرتے رہے۔ اس کی ہلاکت محض انتقام ہوگا۔ جیسا کہ اسرائیل کا بائبل پر ایمان ہے۔ "آکھ کے بدلے آکھ" لہذا ایسے قتلوں کو اسرائیلی جائز اور برحق سمجھتے ہیں لیکن موساد کے ایجنٹ بعض اوقات ایسے ضدی اور خود مبرا فرد کو بھی قتل کر دیتے تھے جو اپنا ہنر، تجربہ اور علم اسرائیلی خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے قتل کہ اس کا ہنر، تجربہ اور علم دشمن کے ہاتھ لگے، اسے ختم ہو جانا چاہئے۔

کینڈا کا ایک سائنسدان ڈاکٹر گریرالڈ دنیا کا عظیم ہیرل بالستکس (Dr. Gerald Bull Barrel Ballistics) کا ماہر تھا۔ اسرائیل اس کی مہارت اور تجربے کو خریدنے کی کئی کوششیں کر چکا تھا۔ ہر دفعہ ہی ڈاکٹر بیل نے یہودی ریاست سے فاصلہ رکھنے کی کوشش کی۔

اس کے برعکس اس نے اپنی خدمات صدام حسین کو ایک ایسی سپر گن بنانے کے لئے پیش کر دیں جو ایٹمی، کیمیائی اور جراثیمی مواد والے گولے عراق سے براہ راست اسرائیل کے اندر تک فائر کرنے کے قابل تھی۔ اس سپر گن کی ہیرل کی لمبائی 487 فٹ اور 32 ٹن وزنی ایسے خصوصی سٹیل سے بنائی گئی تھی جو ایک برطانوی فرم نے سپلائی کیا تھا۔ 1989ء کے آخر میں شمالی عراق کے شہر موصل کے توپ خانے میں اسے ٹسٹ کیا گیا تھا۔

سے نہیں دیکھا جانا چاہئے بلکہ عدالتی فیصلوں پر حکومتی عمل درآمد کا نتیجہ دکھائی دینا چاہئے۔ ہمیں قانون و قواعد پر عمل درآمد کنندگان کے طور پر نظر آنا چاہئے۔"

جب سے 1972ء میں اوپیک گیمز کی اسرائیلی میم کے قاتلوں کو انتہائی کامیابی کے ساتھ تلاش کر کے ہلاک کیا گیا تھا بعد میں قتل کئے جانے والوں کے سلسلے میں عموماً ان ہدایات کو مد نظر رکھا جاتا رہا تھا، میٹراسیت کی موساد کی سربراہی سے رخصت ہونے کے 23 سال بعد تک اس کی ہدایات پر عمل ہوتا آیا تھا۔ آج کی میننگ میں پہنچنے والا پہلا شخص موساد کا ڈائریکٹر جنرل شتائی شادوت تھا جس کے بارے میں اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ وہ لباس اور شکل و شباہت سے گل ایب کے کسی ادنیٰ درجے کے ہوٹل کا استقبالی کلرک لگتا ہے۔ اکثرے ہوئے احتیاط سے استری شدہ کپڑے اور ہاتھ ملانے وقت مخالف کے ہاتھ کو صرف چھوتا تھا۔ وہ تین سال سے اس عہدے پر کام کر رہا تھا اور ہمیشہ تاثر دیتا تھا کہ پتہ نہیں وہ کب یہ عہدہ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

میننگ میں آنے والا دوسرا شخص اسرائیلی دفاعی افواج کا چیف انٹیلی جنس افسر بریگیڈیئر جنرل دوران تاسیر تھا۔ تیز طرار، اپنے کیریئر کے انتہائی عروج پر اور اس کی چال ڈھال سے لگتا تھا کہ اس کی پوری زندگی دوسروں پر حکم چلانے میں ہی گزری ہے۔

اور آخر میں پہنچنے والا ملٹری انٹیلی جنس کے شعبہ امان کا ڈائریکٹر پوری ساگوئی تھا کسی ہیرو کی طرح نے تھے قدم اٹھاتا۔ نرم خو لیکن خود پسند۔ وہ اپنے ہمراہیوں کو اب بھی اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، عام خیال کے برعکس اور ظاہری پھوں پھال کے باوجود شام اب بھی امن کی بات چیت کرنے پر آمادہ ہے۔

تینوں انٹیلی جنس سربراہوں کے آپس کے تعلقات، شادوت کے الفاظ میں محتاط لیکن بے جوش تھے۔

کے ہر طبقہ خیال کے لوگ قدر، پسندیدگی اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور اُس کے اشارہ ابدیہ پر اسرائیل کے دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ 1960ء کی دہائی میں، جب جرمنی کے نازی سائنسدان، مصر کے ساتھ مل کر لمبی رینج کے ایسے راکٹ بنانے میں تعاون کر رہے تھے جنہیں صحرائے سینائی سے اسرائیل کے اندر تک قائر کیا جاسکے تو موساد نے ان جرمن سائنسدانوں کے قتل کی منصوبہ بندی کے لئے شامیر سے رہنمائی اور تجربہ حاصل کیا تھا۔ آزادی کی جنگ کے دوران برطانوی فوجیوں کو ہلاک کرنے میں اسے خصوصی ماہر بنانا پڑا تھا۔ شامیر نے اپنے زیر زمین کام کرنے والی خفیہ تنظیم کے گوریلوں کو جرمن سائنسدانوں کی ہلاکت کے مشن پر بھجوا دیا تھا۔ بعد ازاں قاتل مشن کے ایک ارکان اسرائیل کی آدلیس خفیہ تنظیم موساد کے بنیادی ممبر بنائے گئے تھے۔

شامیر نے ڈاکٹر بل کے بارے میں تیار کی موساد کی فائل پر سرسری نظر ڈالی۔ فائل میں ڈاکٹر بل کی ابتدائی زندگی کا خاکہ اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر بل کو 22 سال کی عمر میں فزکس میں ڈگری دی گئی تھی۔ پھر اس نے کینیڈا کی حکومت میں آرمانٹ اینڈ ریسرچ ڈیولپمنٹ اسٹیشن میں نوکری کر لی۔ وہاں اس کی اپنے سینئر افسران سے ان بن ہو گئی جس نے اس کے دل میں جو کرہ کی خلاف زندگی بھر کے لئے نفرت پیدا کر دی۔ چنانچہ اس نے اپنا ذاتی مشاورتی ادارہ قائم کر لیا جسے موساد کی فائل میں "کرائے کی توپیں" کہہ کر طرز کی گئی تھی۔

توپوں کی ساخت اور ایجاد میں اس کی شہرت 1976ء میں عروج پر پہنچ گئی جب اس نے 45 کلیمبر کی گن تیار کی جو 25 میل کے فاصلے پر اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکتی تھی اس وقت تک نیٹو کے پاس جو گن تھی اُس کی

صدام حسن نے 20 ملین ڈالر کی لاگت سے ایسی گن تو بنائے کا حکم دیا تھا۔ بل کو بطور مشیر اور صلاح کار ایک ملین ڈالر کی تنخواہ پر اس پر وجیکٹ پر رکھا گیا تھا۔ اس منصوبے کا کوڈ نام "بے بی لون" (Babylon) رکھا گیا تھا۔

ڈاکٹر بل کی کمپنی، سسٹمز ریسرچ کارپوریشن برسل (بلجیم) میں رجسٹر تھی اور اسے بطور عمارات اور پارکسٹ کی ڈیزائن کمپنی کے طور پر رجسٹر کرایا گیا تھا۔ وہاں سے کمپنی نے یورپ کے مختلف اداروں اور ٹیکسٹریوں کو اپنی ضروریات کا انتہائی پیچیدہ اور حساس ترین ساز و سامان، کمپنی کی مہیا کردہ تفصیلات کے مطابق آرڈر کیا تھا۔ ان سپلائرز میں برطانیہ کی 20 کمپنیاں اور تیار کنندگان ٹیکسٹریاں بھی شامل تھیں۔

17 فروری 1990ء کو موساد کا برسل میں قیامات ایک ایجنٹ بے بی لون سے متعلقہ دستاویزات اور تفصیلات کی ایک کاپی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سپر گن دراصل میڈیم رینج ہیلیکک میزائل دور تک مار کرنے والی ابتدائی خطرناک جدید ترین اور دنیا کی سب سے بڑی توپ تھی۔ اس میں آٹھ قسم کے سکڈ میزائل 1500 میل تک مار کرنے کی صلاحیت تھی۔ یہ نہ صرف اسرائیل کے ہر شہر کو نشانہ بنا سکتی تھی بلکہ اس کی پہنچ میں یورپ کے کئی شہر بھی آتے تھے۔ بل کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ ایک ایسی سپر گن بھی بنانے کے قابل ہو جائے گا جو براہ راست بغداد سے لندن تک مار کر سکے۔

موساد کے ڈائریکٹر جنرل ناہوم ادومونی (Nahum Admoni) نے فوری طور پر وزیراعظم یزہاک شامیر (Yitzhak Shamir) ملاقات کی درخواست کی۔ اسرائیل کی آزادی کے لئے برطانوی افواج کے خلاف بے جگری سے گوریلا جنگ لڑنے کی شہرت رکھنے والا شامیر ایک ایسا سیاسی لیڈر تھا جسے موساد

22 مارچ 1990ء کو بوقت 6.45 بجے شام تین افراد ایک کرائے کی کار میں اس اپارٹمنٹ بلاک تک کی طرف روانہ ہوئے جہاں بل کی رہائش تھی۔ تینوں کی جیکوں کے نیچے ہولسٹر میں پستول تھے۔

20 منٹ بعد دروازے کی کھنٹی کے جواب میں 61 سالہ بل نے اپنے پڑھیں اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا۔ بیک وقت 7.65 ایم ایم ایم پستول کی پانچ گولیاں اس کے دماغ اور گردن کے آر پار ہو گئیں۔ بل اپنے دروازے پر مردہ پڑا تھا۔ بعد ازاں بل کے بیٹے مائیکل نے دعویٰ کیا کہ بل کو وارننگ مل چکی تھی کہ موساد اسے قتل کر دے گی۔ وہ یہ وضاحت نہ کر سکا کہ وارننگ کس نے دی تھی اور اس کے باپ نے اس کی پروا کیوں نہ کی؟

جیسے ہی موساد کی قاتل ٹیم مشن کی کامیاب تکمیل کے بعد پہنچ گئی۔ موساد کے نفسیاتی جنگ کے شعبے کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے اخبارات، ٹی وی، ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ پر دروغ گوئی کی یہ کہانی پھیلائی شروع کر دی کہ گیر اللہ بل اس لئے ہلاک ہوا کہ وہ صدام حسین کے ساتھ کئے گئے اپنے معاہدوں سے منحرف ہو رہا تھا۔ جس طرح پانچ سال پہلے گیر اللہ بل کو جو کہ ایک سائنسدان تھا اور جسے اسرائیل نے اپنے خلاف ایک دہشت گرد قرار دے کر قتل کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح اسی شکار کی کو دہشت گرد قرار دے کر ایک نئے وزیراعظم یزہاک رابن کے حکم سے ہلاک کرنے کی حکمت عملی بنائی جا رہی تھی۔

24 اکتوبر 1995ء کو دو افراد جن کے کوڈ نام گل (Gill) اور ران (Ran) تھے اور جن کی عمر 28، 29 سال تھیں، دو مختلف فلائٹوں سے تل ابیب سے روانہ ہوئے۔ ران کی منزل ایتھنز (Athens) اور گل کی روم (Rome) تھی۔ دونوں ائرپورٹوں پر انہیں مقامی ایجنٹوں کی طرف سے نئے برٹش پاسپورٹ دیئے گئے۔ وہ شام گئے پہنچنے والی فلائٹوں سے الٹا پہنچے اور ڈیوٹیٹ

زیادہ سے زیادہ ریچ صرف 17 میل تھی۔ لیکن ایک دلدہ پھر ڈاکٹر بل کو حکومتی روپے نے انتہائی مایوس کیا۔ یورپ کے اسلحہ سازوں کی لابی نے نیٹو کو اس حدید اور موثر توپ کی خریداری روک دیا۔ آخر کار ڈاکٹر بل نے اپنی توپ جنوبی افریقہ کو فروخت کر دی۔

ڈاکٹر بل پھر چین پہنچا اور پینٹلز ریپبلک آرمی کی میزائلوں کی صلاحیت بڑھانے میں مدد کی۔ اس کے علاوہ موجودہ "سلک ورم" (Silkworm) راکٹ کی ریج کو بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ دھماکہ خیز مادہ اٹھالے جانے کی طاقت میں اضافہ کیا۔ ان میں سے بیشتر راکٹ چین نے صدام حسین کو فروخت کر دیئے۔ عراق نے یہ راکٹ اپنے ہمسائے ایران کے خلاف اپنی طویل المدت جنگ میں استعمال کئے۔ ایران، عراق جنگ بندی کے بعد بھی عراق کے پاس لاتعداد "سلک ورم" راکٹ موجود تھے اور موساد کو یقین تھا کہ یہ اسرائیل کے خلاف استعمال کئے جائیں گے۔

اس دوران پروجیکٹ بے بی لون میں کافی تیزی آ چکی تھی۔ اس لمبی نالی والی توپ کی آزمائش بھی کی جا چکی تھی۔ صدام حکومت کے مخالفین جنہیں موساد نے اپنے مجبوروں اور جاسوسی کے طور پر بھرتی کر رکھا تھا، نے یہ اطلاع دی تھی کہ اس توپ سے قاتر کئے جانے والے راکٹوں کی ایسی ناک (نوز) تیار کی جا رہی ہے جس کے ذریعے کیمیکل اور جراثیمی ہتھیار قاتر کئے جاسکیں۔

20 مارچ 1990ء کی سہ پہر کو وزیراعظم یزہاک شامیر نے اپنے دفتر میں ناہوم ادومونی کو منظوری دے دی کہ ڈاکٹر گیر اللہ بل کو مرنا چاہئے۔

اس فیصلے کے دو روز بعد دو افراد پر مشتمل قاتل ٹیم برسل پہنچ گئی۔ ٹیم کے استعمال کے لئے برسل میں موساد کا وہ ایجنٹ موجود تھا جو ڈاکٹر بل کے روزمرہ معمولات اور آمد و رفت پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹمائڈ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹمائیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



پاسپورٹ پیش کیا۔ بندرگاہ سے باہر آنے کے بعد اس نے ڈیپو میٹ ہوٹل میں کمرہ لے لیا اور اگلے چند گھنٹے سمندر کنارے واقع پائے خانوں اور ساحلی ریسٹورانوں سے لطف اندوز ہوتے گزارے۔ اس نے جی بھر کر کافی پی اور انتہائی میٹھے عربی کیک کھائے۔ اس نے بہت سی ٹیلیفون کالیں بھی کیں۔

اگلے دن شکار کی اپنے بچوں سے کئے گئے ہندے کے مطابق ان کے لئے شرفیں خرید کر ساحل سمندر پر چھل قدمی کرتا ہوا اپنے ہوٹل کی طرف چلا آ رہا تھا کہ ایک موٹر سائیکل جس پر دو افراد سوار تھے اس کے قریب آ کر آہستہ ہوئی اور موٹر سائیکل سواروں میں سے ایک نے شکار کی کے سر کا نشانہ لے کر چھ گولیاں دماغ کے آر پار کر دیں۔ جہادی رہنما فوراً ہی جنت کو سدھار گیا۔ موٹر سائیکل سوار لکھنؤ میں غائب ہو گئے۔ کسی کا بھی کوئی پتہ نہ چل سکا لیکن اس واقعے کے ایک گھنٹہ بعد ایک پھیلیاں پکڑنے والی شکاری کشتی ویلٹا کی بندرگاہ سے نکلی اور زیر مرمت اسرائیلی مال بردار جہاز کے نیچے جا کر روک گئی۔ اس کے فوراً بعد جہاز کے کپتان نے بندرگاہ کے حکام کو بتایا کہ جہاز کے انجن کی خرابی قریب طور پر درست کر دی گئی ہے اور مزید مرمت کے لئے جہاز ویلٹا کی بندرگاہ واپس جا رہا ہے۔

ایران میں جو شکار کی کا روحانی مرکز تھا، ملاؤں نے ایک روز کے سوگ کا اعلان کیا۔ وزیراعظم اسرائیل، یزہاک راہن سے گل ایب میں اس قتل بارے سوال پوچھا گیا تو اس کا جواب تھا۔ ”مجھے یقیناً کوئی انسوس نہیں ہے۔“

اس کے چند ہی روز بعد اسی محفوظ ٹھکانے کے قریب جہاں راہن نے شکار کی کے قتل کا حکم دیا تھا۔ ایک امن ریلی کی قیادت کرتے ہوئے تل ایب میں 4 نومبر 1995ء کو یزہاک راہن کو بھی قتل کر دیا گیا۔ راہن کا قتل

ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں سے ویلٹا (Valletta) کی بندرگاہ کا واضح نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ اسی شام کو ایک موٹر سائیکل ران کے حوالے کی گئی اس نے ہوٹل کے شاف کو بتایا کہ وہ اس پر جزیرے کی سیر کرنا چاہتا ہے۔

ہوٹل کے شاف میں سے کسی کو یاد نہیں کہ دونوں نے کسی سے کوئی رابطہ قائم کیا ہو۔ انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت اپنے ہوٹل کے کمرے ہی میں گزارا۔ جب کمرے کی گھنٹی سننے والے ایک لڑکے نے کہا کہ گل کا سوٹ کیس بہت بھاری ہے تو اس نے آنکھ مار کر کہا کہ اس میں سونا بھرا ہوا ہے۔

اسی شام کو ایک مال بردار جہاز نے جو گزشتہ روز حید کی بندرگاہ سے اٹلی جانے کے لئے چلا تھا، بندرگاہ کے حکام کو ریڈیو پیغام بھیجا کہ ان کے جہاز کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے لہذا وہ خرابی دور ہونے تک جزیرے کے قریب ہی ٹھہرے گا۔ اس اسرائیلی مال بردار جہاز کے اوپر خود موساد کا ڈائریکٹر جنرل ہتھائی شادت اور اس کے مواصلات کے ماہر ٹیکنیشن کی ایک چھوٹی سی ٹیم سوار تھی۔ انہوں نے گل کے ساتھ مواصلاتی رابطہ قائم کیا جس کے سوٹ کیس میں ایک چھوٹا طاقتور ریڈیو موجود تھا۔ اس رات گل کو بحری جہاز سے کئی پیغامات موصول ہوئے۔

اسی روز کئی شکار کی تربیتی سے ویلٹا آنے والی بحری کشتی میں مالٹا پہنچ چکا تھا۔ شکار کی کی اس کشتی پر حفاظت کے لئے لیبیا کی سکیورٹی کے مسلح افراد موجود تھے اور ان کی ذمہ داری شکار کی کو بحفاظت مالٹا کی بندرگاہ ویلٹا تک پہنچانا تھا۔ شکار کی لیبیا کی کشتی سے اکیلا ہی ساحل پر اترا۔ اترنے سے پہلے کشتی پر اس نے اپنی داڑھی اترے سے شیو کر کے صاف کر لی تھی۔ اس نے مالٹا کے ایمریشن حکام کو اپنے آپ کو ایمریشن وائس کے نام سے متعارف کرایا اور اسی نام کا لیبیا کا جاری کردہ

اور تجویزے نشر ہوتے رہے تھے اور صدام حسین کی اسرائیل کے بارے آئندہ کے لئے منصوبہ بندی کا نقشہ پیش کیا تھا۔ اس کی وجہ سے اسرائیل میں یمن یا ہو کو "بی بی" (Bi Bi) کہا جانے لگا تھا۔ اسی روز اپنے دفتر کے ساتھ والے کمرے میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بی بی بی جس قدر سکون، غیر جذباتی اور سنجیدہ نظر آ رہا تھا اب اپنے مشیروں، سینئر افسروں، انٹیلی جنس اداروں کے سربراہوں بشمول موساد کے چیف یا طوم انتہائی مشتعل، جذباتی اور غصے سے بھرا ہوا، چیخ چلا رہا تھا۔

"میں حماس کے شیطانی بچوں کو نیست و نابود کر دوں گا۔" اجلاس میں شامل ایک معتبر شخص کے مطابق بی بی نے اپنے سامنے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے سینئر افسران سے کہا۔

"تم مجھے بتاؤ کہ یہ انتقامی کارروائی کیسے کی جائے گی؟ میں اخبارات میں یہ نہیں پڑھنا چاہتا کہ بی بی نے اپنا بدلہ چکایا ہے۔ یہ انصاف اور کئے کی سزا نظر آتا چاہئے۔"

جیسے جیسے اجلاس میں بی بی کی ٹھن گرج جاری تھی موساد کا سربراہ یا طوم کانفرنس ٹیبل پر خاموش بیٹھا رہا تھا کیونکہ وہ وزیراعظم کے بارے کی طرح چڑھتے اترتے موڑ سے اچھی طرح واقف تھا۔

"مجھے اُن کے سر چاہئیں، میں انہیں مردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے کچھ پروا نہیں کہ یہ کام کس طرح ہوگا۔ میں چاہتا ہوں یہ کام ہر صورت میں ہونا چاہئے اور میں جلد از جلد اس کام کی تکمیل چاہتا ہوں۔"

اجلاس میں اس وقت اور بھی گرمی پیدا ہو گئی جب یمن یا طوم نے یا طوم سے مطالبہ کیا کہ وہ بی بی کو حماس کے رہنماؤں کے نام اور موجودہ پتے مہیا کرے۔ آج تک کسی بھی وزیراعظم نے ایسی خفیہ اور حساس معلومات کا

ایک انتہا پسند ہندوئی یہودی میمال امیر کے ہاتھوں سے ہوا جو راہن جاسوسی بے رحم اور جلا وطن انسان تھا، ایسے جنونیوں اور جلاوطنوں کی موساد میں بڑی قدر منزلت تھی۔ بڑھاپا راہن، جو شکرے سے قاضی بن گیا تھا (اس نے یا سر عرفات کے ساتھ امن کا ٹوٹل انعام بشرطہ طور پر حاصل کیا تھا)، نے اپنی پسندیدہ کتاب بائبل کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

"آؤ، امن کی خاطر اپنی تلواریں کا رخ اپنے عرب ہمسایوں کے ساتھ مل کر زراعت اور قیمتی باڑی کی طرف موڑ دیں۔"

بڑھاپا راہن کو اس کے اپنے لوگوں میں سے ایک نے قتل کر دیا کیونکہ اس کے مخالفین کو اس کی ٹڈل ایسٹ میں امن کی کوششیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔

1998ء میں موساد کی قاتل ٹیم کے ممبران کی تعداد 48 تھی، جن میں چھ خواتین بھی شامل تھیں۔ ان سب کی عمریں 20 سال کے لگ بھگ اور تمام انتہائی فٹ تھے۔ یہ قتل ایبب میں موساد کے ہیڈ کوارٹر کے باہر، قریب صحرا میں ایک ملٹی چھاؤنی میں رہتے تھے اور وہیں انہیں قتل اور ہلاک کرنے کے نئے نئے اور جدید طریقے سکھائے جاتے تھے۔

30 جولائی 1997ء کو یروشلم کے ایک خریداری مرکز میں حماس کے دو خودکش حملہ آوروں نے 15 افراد کو ہلاک اور 157 کو زخمی کر دیا۔ اگلے روز موساد کے ڈائریکٹر دانی یا طوم نے وزیراعظم بنیامین نتھن یاہو (Benyamin Netanyahu) کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں شرکت کی جس میں وزیراعظم نے واضح لفظوں میں کہا کہ حماس ہمارے انتقام سے نہیں بچ سکے گی۔

گلف وار کے دوران صدام حسین کے بارے میں سی این این (CNN) پر یمن یاہو کی طرف سے جو تبصرے

اگست 2014ء

142

حکایت

جمعہ کی فضیلت

- ☆ جمعہ کے دن جہنم کی آگ نہیں جلائی جاتی۔
- ☆ جمعہ کی رات دوزخ کے دروازے نہیں کھلتے۔
- ☆ جمعہ کے دن مرنے والے خوش نصیب مسلمان کو شہید کا درجہ دیا جاتا ہے۔
- ☆ جمعہ کے دن حج ہو تو اس کا ثواب 70 حج کے برابر ہوتا ہے۔
- ☆ جمعہ کے دن ایک نیکی کا ثواب 70 نیکیوں کے برابر ہے۔
- ☆ جمعہ کے دن نئی پاک خود اپنے کانوں سے درود پاک سنتے ہیں۔
- ☆ جمعہ کے دن درود پاک پڑھنے کی 30 حاجتیں دنیا میں پوری ہوتی ہیں۔

(جواد حیدر - تلہ گنگ)

کہانیوں سے اخبارات بھرے پڑے تھے۔ اس کے لئے اس وقت انتہائی ضروری تھا کہ اپنی اہلیت و قابلیت کا ثبوت دے۔ حماس کے کسی لیڈر کی کٹی ہوئی گردن اس کی مقبولیت کو بلند یوں تک پہنچا سکتی تھی۔

ایک سینئر اعلیٰ جنس افسر نے سب کی طرف سے بولتے ہوئے کہا۔

"ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ سانپ کا سر کاٹنے سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے، یہ وقت کا انتخاب ہے جو ہماری پریشانی کا سبب ہے۔ بی بی کی طرف سے بار بار "ابھی ایکشن" کی تکرار بے معنی چیز ہے۔ اس قسم کے ایکشن کے لئے انتہائی محتاط منصوبہ بندی اور رازداری شرط ہے۔ بی بی کو فوری نتیجہ چاہئے جیسے کہ یہ کوئی کمپیوٹر گیم ہے یا کوئی ایکشن فلم کا منظر ہے جس کے ہیرو کے ایکشن بی بی کو پسند آتے ہیں لیکن حقیقی

کسی مشن کی ابتدائی سطح پر اور یوں کھلے اجلاس میں مطالبہ نہیں کیا تھا۔

اجلاس میں شامل ایک سے زائد افراد نے محسوس کیا کہ بھٹن یا وہ اس مشن کی تکمیل اپنی ذاتی نگرانی اور خواہش کے مطابق کرانا چاہتا ہے اور اس کا واضح پیغام دینا چاہتا ہے۔

اس سے موساد کے سینئر افسروں میں بے یقینی اور تشویش پیدا ہونا شروع ہو گئی کہ بھٹن یا وہ اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کے لئے موساد کو اپنے انگوٹھے کے نیچے دبائے رکھنا چاہتا ہے۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے باطوم نے وزیراعظم سے کہا کہ بعد میں کسی وقت حماس کے رہنماؤں کی فہرست اسے مہیا کر دے گا۔ اس کے علاوہ موساد کے سربراہ نے تجویز پیش کی کہ ہمیں مشن کی تکمیل کے عملی پہلوؤں کو بھی زیر غور لانا ہوگا۔ حماس کے لیڈروں کی تلاش کا کام ایسے ہی ہے جیسے ہر دت شہر کے گھروں کے اندر ایک چوہے کو احوال پتہ۔

ایک دلدادہ بھٹن یا ہونے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ کوئی بہانے بازی سننا نہیں چاہتا، وہ صرف ایکشن چاہتا ہے جو ابھی اور اسی وقت شروع ہو جانا چاہئے۔"

میٹنگ کے ختم ہونے پر اعلیٰ جنس افسروں کی اکثریت نے محسوس کیا کہ بی بی بھٹن یا ہونے وہ حماس لائن پار کر لی ہے جہاں سیاسی مصالحت ختم اور عملی اقدامات کا آغاز ہوتا ہے۔ میٹنگ کے کمرے میں کوئی ایسا بندہ نہ تھا جس نے محسوس نہ کیا ہو کہ بھٹن یا وہ دہشت گردی ختم کر کے اپنے جن دعوؤں کے ساتھ برسرِ اقتدار آیا تھا اب اگر اس نے سخت قسم کے اقدامات نہ اٹھائے تو عوام میں اس کے خلاف بغاوت ہو جائے گی۔ پھر ہر روز منظر عام پر آنے والے سیکینڈ لوں نے، جس کا التزام وہ ہمیشہ دوسروں پر دھرا کرتا تھا، عوام میں اس کی مقبولیت کا گراف انتہائی تیزی سے چمک چکا تھا۔ اس کی ذاتی زندگی کی

اور ملکی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔

موساد کے سربراہ یا طوم نے تمام عرب ممالک، غزہ اور مغربی کنارے میں موجود اپنے جاسوسوں اور مجبوروں کو حکم جاری کر دیا کہ حماس کو کنٹرول کرنے والی ناپیدہ قوتوں اور افراد کا پتہ چلائیں اور ان کی جائے قیام و رہائش بارے میں معلومات مہیا کریں۔ اگست 1997ء کے پورے مہینے میں یا طوم کو ہار بار وزیراعظم کے دفتر میں بلایا گیا اور اس سے پروگریس رپورٹ مانگی گئی۔ ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی اس لیے جنس ادارے میں یہ تاثر عام ہو رہا تھا کہ وزیراعظم یا طوم پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ اس کام پر جاسوسوں اور مجبوروں کی نفرتی روانہ کرے، جلد نتائج نہ ملنے کی صورت میں وزیراعظم موساد کے سربراہ کے خلاف کوئی اور ایکشن لینے پر مجبور ہوگا۔ وزیراعظم کی طرف سے اگر یہ ڈھکے چھپے الفاظ میں دھمکی تھی تو اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ یا طوم نے صرف اتنا جواب دیا۔ ”وہ اپنی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔“ اس میں خاموش اشارہ یہ تھا کہ اگر وزیراعظم اسے ہٹانا چاہتا ہے تو یہ اس کا استحقاق تھا لیکن اس سے پریس اور عوام میں بحث شروع ہو جائے گی اور یقین یا ہو کی اپنی کارگزاری بارے میں سوالات اٹھائے جائیں گے لیکن وزیراعظم نے اپنا دباؤ جاری رکھا کہ اسے حماس کے کسی ایک لیڈر کا سرچاہئے اور جلد از جلد۔

ستمبر 1997ء کے شروع سے یقین یا ہونے یا طوم سے رات کے کسی بھی وقت پروگریس رپورٹ مانگنی شروع کر دی۔ آخر موساد کے سربراہ کو وزیراعظم کے دباؤ کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ اس نے دوسرے مراکز اور سیشنوں سے اپنے جاسوس اور مجبور بلائے شروع کر دیئے اور بی بی کی خواہش کے مطابق نئے سرے سے ایکشن پلان ترتیب دینا شروع کر دیا۔ یا طوم ایک سخت جان فرد ہے لیکن فوری اور برق رفتاری سے ایکشن لینے میں وہ بی بی کا پاسنگ بھی نہیں ہے اور بی بی نے اپنی انٹی بے ریڈ کی

بابت باتیں شروع کر دی تھیں کہ کتنی جیزی اور پھرتی سے اس نے اپنے بھائی کی مدد سے مشن مکمل کیا تھا۔ حالانکہ دونوں مشنوں کا کوئی تقابل ہی نہیں تھا۔

9 ستمبر (1997) کو تل ابیب میں خبر پہنچی کہ حماس نے ہر حملہ کیا ہے۔ اس مرتبہ انہوں نے اردن کے دارالحکومت امان میں نئے کھولے گئے اسرائیلی سفارت خانے کے پھر اتاشی کے دوستیورٹی گارڈ کو شدید زخمی کیا ہے۔

اس واقعہ کے تین دن بعد جمعہ کے روز شبات کی نماز شروع ہونے سے قبل یقین یا ہونے یا طوم سے درخواست کی کہ وہ بروٹلم میں دوپہر کے کھانے میں اس کے ساتھ شریک ہو۔ دونوں آدمیوں کے کھانے میں سوپ، سلاد اور کھجلی شامل تھی جو انہوں نے بیئر یوتل کے پانی کے ساتھ اپنے شکم میں اتاری۔ وزیراعظم نے فوراً ہی امان کے حملے بارے بات شروع کر دی۔ ”فائرنگ کرنے کے لئے حماس کے دہشت گرد سفارت خانے کے اسی قریب کیسے آ گئے؟ پہلے سے حملے کا پتہ کیوں نہ چلایا جاسکا؟ اس بارے میں موساد کا امان میں سیشن کیا کر رہا تھا؟“

یا طوم نے یقین یا ہو کو یہیں روک دیا اور بتایا۔

”امان میں حماس کے سیاسی ونگ کا کرنا دھرتا خالد مشعل نامی شخص ہے جس نے شہر میں اپنا دفتر بنا رکھا ہے۔ کئی ہفتوں تک مشعل مختلف عرب ملکوں کے سفر پر رہا ہے اور موساد کے امان سیشن نے اطلاع دی تھی کہ وہ واپس امان آ گیا ہے۔“

یقین یا ہو کا چہرہ چمک اٹھا۔ ”جاؤ اور اسے ختم کر دو اپنے آدمیوں کو امان بھیجو جو اسے ختم کر دیں۔“

چھ ہفتے تک ایک ایسے وزیراعظم کا دباؤ برداشت کرنے کے باوجود جسے ایسے آپریشن کے سیاسی مواقع و نتائج کی کوئی پروا نہ تھی۔ موساد کے سربراہ نے یقین یا ہو پر واضح کر دیا کہ امان میں ایسے آپریشن کے نتیجے میں اردن

آوروں کی قوتِ عمر کہ ظاہر کیا گیا تھا جو اسرائیلی سولین ہ حملے کر رہے تھے۔

مشعل کی نقل و حرکت اور آمد و رفت کی نگرانی کی جا رہی تھی، اس کے علاوہ امان میں موساد کے ٹینشن چیف نے اس کی خفیہ طور پر فوٹو اتار کر بھی تل ابیب کو فراہم کر دی تھی۔ یا طوم نے وزیراعظم کو اپنی رپورٹ کے ساتھ اپنی ذاتی رائے بھی دے دی تھی کہ امان میں یمنی باہو کی طرف سے مشعل کا قتل، دو سال تک دونوں ملکوں کے درمیان کی جانے والی امن کی کوششوں اور موساد اور اردن کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے درمیان تعاون اور معلومات کے تبادلے کے لئے کئے گئے اقدامات کو ملایمیت کر دے گا۔

یمنی باہو نے موساد کے سربراہ کی اس دلیل کو حقارت سے رد کر دیا اور کہا۔ ”اس دلیل سے اس مشن کی ناکامی کی بو آتی ہے جو میں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا۔“

اس دوران موساد کی آٹھ افراد پر مشتمل قاتل ٹیم اپنی تیاریوں میں مصروف رہی۔ ان میں سے دو قاتلوں نے روز روشن میں مشعل کو نشانہ بنانا تھا اور باقیوں نے کار سمیت قاتلوں کے بحفاظت بھاگنے میں سہولیات مہیا کرنی تھیں اور پوری ٹیم نے مشن کی تکمیل کے بعد یروشلم کے قریب واقع ایلن بی ہل (Allenby Brighe) پارک کے واپس اسرائیل آ جانا تھا۔

اس قتل کے لئے موساد نے جو اسلحہ استعمال کرنا تھا وہ ایک معمولی چیز تھی۔ یہ کوئی گن یا پستول نہیں تھی یہ اعصاب کو فوراً مفلوج کر دینے والی نرو ایجنٹ (Nerve Agent) سے بھری ہوئی ایک ٹیوب تھی (تو تھ پیسٹ کی ٹیوب کی طرح کی) یہ طریقہ کسی کو قتل کرنے کے لئے کسی اسرائیلی ایجنٹ کی طرف سے پہلی بار آزمایا جا رہا تھا۔ روسی انٹیلی جنس ایجنسی KBG اور روس کے ذریعہ ممالک

کے ساتھ دوستی اور تعاون کے ان تعلقات کا خاتمہ ہو جائے جس کی بنیاد یمنی باہو کے پشرد، یزہاک راہن نے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ امان میں مشعل کے قتل سے موساد کے اردنی انٹیلی جنس سے تعلقات بھی ختم ہو جائیں گے۔ حالانکہ موساد کو شام، عراق اور فلسطینیوں کے بارے سب سے زیادہ خفیہ اطلاعات اسی ذریعے سے حاصل ہوتی ہیں۔ یا طوم نے تجویز پیش کی کہ بہتر ہو گا کہ مشعل کے دوبارہ امان سے باہر جانے کا انتظار کیا جائے اور بیرون ملک اسے ختم کیا جائے۔

یا طوم کی عقل و دانش پر مبنی باتیں سن کر یمنی باہو چلانے لگ گیا۔

”بہانے بازی، تم مجھے صرف بہانے بازی کرتے ہوئے بہلا رہے ہو، مجھے ایکشن اور نتیجہ چاہئے۔ میں فوری ایکشن چاہتا ہوں۔ عوام ایکشن چاہتے ہیں۔ عنقریب رosh Hashanah (عید) آنے والی ہے، میں مشعل کے قتل کی صورت میں اپنے لوگوں کو عید کا تحفہ دینا چاہتا ہوں۔“

اس کے بعد یا طوم کو اپنے ہر چھوٹے بڑے اقدام کے لئے یمنی باہو سے ذاتی طور پر منظوری لینا پڑتی تھی۔ آج تک کسی اسرائیلی وزیراعظم نے سرکاری سرپرستی میں ہونے والے قتل کے بارے میں اتنی ذاتی دلچسپی نہیں لی تھی۔

خالد مشعل کی عمر 41 سال تھی۔ اس نے مکمل داڑھی رکھی ہوئی تھی اور مضبوط ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ وہ ایک انتہائی وقادار اور قلص خاوند اور سات بچوں کا باپ تھا اور اس کی رہائش بھی سنگ حسین، والی اردن کے محلے کے قریب ہی تھی۔ وہ انتہائی مہذب، خوش گفتار اور نفیس شخص تھا اور اسلام کی بنیاد پرست تحریک میں وہ کوئی معروف شخص نہ تھا لیکن امان میں موجود موساد کے ٹینشن نے جو ڈانبا جمع کر رکھا تھا اس میں مشعل کو ہی خود کش حملہ

کیا گیا تھا۔ جارچی مارکوف کو پاس سے گزرنے والے ایک شخص نے اپنی چھتری کی بالائی نوک اس کی ران میں چھبھادی تھی اور وہ فوراً گر کر مر گیا تھا کیونکہ چھتری کی نوک میں ریسن نامی زہر تھا جو اورنٹی کے پودے کے بیجوں سے تیار کیا جاتا ہے اور مارکوف کو شکار کرنے والا KBG، روسی ایگلی جنس ایگلی کا کارندہ تھا جو کبھی پکڑا نہیں گیا۔

اپنے قاتلانہ مشن کی کامیابی کا خواب دیکھتے ہوئے بیڈز اور کینڈال آدمی رات کو اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔ ہر ایک نے اپنے کمرے میں ہی صبح کے ناشتے کا آرڈر دیا جو کافی، مالے کا جوس ڈینش، ویسٹری پر مشتمل تھا۔ اگلی صبح سب سے پہلے بیڈز ہوٹل کی لابی میں نکلا اور اپنے لئے بک کی گئی دو گاڑیوں میں سے ایک گاڑی، نیلے رنگ کی ٹیوٹا کے کاغذات پر دستخط کئے۔ جلد ہی دوسری گاڑی، ہرے رنگ کی ہنڈائی بھی آ گئی جس کے کاغذات پر کینڈال نے دستخط کئے۔ اس نے ایک استقبالیہ کلرک کو بتایا کہ وہ اور اس کا دوست ملک کے جنوبی حصے کی سیاحت کے لئے جا رہے ہیں۔

10 بجے مشعل اپنی گاڑی میں، جسے اس کا ڈرائیور چلا رہا تھا، کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس کے تین کمسن بچے، ایک لڑکا اور دو لڑکیاں بھی موجود تھے۔ بیڈز (Beads) نے کچھ فاصلہ رکھ کر خفیہ طور پر اپنی کرائے کی گاڑی میں اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ قاتل، نیم کے دوسرے ارکان اپنی دیگر گاڑیوں میں اسی سڑک پر ادھر ادھر موجود تھے۔

جیسے ہی وہ شہر کے گاڑن ڈسٹرکٹ میں داخل ہوئے ڈرائیور نے مشعل کو آگاہ کیا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ مشعل نے کار کے فون سے بیڈز کی کار کا میک اور نمبر ان کی پولیس کے ہیڈ کوارٹر کو آگاہ کر دیا۔ کرائے کی ٹیوٹا قریب سے گزری تو مشعل کے بچوں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے بھی مرحبا مرحبا کہا جیسے وہ پاس سے

میں ایک مرے سے یہ طریقہ نہایت کامیابی سے عمل میں لایا جاتا رہا تھا۔ ماضی قریب میں جو روسی سائنسدان مہاجر بن کر اسرائیل آ گئے تھے انہیں موساد نے لوکریاں دے کر ان سے یہ ہلاکت خیز گیسیں تیار کروانی شروع کر دی تھیں جس میں تابون (Tabun)، سارن (Sarin) اور سومن (Soman) وغیرہ شامل تھیں۔ جن پر بین الاقوامی معاہدوں کے تحت سخت پابندیاں تھیں۔ جس شخص کو ان کا شکار بنایا جاتا تھا اس کے حواس معطل، جسم مفلوج اور لمحوں میں موت واقع ہو جاتی تھی۔ مشعل کی موت کے لئے اسی طریقے کا انتخاب کیا گیا تھا۔

24 ستمبر 1997ء کو قاتل نیم کے ارکان نے امان کے لئے ایجنٹر، روم اور بیرس سے فلائٹس پکڑیں جہاں وہ کئی روز سے قیام کئے ہوئے تھے۔ نیم کے کچھ ارکان کے پاس فرانس اور اٹلی کے پاسپورٹ اور دستاویزات تھیں جنہوں نے مشعل کو نشانہ بنانا تھا، ان کے پاس کینڈا کے پاسپورٹ تھے جن پر ان کے نام ہیری بیڈز (Bary Beads) اور سیان کینڈال (Sean Kendall) درج تھے۔ وہ شہر کے انٹرنیشنل ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں انہوں نے اپنے آپ کو بطور سیاح متعارف کرایا۔ قاتل نیم کے باقی ارکان نے اسرائیلی سفارتخانے میں قیام کیا جو ہوٹل سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھا۔ بیڈز اور کینڈال بھی اگلے روز ان میں جا شامل ہوئے۔ دونوں قاتلوں نے ایک دفعہ پھر گیس ٹیوب کا معائنہ کیا۔ دونوں میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں کہ ٹیوب کے اندر کون سی نرو ایجنٹ (گیس) بھری گئی ہے۔ ان کا قیاس تھا کہ یہ موت سے قبل خفقان یا دل کی حرکت بند ہونے کا باعث بنے گی۔ انہیں شیشین چیف موساد نے مشعل کی تازہ ترین نقل و حرکت سے آگاہ کیا۔

ستمبر 1978ء میں وہ لندن میں تھا جب ایک بگاریں منحرف شہری کونزو گیس (ایجنٹ) کے ذریعے قتل

حساس کے زہما نے فوراً اپنا کان دہا لیا چونک کر دیکھا اور انگلی سے کان کی صفائی شروع کر دی۔ کینڈال نے دوبارہ کوشش کی۔ اس نے جھوم میں بل چل چک گئی اور وہ دونوں ایکٹوں کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھے۔

"بھانگو....." بیڈز نے ہیر یوز بان میں کہا۔

آگے بیڈز، پیچھے کینڈال اس گلی کی طرف بھاگے جہاں بیڈز نے گاڑی پارک کر رکھی تھی۔ مشعل کے ڈرائیور نے جس نے تمام واقعہ دیکھا تھا، وہیں سے گاڑی اس گلی کی طرف موڑ دی تاکہ ٹیونا کا راستہ روک سکے۔ مشعل لڑکھڑا رہا تھا اور کرا رہا تھا۔ لوگ اسے سہارا دے رہے تھے تاکہ وہ گرنے نہ پائے۔ دوسرے ایسپرنس کے لئے دہائی دے رہے تھے۔

بیڈز جس کے ساتھ کینڈال بھی اب تک آدمی استعمال کی گئی زہر کی ٹیوب تھامے ہوئے تھا، ڈرائیور کی گاڑی کی ٹکر سے بچنے کے لئے گلی کی دوسری طرف کار کو بھگائے لئے جا رہا تھا۔ دوسری کاریں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ایک ڈرائیور کے پاس سیل فون تھا۔ وہ سڑک بلاک کرنے کے لئے کالیں کر رہا تھا۔ مشعل کا ڈرائیور پولیس ہیڈ کوارٹر سے رابطے کے لئے اپنا کار فون استعمال کر رہا تھا۔

اب تک قاتلوں کی امدادی ٹیم کے ارکان بھی پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے بیڈز کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی کار چھوڑ کر اس کی کار میں آجائے۔ موساد کے دونوں



شمارہ جولائی 2014ء میں کہانی "فاختہ اور دل دریدہ" کا آخری برا اس طرح پڑھا جائے۔ "فاختہ کی لاش پاصر کے ساکت مردہ دل کے برابر پڑی تھی۔" (ادارہ)

گزر نے والی دیگر گاڑیوں کے مسافروں کو کہہ رہے تھے۔ موساد کے ایجنٹ نے ان کی طرف توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اگلے لمحے کینڈال کی سبز رنگ کی ہینڈل کی کار ڈرائیور سے آگے نکلی اور دونوں کاریں شہر کی ٹریفک کے جھوم میں غائب ہو گئیں۔

اگلے لمحے پولیس ہیڈ کوارٹر سے ایک افسر نے مشعل کو فون کر کے بتایا کہ کار کسی کینیڈین سیاح نے کرائے پر لے رکھی ہے۔ مشعل مطمئن ہو گیا اور دوبارہ اپنے بچوں کو دوسرے مسافروں کے لئے ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونے لگا۔ ہر صبح بچے باری باری اپنے باپ کے ساتھ دفتر جاتے ہوئے کار کی سواری کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔ مشعل کو دفتر اتار کر ڈرائیور بچوں کو سکول چھوڑ آیا کرتا تھا۔

10:30 بجے سے کچھ پہلے ڈرائیور واسنی الطال سٹریٹ میں مڑا تو اس نے وہاں حساس کے دفتر کے باہر ایک جھوم کو اکٹھے ہوئے دیکھا۔ ان لوگوں میں کینڈال اور بیڈز بھی موجود تھے۔ ان کی موجودگی سے کسی نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا کیونکہ اکثر سیاح "حساس" اور اس کے مقاصد بارے معلومات کی خاطر وہاں آ جایا کرتے تھے۔

مشعل نے جلدی سے اپنے بچوں سے پیار کیا اور انہیں الوداع کہتے ہوئے کار سے باہر نکل آیا۔ بیڈز جلدی سے اس طرح اس کی طرف بڑھا جیسے اس سے ہاتھ ملانا چاہتا ہو۔ کینڈال اس کے کندھے کے پاس کھڑا پلاسٹک بیگ میں سے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

"مسٹر مشعل!" بیڈز نے نہایت مہذب طریقے سے مخاطب کیا۔

مشعل نے اس کی طرف مشکوک نظر سے دیکھا۔ اس نے کینڈال نے کیس والی ٹیوب نکال لی اور مشعل کے کان میں ہرے کرنے کی کوشش کی۔

دیا تھا۔

امان سے موساد کے سٹیشن چیف نے اسرائیلی سفارتخانے کے خفیہ فون سے اپنے چیف اور ڈائریکٹر جنرل موساد یا طوم کو اس آپریشن کی ناکامی کی اطلاع دے دی تھی۔ دونوں افراد، سٹیشن چیف اور یا طوم غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔

جب یا طوم اس ناکامی کی اطلاع دینے وزیراعظم کے دفتر پہنچا، یقین یا ہو کو پہلے ہی کنگ حسین کا ہاٹ لائن پر جو دونوں لیڈروں کے درمیان ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے قائم تھی، فون کال آچکی تھی۔ فون کال کا لب ولہجہ کیا تھا، اس کا انکشاف بعد میں ایک انٹیلی جنس افسر نے کیا۔

شاہ حسین نے بی بی سی سے دو سوال پوچھے تھے۔
"وہ حرامی کون سا کھیل کھیل رہا ہے؟" اور "نزد گیس کا کوئی توڑ (علاج) ہے؟" والی اردن نے انتہائی اشتعال اور غصے میں کہا۔

"میں اپنے آپ کو ایک ایسا آدمی محسوس کر رہا ہوں جس کے انتہائی بااعتماد دوست نے میری بیٹی کی عزت لوٹی ہو۔ اگر یقین یا ہو اس سارے معاملے کی تردید کرنے کی سوچ رہا ہو تو اُسے معلوم ہونا چاہئے اس کے دو جاسوس ہمارے قبضے میں ہیں جو ویڈیو کیمرہ کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر چکے ہیں اور یہ ویڈیو ٹیپ میڈلین البرائٹ، امریکن سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) کے ملاحظہ کے لئے واشنگٹن روانہ کر دی گئی ہے۔"

اب یقین یا ہو اپنے ٹیلیفون کے اوپر اس طرح جھکا بیٹھا تھا جیسے اس کی گردن کسی نے مروڑ دی ہو۔ اس کا رنگ ایسے سفید ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو اور اس کی شکل ایسے ہو رہی تھی جیسے اس کا ہاتھ کسی بھاری پتھر کی ریل کے نیچے آیا ہوا ہو۔

یقین یا ہو اسی وقت جہاز پکڑ کر صورت حال کی

ایجنٹ اپنی کار سے باہر کودے ایک دوسری کار نے ان کا راستہ روک لیا۔ اس کار میں سے کئی مسلح افراد باہر نکلے۔ انہوں نے بیڈز اور کینڈل کوز مین پر گرا لیا۔ لمبے بھر بعد پولیس پہنچ گئی۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ امدادی قاتل ٹیم کے ارکان وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور بغیر کسی رکاوٹ کے واپس اسرائیل پہنچ گئے۔

بیڈز اور کینڈل بدقسمت ثابت ہوئے۔ انہیں سینٹرل پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا۔ انہوں نے وہاں پر اپنے کینیڈین پاسپورٹ پیش کئے اور اصرار کیا کہ انہیں کسی گہری سازش کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اردن کے کاؤنٹر انٹیلی جنس چیف سمیع بلسمی کی آمد نے ان کے جھوٹ کا پول کھول دیا۔ اس نے بتایا کہ "وہ جانتا ہے کہ وہ کون ہیں۔ اس کی ابھی ابھی امان میں موساد کے سٹیشن چیف سے فون پر بات ہوئی ہے اور سپاکی ماسٹر نے اعتراف کر لیا ہے کہ یہ اُس کے آدمی ہیں۔ اب اسرائیل شاہ اردن کے ساتھ ان کے بارے میں معاملات طے کرے گا۔"

بلسمی نے حکم دیا کہ موساد کے دونوں ایجنٹوں کو الگ الگ کال کوٹریوں میں بند کیا جائے لیکن انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

اس دوران مشعل کو امان کے مرکزی ہسپتال کے انتہائی نہکداشت یونٹ میں داخل کرایا دیا گیا تھا۔ اس کی شکایت تھی کہ اس کے بائیں کان میں مسلسل گھنٹیاں بج رہی ہیں (اس میں زہر ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی) اور کھانسی طاری ہے جیسے پورے جسم سے بجلی کا کرنٹ گزر رہا ہو اور سانس لینے میں دشواری پیدا ہو رہی ہے۔ (زہر کان کے اندر تک نہیں پہنچا تھا ورنہ دماغ ماؤف ہونے سے فوری موت واقع ہو سکتی۔ کان کے باہر بہنے کے بھی زہر کے کس قدر شدید اثرات تھے)۔

ڈاکٹروں نے مشعل کو لائف سپورٹ سسٹم پر ڈال

جب اس واقعے کی تفصیلات اسرائیلی اور بین الاقوامی پریس میں آئی شروع ہوئیں تو یمن یاہو کے لئے پریس والوں سے منہ چھپانا مشکل ہو گیا اور اسرائیلی افسروں نے استغفہ دے دیئے۔

ایک ہفتے کے اندر نادر علی حماس کے رہبر و رہنما شیخ احمد یسین کو رہا کر دیا گیا اور غزہ میں ان کا قید الٹال استقبال کیا گیا۔ بدلے میں بینڈز اور کینڈال بھی اپنے کینیڈین پاسپورٹ کے بغیر واپس اسرائیل کے حوالے کر دیئے گئے۔ ان کے پاسپورٹ امان میں کینیڈا کے سفارتخانے کے حوالے کر دیئے گئے تاکہ محفوظ رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔

ان دونوں ایجنٹوں کو پھر کبھی قتل کے مشن میں شامل نہیں کیا گیا۔ انہیں موساد ہیڈ کوارٹر میں کسی معمولی کلرک کا کام دے دیا گیا تھا۔ ایک اسرائیلی ایجنٹی جنس افسر نے بتایا۔ ”وہ دونوں بلڈنگ کے بیت الخلاؤں کی سیکورٹی کے انچارج تھے۔“

اس واقعے کے بعد موساد کا ڈائریکٹر جنرل یا طوم محض ”تنگری تلخ“ بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے سینئر افسروں کا خیال تھا کہ وہ یمن یاہو کے غلط اور ناجائز دہاؤ کے سامنے ڈٹ جانے میں ناکام رہا۔ موساد کے لئے کام کرنے والے جاسوسوں اور مخبروں کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ وزیراعظم کے دفتر کی طرف سے یہ افواہ پھیلانی شروع کر دی گئی کہ یا طوم آج گیا کہ کل۔ اس کے اپنے ٹکے کے اندر اس کی مخالفت اور کردار کشی شروع ہو چکی تھی۔ اس نے کچھ عرصہ یہ صورت حال برداشت کی پھر فروری 1998ء میں خود ہی استغفہ دے دیا۔ وزیراعظم یمن یاہو نے اسے روایتی قسم کا وہ خط بھی نہیں لکھا جس میں جانے والے کے کام کی تعریف اور خدمات کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

(جاری ہے)

کنگ حسین کے سامنے وضاحت کے لئے امان جانا چاہتا تھا لیکن شاہ حسین نے صاف کہہ دیا۔ ”میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔“

اردن سے آنے والی ہر فون کال کا لہجہ اب دمکی آمیز ہوتا تھا۔ یمن یاہو اس وقت بھی احتجاج نہ کر سکا جب شاہ حسین نے اسے حکم دیا کہ اب وہ اسرائیلی قید خانوں سے حماس لیڈر شیخ احمد یسین سمیت دوسرے فلسطینیوں کو رہا کر دے۔ یہ فون کال صرف چند منٹ کی تھی۔ یہ بی بی کی سیاسی زندگی کا غالباً سیاہ ترین وقت تھا۔

اب وقت کا دھارا اپنا رخ خود متعین کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اسرائیل کا ایک ملٹری جہاز نروگیس کا توڑ یا علاج کی دوائے کرمان کھینچ چکا تھا۔ اس سے مشعل کا علاج شروع ہو گیا اور وہ چند دن میں اس قابل ہو گیا کہ اس نے پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں موساد کے گھناؤنے کردار کو خوب بے نقاب کیا۔ امان میں موساد کے سٹیشن چیف اور تلکی کے درمیان ایک مختصر میٹنگ ہوئی جس کے دوران انہوں نے فون پر یا طوم سے بھی بات کی۔ موساد کے ڈائریکٹر جنرل نے فوراً اس بات کا وعدہ کر لیا کہ آئندہ کبھی بھی اردن کی سر زمین پر موساد کی طرف سے کسی کو قتل کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

اگلے روز امریکن وزیر خارجہ میڈلین البراٹ نے یمن یاہو کو دو مختصر ٹیلیفون کالیں کیں اور بی بی کو بتایا کہ وہ تمام معاملے کو خوب سمجھتی ہیں۔ اس کا لب و لہجہ بھی تلخ و ترش اور کنگ حسین جیسا ہی تھا۔

کینیڈا کو جب یہ چنا کہ اسرائیلیوں نے اس کے جعلی پاسپورٹ ایک ٹکے کے منصوبے کی تکمیل کے لئے استعمال کئے ہیں تو احتجاجاً اسرائیل سے اپنا سفیر واپس بلا لیا۔ صرف اتنی رعایت برتی کہ سفارتی تعلقات بالکل ختم نہیں کئے۔

صدیوں کی سل

”میں چلے جانے کے لئے نہیں آیا لوری! میں یہیں دلن ہونے کے لئے آیا ہوں جہاں تم نے میرے ہاتھ کا لکھا ہوا سند لیں دلن کیا تھا۔“

☆ تحریر: شگفت احمد / انتخاب: محمد صدیق - جٹ، چوہاں



پوچھا۔ "تم نے پوچھا تھا نا، نوری تم ہی ہو؟"
 "بہت مدت ہوئی تمہارا نام سنا تھا۔" بوڑھے نے
 حکی حکی آواز میں کہا۔ "بہت ہی مدت گزر گئی ہے جب
 تمہارا نام سنا تھا۔"
 "کب؟"

"جب میں پانچ من کی سل اٹھا لیا کرتا تھا۔"
 بوڑھے نے پھکی سی مسکراہٹ سے کہا اور پوچھا۔ "تم
 اکیلی رہتی ہو یہاں؟"

"نہیں تو۔" بڑھیا بولی۔ "صبح اور شام کے وقت
 لوگوں کے بچے قرآن پڑھنے آتے ہیں۔ جب چلے
 جاتے ہیں تو نیم کے اس بیڑے سے ہاتھیں کرنے لگتی ہوں۔
 اس کی عمر بھی ہم دونوں جتنی ہے لیکن تم کہہ سکتے ہو کہ میں
 یہاں اکیلی رہتی ہوں۔"
 "کب سے اکیلی ہو؟"

"گلتا ہے ساری عمر اکیلے بیت گئی ہے۔" بڑھیا
 نے کہا۔ "لیکن میں نے وقت کے لمحوں کو ڈور نہیں جانے
 دیا۔ ایک ایک لمحے کو نیم کے چوں میں سموتی رہی ہوں۔
 اس کی جھنجھکی بھینٹی بھینٹی میں میری جوانی کی بو باس رہتی ہوئی
 ہے۔ جب بہت جھڑ میں سوکھے پتے ایک ایک کر کے
 آنگن میں گرتے ہیں تو ان کی "سس، سس" کی آواز
 میں مجھے اپنی سسکیاں سنائی دیتی ہیں اور جب سوکھی
 ڈالیوں سے گولیاں پھوٹی ہیں اور بیڑ گھنیری چھاؤں والی
 ہری پھتری بن جاتا ہے تو میری بوڑھی ضعیف ذات میں
 کوئی بڑے ہی بیٹھے سروں میں جوانی کے وہی گیت
 گنگناٹے لگتا ہے جو میں نے نہ جانے کس کی محبت میں
 گائے تھے۔"

"تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ تمہیں کس سے محبت
 تھی؟"

"اتنا ہی یاد ہے کہ دل میں محبت تھی۔ یوں جانو کہ
 محبت کا ایک پیغام جو کسی کو دے نہ سکی۔ عمر بیت گئی۔ تم سنو

"ہاں میں ہی نوری ہوں۔" بڑھیا نے کھاٹ کو نیم
 کے بیڑے سے گھسیٹ کر لاتے ہوئے کہا۔ "تم
 میرا نام سن کر شاید چونک اٹھے ہو۔ بیٹھے جاؤ۔ میں نے عمر
 کے ستر برس اس بیڑے سے بیٹھے گزار دیے ہیں۔ تم حیران
 ہو رہے ہو کہ میرا نام نوری کیوں ہے۔ کبھی چٹھی، زرد پتلی
 آنکھوں، سلید راکھ جیسے بالوں اور زرد چہرے پر عمر کی
 نکھری ہوئی گہری لکیروں پر میرا نام کچھ اچھا تو نہیں لگتا
 لیکن میں پیدا ہوئی تو ماں باپ نے مجھے نوری کہا تھا۔ وہ
 مجھے نوری کہتے کہتے مر گئے ہیں۔ میں مر جاؤں گی تو لوگ
 یہی کہیں گے کہ نوری مر گئی ہے، کبھی میری آنکھوں میں
 بھی نور تھا۔ کچھ ایسا ہی نور میرے رخساروں پر بھی تھا۔
 اب نوری رہ گئی ہے، نور مر گیا ہے۔ تم ذرا اچھی طرح
 بیٹھ جاؤ نا۔ تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہیں، عمر کی بات
 ہے۔ میں جانتی ہوں ان ہاتھوں سے تم نے بھی پانچ من
 کی سل بھی اٹھالی ہوگی مگر آج تمہارے ہاتھ تمہاری پتلی
 پتلی انگلیوں کا بوجھ بھی نہیں سہار سکتے۔ تمہاری عمر مجھ جتنی
 ہوگی؟ یہی کوئی ستر بہتر برس۔"

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" بڑھیا نے پوچھا۔
 "میں نے تمہیں پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔۔۔۔۔ شاید تم آگے
 جا رہے تھے اور ذرا سستانے کو نیم کے بیڑے آ کر کے
 ہوا۔"

بوڑھے نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے چہرے
 پر عمر کی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔ اس کی ہاتھوں کو جھنجھکی
 ہوئی اور اس نے اُدھ مٹی آنکھوں سے نوری کو دیکھا۔

"ہاں نوری!" بوڑھے نے کہا۔ "ذرا نیم کے بیڑے
 سے سستانے آ رکا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ منزل جتنی
 قریب آ رہی ہے، مسافت اتنی ہی کٹھن ہوتی جا رہی
 ہے۔ اب اور آگے جانے کی ہمت نہیں۔ دل ساتھ نہیں
 دے رہا، روح شل ہو گئی ہے۔"

"تمہیں میرا نام کس نے بتایا تھا؟" نوری نے

تمہارے باپ کے سینے پر پانچ من کی سل بن کے گری،
پھر کیا ہوا؟ وہ سل کس نے اٹھائی تھی؟

”کسی نے بھی نہیں۔“ بوڑھی لوری نے کہا۔ ”میرا
باپ ڈاکیہ تھا جسے خدا نے ایک بچی اور سرکار نے ایک
دروئی دے دی تھی۔ دروئی بھی اور بچی بھی اُس کے ساتھ
چلی اُسے دیمک کی طرح کھاتی رہیں۔ میرا باپ خاکی
چٹلون اور خاکی کوٹ پہن کر اور سر پر خاکی پگڑی لپیٹ کر
صبح ہی صبح گھر سے نکل جاتا تھا۔ کئی بار مرمت کئے ہوئے
جوتے گھسینا سارا دن لگی تھی، گھر گھر گھومتا اور خط تقسیم کرتا
رہتا تھا۔ میرا باپ لوگوں کے لئے جسم پیغام تھا۔ محبت کا
بھی، نفرت کا بھی، مسرت کا بھی، ملال کا بھی..... لوگوں کو
وصال کے سندیس دیتا تھا، وفات کے بھی، اُس کے قہقہے
میں پھول بھی تھے، پتھر بھی، مگر وہ اپنی بیٹی کے لئے بھی
کوئی سندیس نہ لایا، کبھی کوئی نیلا لفافہ نہ لایا جس میں حطر
رچا ہوا ہوتا۔ وہ خود ہی میرے لئے پیار کا سندیس تھا۔
شام کو تھکا ماندہ گھر آتا تھا تو میں دوڑ کر اُس سے لپٹ
جاتی تھی اور وہ میرے گالوں پر تھپکیاں دے کر سینے سے
لگا لیا کرتا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جایا کرتی
تھی۔ اُس کے پاس اس بے ساختہ مسکراہٹ کے سوا کچھ
بھی نہ تھا۔ لوگوں میں سینکڑوں ہزاروں روپے تقسیم کرنے
والا ڈاکیہ میرے لئے دو چار بیسوں کی ریوڑیاں خرید
لانے سے بھی معذور تھا.....

”پھر وہ مجھے گودی سے اتار دیا کرتا تھا مگر اُس کی
چال ڈھال ایسی ہوتی تھی جیسے وہ میرے بوجھ سے تھک
گیا ہو۔ ماں چوہے چوہے کے میں جی رہتی تھی یا محلے کے
بچوں کو قرآن پڑھایا کرتی تھی۔ بس ایسے ہی میں نے بھی
قرآن پڑھ لیا تھا۔ دھن والوں کی بچیاں ہنسی کھیلتی سکول
جایا کرتی تھیں اور میں کھڑی انہیں دیکھا کرتی اور سوچا
کرتی تھی کہ یہ اس لئے سکول جاسکتی ہیں کہ ان کے باپ
ڈاکیہ نہیں۔ میں نے ایک بار ماں سے کہا کہ مجھے بھی

تا..... میں تمہیں نیم کے پڑ کی کہانی سنا رہی تھی.....

”اور جب سادون میں نیم کی نمبولیاں بکتی ہیں تو
محلے بھر کے بچے دن بھر بیڑ پر چڑھے چڑیوں کی طرح
چبکتے رہتے ہیں۔ پھر میرا بچپن لوٹ آتا ہے۔ میں بھول
جالی ہوں کہ میں اکیلی ہوں۔ میں تمہیں اپنی جوانی کی
کوئی تصویر نہیں دکھا سکتی۔ میرے ذہن میں جھاگو تو
ڈرا..... میرے گھنیرے ریشمی بالوں، دیکھتے گالوں اور
شرمائی لپائی چال ڈھال کو دیکھ کر پانچ من کی سل اٹھانے
والے لنگھیوں دیکھا کرتے تھے اور نہ جانے مجھے ان پر
فصہ کیوں نہیں آتا تھا؟.....

”اس الہٰی خیار دن کا نام لوری تھا۔ میں تو اس لوری
کا سایہ ہوں جسے دو بچے سورج کے ساتھ گپ اندھیری
رات میں گھل مل جانا ہے۔ کبھی سہیلیاں مجھے کہا کرتی
تھیں، لوری! حیرت جوانی تو قیامت ہے لیکن میری جوانی
نے جو قیامت میرے ماں باپ کے سینے میں پائی تھی وہ
تو کوئی بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ لانے قدر اور گول ہانپوں
والی لوری کو آجیں بھر بھر کے دیکھنے والے کسی بھی پھیل
پھیلے کو خدا نے امت نہ دی کہ میری جوانی نے میرے
ماں باپ کے سینے پر جو پانچ من کی سل رکھ دی ہے، ذرا
اسے اٹھا کر پرے کر دے۔ پر ایسا نہ ہوا.....

”تم لپٹ جاؤ نا! کہتے تھے تھک گیا ہوں۔ میں
نے اتنی باتیں کبھی نہیں کیں۔ کروں بھی کس سے؟ باتیں
سننے کے لئے تمہاری طرح کون پاس آ کے بیٹھتا ہے۔
رات کو دیا جلتا پھوڑ دیتی ہوں، شاید کوئی تھکا ماندہ مسالر
دم بھر کو میری کتاب میں رک جائے۔ کچھ اپنی کہے، کچھ میری
سنے، پر کون آتا ہے یہاں۔ آج تم آئے ہو تو اس
دھوکے میں اپنی کہانی چھیڑ بیٹھی ہوں جیسے تم میری کہانی ہی
تو سننے آئے ہو یہاں۔“

”کہانی ہی تو سننے آیا ہوں لوری!“ بوڑھے نے
لرزتی آواز میں کہا۔ ”کیوں لوری! تمہاری جوانی

کرتے اور میں شرماتی لپاتی سی، سہیلی کے گھر جا پہنچی مگر مجھے قصہ نہیں آیا کرتا تھا۔ وہ مجھے پھینٹتے نہیں تھے، آج کل کے لڑکوں ہالوں کی طرح گندے گندے بول نہیں گاتے تھے۔ آوازے نہیں کتے تھے۔ پر اُن کی مکھی مکھی سی انگڑائیاں اتنا ضرور کہہ جاتی تھیں۔ "نوری! تم ہمیں اچھی لگتی ہو۔ کبھی کبھی قریب سے گزر جایا کرو۔ اور میں بھی سوچتی تھی کہ یہ لوگ دیوار کے سائے تلے کھڑے میرا کیا بگاڑ لیتے ہیں۔ بس دیکھ لیتے ہیں..... پر تمہیں کئی بات بتا دوں..... دل یوں مچلتا تھا کہ میں ان کے قریب سے گزرتی رہوں اور وہ مجھے دیکھتے رہیں اور کبھی دل یوں بھی مچلتا تھا کہ میں بھی انہیں دیکھوں مگر نظر ملتی تھی تو بدن میں گدگدی سی ہوتی تھی۔ پھر نظریں آپ ہی آپ جھک جاتی تھیں.....

"ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟ تم مجھے یاد دلاتے چلو نا چپ کیوں بیٹھے ہو..... تم نے بھی شاید مجھے کبھی دیکھا ہوگا؟"

"دیکھا تھا نوری!" بوڑھے نے یوں آنکھیں موند لیں جیسے مرجھائی ہوئی پلکوں کی تیرگی میں نوری کے گئے گزرے حسن و جوانی کو دیکھ رہا ہو۔ خواب ناک آواز میں بولا۔ "تم اپنی ماں کی بات کر رہی تھی نا کہ تمہاری جوانی نے اُسے قسطنطنیہ مزاج بنا دیا تھا۔"

"ہاں!" نوری نے کہا۔ "ماں نے مجھے اُن باتوں سے بھی آگاہ کر دیا تھا جو مجھ سے یا میرے جسم سے ہی متعلق تھیں مگر میں ان سے آگاہ نہیں تھی۔ جہاں دوپٹہ سر سے ڈھلکا اُس نے ڈانٹ کر کہہ دیا۔" کیا بے حیاءوں کی طرح زلفیں بکھیر رکھی ہیں، ڈھک لے انہیں۔ اور میں جان گئی کہ زلفیں جوان لڑکی کے حسن کا ایک حصہ ہوتی ہیں جو ہر کسی کو دکھاتے پھرنا اچھا نہیں اور جب ماں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ دوپٹہ ذرا سینے پر اچھی طرح پھیلا کے رکھا کرو تو مجھ پر کچھ ایسے راز الٹا ہوئے جو میں اپنے

سکول داخل کر دو لیکن ماں نے کالوں کو ہاتھ لگا کر کہا تھا۔ نہ، نہ، نہ سکول جا کر دین ایمان برباد ہو جاتا ہے۔ ابھی بچیاں گھر قرآن پڑھ لیا کرتی ہیں..... تم جانو، غریب یوں ہی اپنے آپ کو قریب دے لیا کرتے ہیں۔ جو چیز لکھنے والے نے نصیب میں ہی نہ لکھی ہو، ہم غریب اُسے اپنے لئے حرام قرار دے لیتے ہیں.....

"بس یہ بھی ہماری زندگی جس میں کبھی کوئی تہدیلی نہ آئی۔ کلبہ کے گرد ایک چکر تھا جس پر ہمارا کتبہ گھومتا رہا اور گھومتا ہی رہا مگر یک لخت ایک انقلاب آ گیا۔ میں جوان ہو گئی اور ایک شام باپ گھر آیا تو میں پہلے کی طرح دوڑ کر اُس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ باپ نے میرے گال تھپکانے کو ہاتھ بڑھایا مگر ہاتھ یوں روک لیا جیسے میرے گال اٹکارے بن گئے ہوں۔ باپ کھیانی سی ہنسی اُس دیا اور اُس کے تھکے ہوئے چہرے کا رنگ بدل گیا.....

"اُس رات میں نے لفاف میں چھپ کر اپنے گال کو ہاتھ لگایا تو گال تپ رہا تھا۔ اٹکارے کی طرح..... پھر میرے اور باپ کے درمیان ایسی دیوار حائل ہو گئی جسے میں محسوس کرتی تھی، دیکھ نہ سکتی تھی۔ میری ماں نے میرے بچپن اور میرے درمیان ٹاٹ کا ایک پردہ حائل کر دیا..... دروازے پر لٹکے ہوئے ٹاٹ کے پردے نے میرے ذہن کو سوالوں سے بھر دیا۔ ان میں سب سے زیادہ پریشان کرنے والا سوال یہی تھا کہ میرے ذہن میں اتنے ڈھیر سارے سوال ایک ہی ہار کیوں آ گئے ہیں؟.....

"میری جوانی نے میری ماں کو قسطنطنیہ مزاج بنا دیا۔ ٹاٹ کا پردہ پتھروں کی دیوار تو نہیں تھا۔ میں کسی سہیلی کے گھر چلی ہی جایا کرتی تھی اور یہی وہ وقت ہوتا تھا جب پانچ من کی بسل اٹھانے والے جوان مجھے گھورا کرتے، مسکرایا کرتے، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہہ جایا

RTM: 71114



سب اچھا لگا مگر
بات ان سے بنی



U.I INDUSTRY

184-C, Small Industries State
Gujrat PAKISTAN.

PH: +92 53 3535901-2, 3523494-5

Fax: 053-3513307

E-mail: nbsfans@gmail.com

آپ سے بھی چھپانے لگی اور جب ماں نے مجھے عمر قید کا حکم سناتے ہوئے کہہ دیا کہ اب باہر نہ جایا کر، گلیوں میں موئے مسٹوے دیدے پھاڑے کھڑے دیکھتے ہیں تو میں ناٹ کے پردے کے پیچھے قید ہو گئی مگر میرے تصور وہ کو کوئی گرفتار نہ کر سکا..... تم جانو، تصور تھائی کے ساتھی تو ہوتے ہیں پر ہوتے فریب ہی ہیں۔ میری جوانی چٹان ایسی حقیقت تھی جس سے بڑے بڑے حسین فریب گھرا کر ریزہ ریزہ ہو گئے.....

”اور پھر ایک روز میرا باپ اپنی زندگی کی پہلی اور آخری چشمی اپنے گھر بھی لے آیا۔ میں اتنا ہی سن سکی کہ میرے باپ نے رازداری سے میری ماں سے کہا۔ ”اُن کی چشمی آئی ہے۔ ہمارے گھر میں چشمی کا آنا میری جوانی سے کہیں زیادہ اہم اور لوکھا واقعہ تھا۔ میں پوچھنے ہی لگی تھی کہ امی، ابا کس کی چشمی لائے ہیں کہ ماں نے مجھے کہا۔ مگر ذرا..... ابو کے لئے چائے بنا دے، ہمارے گھر میں شام کی چائے بھی ایک واقعہ ہوا کرتی تھی۔ اُس روز یہ واقعہ ایک عرصے بعد زور و فہا ہوا تو میں سمجھ گئی کہ چشمی میں کوئی ایسی بات لکھی ہے جو میرے جانے والی نہیں۔ میں جانا نہ چاہتے ہوئے بھی چوہے پر جا بیٹھی اور اپنے ماں باپ کی کسر پھر سن رہی.....

”میں نے رات ماں سے پوچھ ہی لیا کہ کس کی چشمی ہے؟ ماں نے بتایا کہ کل کوئی مہمان آنے والے ہیں۔ پھر اُس نے مجھے دھلے کپڑے پہننے، آنکھوں میں کاہل اور سر میں جیل ڈالنے کی تاکید کی۔ یہ بھی کہا کہ وہ آئیں تو اُن کے سامنے سکھڑ بیٹیوں کی طرح اٹھنا بیٹھنا۔ کوئی ایسی حرکت یا بات نہ کرنا جس سے وہ کہہ بیٹھیں کہ کیسی اجڈ لڑکی ہے۔ دیکھ، یہ تیرے ابا کی عزت بے عزتی کا سوال ہے.....

”اگلی صبح ہمارے گھر میں اتنی صفائی ہوئی جو کبھی عید پر بھی نہ ہوئی تھی۔ میں نے عید والے کپڑے پہنے۔

.....تم اس موٹی بھدی اور سوکھی سڑی عورت کو دیکھ لیتے تو جان لیتے کہ قصائی بکرے کو کیسی نظروں سے دیکھتا ہے..... میرے منہ میں زبان تھی مگر ماں نے جو کہہ دیا تھا کہ اس کے منہ میں زبان نہیں ہے، میں جان گئی کہ میرے باپ کی عزت اسی میں ہے کہ میں فرض کر لوں کہ میرے منہ میں زبان نہیں ہے۔ میں نے ہونٹ بھیج لائے اور زبان کو دانٹوں تلے دھالیا..... پھر مجھے حکم ملا۔ 'جاؤ'۔ اور میں دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے اپنی دو سہیلیوں کی باتیں یاد آنے لگیں۔ انہیں بھی اسی طرح کی دو عورتیں دیکھنے آئی تھیں جنہوں نے اسی طرح کی باتیں کی تھیں لیکن سہیلیوں نے مجھے اس کے بعد کی جو کہانی سنائی تھی وہ کسی طلسماتی دیس کی بڑی ہی پیاری داستان تھی۔ وہ ایک شہزادے کی کہانی تھی، خوابوں کا قصہ تھا.....

"اور اُس روز میرے ذہن نے بھی ایک شہزادے کو جنم دے کر اس کے گرد رنگ رنگیلے تاروں کا جال تن ڈالا پھر مجھ پر خمار ساطاری ہونے لگا اور ان عورتوں کی گھورتی آنکھیں اور بے مزہ باتیں اچھی لگنے لگیں....."

"وہ چلی گئیں۔ شام کے وقت میرا باپ گھر آیا تو اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری ماں کو دیکھا۔ میں نے دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔ ماں کی آنکھوں میں مایوسی کی جھلک تھی۔ وہ کمرے میں سر جھکائے باہر آیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور آہ بھر کر منہ پھیر لیا۔ میں نے جو تصور تخلیق کئے تھے، وہ ریزہ ریزہ ہو کر ذہن سے گرو کی طرح اڑ گئے۔ طلسماتی دیس کا شہزادہ بھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ پھر میرے ذہن کی کوکھ بانجھ ہو گئی اور کسی تصور کو جنم نہ دے سکی....."

"دن گزرتے چلے گئے اور میری ماں چپ چاپ آہیں بھرتی رہی۔ باپ کے کندھے کچھ جھکے جھکے سے رہنے لگے۔ میں جان گئی کہ میرا وجود پانچ من کی سل بن گیا ہے جسے بوڑھا اور غریب ڈاکیہ بھی نہیں، کبھی نہیں

ماں نے اپنے ہاتھوں سے میری نگہبانی کی، میری آنکھوں میں کاجل ڈالا اور مجھے اس طرح سر سے پاؤں اور پاؤں سے سر تک دیکھا کہ میں حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ میں اُس وقت نادان تھی، کچھ سمجھ بھی گئی، کچھ نہ بھی سمجھ سکی مگر آج سوچتی ہوں تو کچھ بھی سمجھ نہیں آتا کہ ہم اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سہا سوار کر فرائض کے لئے فیروں کے سامنے کھڑا کرتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں، دیکھ، تیرے ابا کی عزت ہے عزتی تیرے ہاتھ ہے....."

"بس، تم جانو، ایسی ہی نمائش میری ہوئی۔ ہماری مہمان دو عورتیں تھیں۔ ایک تو سوکھی سڑی اور دوسری اتنی موٹی جیسے دوسری عورت کی روزی بھی اللہ نے اسی کے نام لکھ دی ہو۔ مجھے ماں نے دوسرے کمرے سے بلایا تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ قدم بوجھل ہو گئے۔ بدن کانپنے لگا اور میں خواب میں چلنے کی طرح چلتی ہوئی مہمانوں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ یاد نہیں میں نے انہیں سلام کیا تھا یا نہیں۔ میرے کانوں میں ایک عورت کی آواز پڑی۔ 'اچھا، یہ ہے نوری'۔ ماں نے کہا۔ 'بیٹہ جاؤ'۔ اور میں کھات پر بیٹھ گئی۔ موٹی عورت نے کہا۔ 'اٹھو تو ذرا'۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے سوکھی سڑی عورت سے کہا۔ 'قد کاٹھ تو اچھا ہے'۔ سوکھی سڑی عورت نے پوچھا۔ 'مگر کتنی ہے؟' ماں نے ذہن پر زور دیا، آنکھیں موندیں اور ڈک ڈک کر بولی۔ 'میری شادی کے چار سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب امرتسر میں گولی چلی تھی اور گوروں نے دیسیوں پر بڑا ظلم کیا تھا۔ موٹی عورت نے کہا۔ 'پھر سال دو سال کم ہیں کی کہو نا'۔ میری ماں نے کہا۔ 'سلائی ہائی خوب کرتی ہے'۔ سوکھی سڑی عورت نے پوچھا۔ 'لگائی بھائی تو نہیں کرتی؟'۔ 'نہ جی، اس بے چاری کے منہ میں تو زبان ہی نہیں'۔ ماں نے کہا....."

"تم نے کبھی قصائی کو بکرا خریدتے دیکھا ہے؟

ماں بیٹی، اس نیم کے بیڑ تلے بیٹھی دکھ بانٹتی رہتی تھیں۔ میں نے اس چٹھی کو پھاڑ ڈالا اور اس کے پڑوں کو نیم کے سنے کے ساتھ دفن کر دیا تھا۔ وہ تو میرے خوابوں کے پڑے تھے جنہیں میں نے اپنے ہاتھوں دفن کر دیا تھا۔ مجھے اُس موٹی عورت اور سوگی سڑی عورت سے نفرت ہو گئی لیکن اُس مرد سے مجھے نفرت نہ ہوئی جس کے لئے وہ میرا رشتہ لینے آئی تھیں۔ میں نے ہار ہا سوچا، تنہائیوں میں سوچا، لحاف کے اندر میرے میں اور نیم کی چھاؤں میں بیٹھ کے سوچا جانے وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ اگر وہ خود آتا تو شاید مجھے چیز کے بغیر ہی ساتھ لے جاتا! پھر مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ میرے لئے آہیں بھر رہا ہو اور ماں سے کہہ رہا ہو کہ نہیں، میں تو لوری سے ہی بیاہ کر دوں گا۔ جانے کیوں مجھے دکھ سا ہونے لگا کہ چیز کی خاطر دو دلوں کا خون کر دیا گیا ہے۔

”اور کچھ ایسے ہی فریب تھے جو میں اپنے آپ کو دیتی رہی اور نیم کا یہ بیڑ بڑھتا پھولا۔ ہا۔ اس کی چھتری چوڑی اور گھنیری ہوئی چلی گئی۔ سپنہ جھڑے بھی، ہرے بھی ہوئے اور ایک روز ایک پڑوسن میری ماں سے کہہ رہی تھی۔ ”لوری بہت بڑی ہو گئی ہے بڑا، کوئی غریب غرا کر دیکھ لو۔“ ماں نے کہا۔ ”غریب کھوئے بھی آتے ہیں تو تین ہزار کے زبرد پکڑے سے نیچے بات ہی نہیں کرتے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم پانچ ہزار حق مہر لکھوائیں گے تو وہ یہ کہہ کر اٹھ جاتے ہیں کہ ہمارے ہاں حق مہر کا تو رواج ہی نہیں۔“ ماں نے منہ پرے کر کے آنسو پونچھ ڈالے اور پڑوسن یہ کہہ کر چلی گئی کہ اچھا، ذرا صبر کرو، میں کچھ کرتی ہوں۔“

”پڑوسن کو کچھ کرتے دو سال بیت گئے، اور ایک بار پھر میری نمائش کی گئی۔ میں جب مہمانوں کے سامنے گئی تو جواب سا۔ ”لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔“ تم جانو، مرد تنہا خود غرض، کتنا کشور ہوتا ہے۔ ساتھ برس کی عمر میں سولہ

اٹھائے گا۔ تم جانو، محبت اور ملال دو ایسے جذبے ہیں جو کسی رازدوں کے بغیر برداشت نہیں ہوتے۔ ماں نے ملال سے گھبرا کر مجھے رازدوں بتالیا اور بتایا کہ لوری، تم تو انہیں پسند آگئی تھیں پر وہ چیز بہت مانگتے ہیں۔ بیٹی! پیٹ کاٹ کر اڑھائی تین سو روپے جوڑے تھے۔ سوچتی ہوں اس سے زبرد بھاؤں یا کپڑے۔ وہ کہتے ہیں، گیارہ جوڑے رہی ضرور ہوں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ ابھی لوری پنگ بھی نہیں بنا۔“

”جس نے ساری عمر موٹی خاکی وردی اور کٹی پار مرمت کرائے ہوئے جوتوں میں گزار دی تھی، وہ رہیم کے دو جوڑے بھی نہ بنا سکا، وہ نہ لوری پنگ بنا سکا جس کے پائے لال سرخ ہوتے ہیں۔ میرے ماں باپ نے اپنا سارا ہی خون نچوڑ ڈالا مگر پنگ کا ایک پایہ بھی سرخ نہ ہو سکا۔ ایک رات ماں کبھی شاید میں سو گئی ہوں۔ میرے اما سے کہنے لگی۔ ”عیدوں پر اُن گھروں سے ہو آیا کرو جہاں عید کارڈ تقسیم کرتے ہو۔“ میرا باپ پھنکار کر بولا۔ ”مجھے بھیک مانگنے کو کہہ رہی ہو؟ بیٹی کو تمام عمر کنواری بٹھائے رکھوں گا، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا۔“

”آج تو تم جانتے ہو کہ ڈاکے اُن گھروں سے بھی عیدی لئے بغیر نہیں ملتے جہاں عید کے روز بھی بچوں کو سنے پکڑے نصیب نہیں ہوتے۔ وقت وقت کی بات ہے۔“

”بڑھیا نے بوڑھے کو جھجھوڑ کر کہا۔ ”تم تو سوچو۔“

”نہیں تو!“ بوڑھے نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ ”بڑے غور سے سن رہا ہوں۔ تمہارا باپ بھیک نہیں مانگتا چاہتا تھا تا۔“

”آج ہی آج سن لو۔ تم بھی پھر لوٹ کے نہیں آؤ گے۔ میرے پاس اس کہانی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔“

لوری نے کہا۔ ”میری ماں نے مجھے رازدوں بتالیا اور ہم

کوکھ نے کسی انسان کو جہنم نہ دیا جس کی تاریخ راتیں بارات کی راہ دیکھتے گزر گئیں اور جس کا جسم مرد کے پیار بھرے لمس کو ترستا مر جھا گیا۔ میرے ابا کی چار پائی میہیں رکھی تھی جہاں تم لیٹے ہوئے ہو۔ آج بھی وہ مجھے یہیں لیٹا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر گھر مسرت اور ملال کے سندیس دے دینے والا ڈاکیر، شکوے شکایتوں کا بے جان اور بے حس سندیس بن کر خدا کے حضور چلا گیا۔ تم تو ستر بہتر کے بیٹے میں آ کے بوڑھے ہوئے ہو مگر میرا باپ پچاس برس جی کر ہی تم سے زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ سینے پر پانچ سن کی بسل رکھ کر ستر برس کون جی سکتا ہے.....

”پھر وہ پیسے جو ماں باپ نے پیٹ ہاندھ کر میرے جیڑ کے لئے جمع کئے تھے، وہ ماں بیٹی نے کھا لئے۔ جب آخری کوڑی بھی پیٹ کی بھٹی میں پھسل گئی تو ماں بھی اسی نیم تلے لیٹ گئی۔ بے جان اور بے حس۔ اُس کی میت جیسے مجھے یہ زبان خامشی کہہ رہی تھی۔ ”لوری! اب ٹاٹ کا یہ پردہ اتار پھینک سر سے دوپٹہ سرک جانے دے۔ تیرے کچھڑی جیسے بالوں کو اب کون ڈک ڈک کر دیکھے گا“.....

”جب لوگ میری ماں کو بھی اٹھا کے لے گئے تو میں بہت روئی، کچھ اس لئے کہ میرے ماں باپ دنیا سے اٹھ گئے تھے اور زیادہ تر اس لئے کہ میں اس دنیا میں کیوں آئی تھی۔ میری موت کوئی حادثہ نہیں ہوگا، حادثہ تو میری پیدائش تھی.....

”ماں تھی تو میں اُس سے ڈکھ بانٹا کرتی تھی۔ وہ نہ رہی تو میں نے نیم کے چوں کو راز داں بنالیا۔ میں نے اس بیڑ سے بہت باتیں کی ہیں۔ میں مر جاؤں گی تو لوگ کہیں گے کہ لوری مر گئی ہے، اور وہ یہ تو ضرور ہی کہیں گے کہ لوری بچی تھی، جانے بیڑ کی گھنٹی شاخوں میں نظریں الجھائے ہوا کیوں کرتی تھی؟ اور ان شاخوں میں جب فاختہ کا گھونسا آباد ہو جاتا تھا تو لوری اس پر گھٹی ہاندھے

برس کی بچی سے بیاہ رہا لیتا ہے اور بچی اٹھا نہیں برس کی ہو تو کہتا ہے، عمر زیادہ ہے.....

”تم بھی کچھ بولونا تم بھی مرد ہو۔ اس عمر میں بھی تم اپنے آپ کو بوڑھا نہیں کہو گے مگر اٹھا نہیں برس کی کنواری لڑکی کو دیکھ کر کہو گے، یہ تو بوڑھی ہو چلی ہے۔ میری عمر اٹھا نہیں برس تھی جب میں رشتے وحوطے والوں کے لئے بوڑھی ہو گئی تھی۔ میں نے کالے کلوٹے، بھدے، بد صورت مردوں کو بھی کہتے سنا ہے کہ میں تو لڑکی کو دیکھ کر بیاہ کروں گا۔ تم لڑکی کو بھی یہ حق کیوں نہیں دیتے؟ تم اپنی عزت کو لڑکی کی زبان کی ٹوک پر کیوں رکھ دیتے ہو؟ جب لڑکی اپنی زبان کو دانتوں تلے دے لیتی ہے تو جالو اُس نے تمہاری عزت اور تمہاری ٹاک کو کاٹ کھایا ہے۔ تم نہ اپنی عزت سے رستے ہوئے خون کو دیکھتے ہو نہ اپنی بیٹی کے ارمالوں سے ٹپکتے ہوئے لہو کو دیکھتے ہو، پر لڑکی دووں کے خون کو اپنے جگر میں چھپا لیتی ہے اور یہ خون زہر بن کر اُسے اندر ہی اندر کھاتا رہتا ہے۔ وہ گھٹ گھٹ کے مر جاتی ہے پر فریاد نہیں کرتی۔ اُسے جس کے پلے ہاندھ دو، وہ اُس کے اسی بول پر قربان ہو جاتی ہے۔ ”تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو مجھے تم سے محبت ہے۔“ وہ ان دو جملوں کی خاطر بچے جنتی ہے، بھٹ جھوٹتی ہے اور اپنی جوانی کا رس اور اپنا خون چھاتوں کے راستے اُس مرد کے بچوں کو پلا دیتی ہے جو اُسے کہتا ہے۔ ”تم مجھے اچھی لگتی ہو مجھے تم سے محبت ہے.....

”پر میں تو ان دو جملوں کو ترستی ہی رہی اور نیم کا بیڑ بوڑھا ہوتا چلا گیا۔ پھر پت جھڑ میں اس کے پتے میری جوانی کی موت پر سسکیاں بھرتے رہے۔ میرے دروازے پر کوئی ہارات نہ آئی۔ میرے آگن سے ڈولی نہ اٹھی۔ یہاں سے کچھ اٹھا تو وہ میرے باپ کا جنازہ تھا جس نے اتنے پیسے جمع کر لئے تھے کہ گیارہ جوڑے ریشمی کپڑے بنوا لیتا لیکن میں بنیادی ماں بن چکی تھی جس کی

جانے ردیا کیوں کرتی تھی؟.....
 ”تم مرد ہو۔ تم کبھی نہ سمجھ پاؤ گے کہ عورت ہنستی

ہے تو کیوں ہنستی ہے، روتی ہے تو کیوں روتی ہے۔ تم نے کبھی روتی ہوئی مسکراہٹ دیکھی ہے؟ کبھی مسکراتے ہوئے آنسو دیکھے ہیں؟ نہیں دیکھے۔ تم مرد ہو نا۔ تم عورت کا جسم دیکھتے ہو۔ ساتھ برس کے کھوسٹ ہو کر اٹھائیں برس کی چھوکری کو بڑھایا کہتے ہو..... یہی مرد کی بد نصیبی ہے.....

”بس عمر یوں ہی بیت گئی۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ نوری جوان ہو گئی ہے پھر مجھے لوگوں نے ہی بتایا کہ نوری بوڑھی ہو گئی ہے، پر مجھے یاد نہیں کہ جوانی کہاں ختم ہوئی اور بڑھاپا کہاں سے شروع ہوا۔ بچے آئے تو انہیں قرآن پڑھائی رہی اور ان سے کھیلتی رہی، وہ چلے گئے تو نیم تلے کھاٹ پر لیٹ گئی، پر ایک بات ضرور کہوں گی کہ میری وہ سوچ بوڑھی نہیں ہوئی کہ وہ کون تھا؟ وہ کیا تھا جس کا پہلا سندیس آیا تھا؟ میں نے اُس کے سندیس کے پُزے یہیں دفن کر دیئے تھے جہاں تم لیٹے ہوئے ہو۔ پر اُس کے تصور کو دفن نہ کر سکی۔ میری سوچ ایک تصور بن گئی۔ جسم بوڑھا ہوتا گیا۔ تصور جوان ہوتا گیا۔ میں تصوروں کی دہن بنی بیٹھی رہی۔ پر وہ نہ آیا۔ نہ اس کی آواز سنائی دی۔ ”نوری! تم مجھے بڑی اچھی لگتی ہو۔ لگتا ہے جیسے مجھے اُس سے پیار ہو گیا تھا۔ اب بھی ہے۔“

”سچ کہتی ہو؟ نوری! تمہیں اس سے اب بھی پیار ہے؟“ بوڑھا لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھا اور لرزتی اور تھر تھرتھاتی آواز میں بولا۔ ”وہ سندیس میرا تھا جس کے پُزوں کو تم نے یہاں دفن کیا تھا۔ وہ مولیٰ عورت میری ماں تھی اور سوکھی سڑی میری خالہ تھی۔ وہ خط میرے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا کیونکہ میرے ماں باپ لکھے پڑھے نہیں تھے۔ میں نے وہ خط پچاس میل دُور سے لکھا تھا لیکن تمہیں بہت قریب سے دیکھ کر۔ ذرا یاد کرو۔ بوڑھے ذہن سے وقت کے پردے اٹھاؤ تو تمہیں ایک رات یاد آئے گی۔ باہر والی حویلی میں ایک شادی تھی۔ وہ میرے چچا کی حویلی تھی۔ اب تو سب مر مرا گئے ہیں۔ میں بھی آیا تھا۔ تم سکھی سہیلیوں میں بیٹھی وہاں ڈھولک پر گار رہی تھیں۔ میں نے تمہاری چال میں لوح دیکھی تھی، آنکھوں میں خمار دیکھا

”میں تو پھر بھٹک گئی ہوں۔ تم مجھے یاد دلاؤ نا کہ میں کیا کہہ رہی تھی۔ جانے سے پہلے ساری بات سننے جاؤ۔ پھر تم کب آؤ گے یہاں سستانے کو۔“

”تم کہہ رہی تھیں نا کہ پھر تم نے نیم کے چوں کو رازداں بنا لیا۔“ بوڑھے نے رشہ گیر آواز میں کہا۔

”میں سن رہا ہوں نوری! میں سننے ہی تو آیا ہوں۔“

”ہاں تو۔“ نوری بولی۔ ”میں نے پھر ایک روز محلے کے دو بچوں کو قرآن کا سبق دیا تو اگلے روز دو اور بچے آ گئے۔ پھر پھر وہ ہیں بچے آنے لگے اور میں انہیں قرآن پڑھانے لگی۔ یہ بچے اب بھی میرے ہاں آتے ہیں لیکن یہ اُن بچوں کے بچے ہیں جو پہلے پہل میرے ہاں آئے تھے۔ یہ میرے اپنے بچے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ایسی خوشی سی ہوتی ہے جیسے یہ میری ہی کوکھ کی پیداوار ہوں اور تصوروں میں انہیں دودھ پلاتے میری چھاتیاں کبھی خشک نہیں ہوتیں۔ پر سچی کہوں، جب نسلی منی بچوں کو اپنے آنگن میں کد کڑے لگاتے اور پٹ پر چڑھتے اترتے دیکھتی ہوں تو سو سودا عا نہیں کرتی ہوں، یا مولا، ان بچوں کو جوان نہ کر دیتا۔ کسی بچی کو پانچ من کی سل نہ بنا دیتا ورنہ کوئی ضعیف باپ دب کر مر جائے گا، پر وہ بڑی ہو جاتی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو ایسے مرد کے ساتھ بندھ جاتی ہیں جو انہیں لو کہیں سے اٹھا کر بڑھاپے میں ڈنچ دیتا ہے۔ انہیں علم ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ جوان بھی ہوئی تھیں اور جو

میں ایسا لساد بھا ہوا کہ میری بیوی روٹھ کر مچے چلی گئی۔ وقت گزرنے لگا اور طلاق ہو گئی۔ مجھے شادی سے نفرت ہو گئی، پر تیرے تصور کو ذہن سے اتار نہ سکا۔ ماں باپ نے بہت مجھڑ کیا کہ دوسرا بیاہ کر لو۔ میں نے کہا کہ کروں گا تو لوزی سے کروں گا۔ ماں نے کہا کہ عزت والے لوگ تھوک کے نہیں چاتا کرتے۔ وہ ہمارا دھکارا ہوا رشتہ ہے..... لوری ا!

اُس نے لپک کر لوری کے دونوں ہاتھ قیام لئے اور زندگی ہوئی آواز میں بولا۔ "آج تیرے دروازے پر آگرا ہوں۔ ساری عمر اکیلے گزار دی ہے۔" اُس نے بڑھیا کو زمین سے اٹھا کر اپنے پاس کھٹ پر بٹھا لیا اور گرتے کی جیب سے کانچ کی چوڑیاں نکال کر لوری کی مرہمائی ہوئی کلائیوں پر چڑھا دیں۔ کہنے لگا۔ "لوری! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، مجھے تم سے محبت ہے۔"

لوری نے بے تابی سے بوڑھے کے ریشہ گیر ہاتھ قیام لئے اور اس کے ہاتھوں میں اپنے چہرے کو چھپا کر سسکنے کے لہجے میں کہا۔ "ایک بار پھر کہو، تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ پھر کہو، مجھے تم سے محبت ہے۔" وہ ہچکیاں بھرنے لگی اور بولی۔ "تم بہت بوڑھے ہو پر تم نے پانچ من کی بسل اٹھالی ہے۔ میں نے باپ کی میت سے یہ بسل اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لی تھی۔ آج ہلکی پھلکی ہو گئی ہوں۔ یہ بسل پھر مجھ پر رکھ کر چلے نہ جانا۔"

بوڑھے نے اُس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ "میں چلے جانے کے لئے نہیں آیا لوری! میں یہیں دفن ہونے کے لئے آیا ہوں جہاں تم نے میرے ہاتھ کا لکھا ہوا سندیس دفن کیا تھا۔" اور بوڑھے کے آنسو لوری کے سپید راکھ جیسے بالوں میں گرنے لگے۔



تھا اور تمہاری آواز جو دوسریوں سے الگ تھلک تھی، تمہاری چال کی لوج کی طرح اور تمہاری آنکھوں کے غبار کی طرح مجھے ایسا دیوانہ بنا گئی کہ میں نے اس شادی کے بعد بھی تمہیں دوبارہ دیکھا تھا۔ میں کسی بھانے پچا کے گھر آ ہی جاتا تھا۔ میں نے بچی سے کہا تھا کہ تمہارے رشتے کی بات کریں۔ پھر جو تم پر ہتی وہ تم جانتی ہو مگر جو مجھ پر ہتی وہ تم نہیں جانتی۔"

بڑھیا کے ہونٹ لرزے مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ اُس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں مگر آنکھوں کو ہٹا لیں۔

بوڑھا کہہ رہا تھا۔ "وہ میری خالہ تھی جس نے تمہاری ماں سے پوچھا تھا کہ یہ لگائی بھائی تو نہیں کرتی؟ مگر وہ اُس لڑکی کو میری زندگی میں دھکیل کر خوش ہو گئیں جو لگائی بھائی کے سوا کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ تم عورت ہو لوری! تم نے عورت کی تصویر میں بڑے پیارے رنگ بھرے ہیں..... میں نے ایک سانپ دیکھا تھا جس کا رنگ چمکتا ہوا سبز تھا۔ اتنا پیارا رنگ کہ میں نے اسے مارا نہیں تھا مگر اسی سانپ نے میری بکری کو لٹک مارا تو میری بکری بغیر تڑپے مر گئی تھی۔ مجھے بھی رنگوں نے ڈس لیا۔ ماں باپ گیارہ جوڑے ریشمی کپڑے، ہارہ تولے سونا اور جہیز سے لدی ہوئی لاری کو دیکھ کر پھولے نہ سائے تھے مگر جس جہیز نے تیرے باپ کے سینے پر پانچ من وزنی بسل رکھ دی تھی، اسی جہیز نے وہی بسل میرے سینے پر بھی رکھ دی تھی۔ میری دلہن کے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ ابھی تازہ ہی تھا کہ اُس نے مجھے میری ماں سے لڑا دیا پھر گھر کے سارے ہی لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ میں نے اپنی بیوی کو مارا، ماں کو پیٹا، اپنے باپ کے منہ آیا اور میرا اچھا بھلا گھر جہنم بن گیا....."

"لوری! میرے لئے کوئی پناہ نہیں تھی۔ پھر ایک روز میں نے بھاگ کر تیرے تصور میں پناہ لے لی۔ گھر

تریاق

اس زندگی کی تکلیفوں کو بچن لو یا اس زندگی کی لیکن عارضی نہ بچو!

☆.....رہی شاہد

ضمہری۔
"میں تو یونہی مایوس ہو رہی تھی۔" اس نے جیسے اپنا
بمقامی اڑایا ہوا یا ان لوگوں کا جن کی ہوس اور زندگی کی انتہا
کبھی نہیں ہوتی۔

قدموں کی آہٹ قریب آرکی۔ وہ ایک بارہ تیرہ
سال کا بچہ تھا، گندہ، نامکمل لباس اور ایک بڑا سا بدلتا ہوا
جیسے اس کا کل اکاڑ تھا جو اس کے بڑھتے ہوئے قد کو
ڈھانپے ہوئے تھا۔ زمین پر کچھ ڈھونڈتی اس کی نگاہیں
جھیلہ کے بدلتا ہوا پتروں کو لپیٹے سینڈل پر آ رہیں۔
"سلام ہاجی جی!"

"ولیم السلام۔" جھیلہ نے بددلی سے جواب دیا
اور ذہن میں سوچنے لگی۔ ابھی کچھ ہاتھ لگے گا..... میں بھوکا
ہوں..... پیسے دے دو ہاجی جی۔ "ہونہہ" اس نے نفرت
سے ہٹکارا بھرا۔ گھٹیا لوگوں کی کم تر اولاد جن کا وجود ان
کے اپنے ماں باپ کے لئے بوجھ ہے۔ پیدا کر کے
سڑکوں پر چھوڑ دیتے ہیں اس نے دل ہی دل میں "گھٹیا
لوگوں" کو کوسنا شروع کر دیا لیکن کافی دیر گزر گئی۔ ایسی
کوئی آواز نہ آئی۔ وہ لڑکا دور پڑے کوڑے کے ڈھیر میں
سے کچھ ڈھونڈتا اور اسے کسی انمول خزانے کی طرح اپنے
تھیلے میں ڈال دیتا۔ چہرے پر عجب سا سکون تھا جس نے
جھیلہ ہالو کو چوٹا دیا تھا۔ "گاہک" کے آنے تک وہ اسی
سرگرمی کو انجوائے کرنے لگی اس کے چہرے پہ ایک تجسس

سڑک کے مشرقی کنارے جہاں روشنیاں سر شام
ہی مدھم ہو جایا کرتی تھیں اور کچھ لوگوں کے
لئے یہ مدھم روشنیاں بظاہر ان کی زندگی کے اجالوں کا
سبب بنا کرتی تھیں۔ جھیلہ ہالو اپنی عمر کے ڈھلتے پن کو
سمیٹنے اپنی ضرورت کی ڈور کو کسی آن چاہے اور انجانے
رشتے میں مدغم کرنے کی خواہاں تھی۔ مسئلہ رشتے کا نہیں
تھا۔ یہ مسئلہ عزت نفس، خودداری اور ذمہ ذات سے لکل کر
ضرورت اور بس ضرورت کا ہی تھا۔ پیٹ کی آگ
بچانے کی ضرورت سر چھپانے کی ضرورت اور زندگی کی
بچی مکی سانسوں کو قائم رکھنے کی ضرورت۔

آج کافی دیر سے جھیلہ نے اپنی کلائی پر بندھی
واحد بوسیدہ گھڑی کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ہوس
اور دولت کے پہاڑوں کے پاس پیسے کی ریل ٹیل
ہونے کے باوجود وہ بھوکی سوئے گی۔ "نہیں"۔ اس کے
اندہ سے جیسے کسی کی درد بھری آواز آئی ہو اور اس کے
تھکے چہرے پہ جھوٹی مسکان پھیلے۔ "پھر آج یہ دیر
کیوں؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ کبھی ایسا ہوا تو نہیں
تھا۔ اس شہر میں ہر قدم اور ہر لمحہ ضرورت کے پہاڑی
بھٹکتے بھٹکتے اس موڑ پر آ ہی رکتے تھے۔ پھر آج۔ ذرا دور
سے اپنی طرف بڑھتی ہوئی آہٹوں کی آواز نے اسے
خیالوں کی دنیا سے باہر آدھکیلا۔ اس کے مصنوعی آرائش
سے بچے چہرے پہ ایک شکاری کی طرح مسکراہٹ آ

”اچھا.....“ بھیلہ نے بیگ ٹٹولا گئے چنے سوئی روپے تھے اس نے بیس روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ ”لے لو!“

”نہیں باجی! ابا کہتا ہے حلال کی کھاؤ ورنہ اس جسم کو آگ لگے گی۔“

”ہا ہا ہا..... آگ؟“

”ہاں باجی! ابا کہتا ہے کہ یہ دنیا تو عارضی ہے ختم ہو جائے گی ایسے کام کیوں کریں کہ آخرت بھی خراب ہو جائے۔“ اس نے مصیبت سے کہا۔

”سب فضول باتیں ہیں، بڑی بڑی کانفرنسوں میں بیٹھے فارغ، خوش لباس اور آسودہ لوگوں کی باتیں اور دل میں منافقت لئے بڑے بڑے سینٹھوں کی ہوائی باتیں یا پھر مل کلاس لوگوں کی خالی خولی اخلاقیات جس سے پیٹ نہیں بھرتا۔“ بھیلہ سوچنے لگی اور غمی اس کے چہرے سے نمایاں ہونے لگی۔

”کیا ہوا باجی! اب جاؤں میں؟“

”نہیں رکو۔ اور کیا کہتا ہے تمہارا ابا؟“

”ابا کہتا ہے اس زندگی کی تکلیفوں کو چن لو یا اس زندگی کی نیکن عارضی نہ چنو مستقبل کو چنو۔ بس یہ دنیا عارضی ہے اور وہ دنیا ہمیشہ رہنے والی۔ اچھا باجی! چلتا ہوں، سلام!“

بھیلہ کے بے جان جسم میں جیسے کچھ نہ بچا ہو کبھی کبھی ایک لفظ، ایک جملہ وہ کام کر جاتا ہے جو دوسروں کی بڑی بڑی باتیں نہ کر پائیں۔

عارضی کو نہ چنو مستقبل کو چنو۔ اب اسے پتہ چلا کہ آج میں کیا خاص بات تھی۔ آج اس کے خالق کو اسے زندگی کا فلسفہ سمجھانا تھا۔ اسے راہ راست پہ لانا تھا۔ وہ مالک کتنا مہربان ہے اور میں کتنی خوش نصیب۔ یا اللہ، یا اللہ اس کے آنسوؤں نے بہہ جانے رستہ دکھایا۔

ﷻ

آنکھرا جیسے کوئی آن ہوئی ہوئے کو ہے۔ جیسے معمول سے ہٹ کر کوئی عمل ہونے کو ہے۔

ایسا ہوتا تو نہیں پھر آج؟ اس نے سوچا آج میں کیا خاص بات ہے جو ہر عمل کو متاثر کر رہا ہے۔ رزق کی تلاش میں دیر؟ گھٹیا لوگوں کی کم تر اولاد مانگنے سے گریزاں؟ ذہن فارغ ہو تو بے وقعت چیزیں اور چہرے بھی اہم ہونے لگتے ہیں جیسے یہ بچہ اور اس کا کام۔ بچے کی مستلشی آنکھیں اب سکون میں تھیں جیسے جو تلاش کرنا تھا مل گیا ہو۔

وہ بھیلہ بانو کے پاس سے ہو کر گزرنے لگا جب اس نے اسے آواز دے کر روکا۔ اس نے حیران نظروں نے اس عورت کو دیکھا۔ ”آؤ بیٹھو۔“ بھیلہ نے کہا۔

”نہیں ماں انتظار کر رہی ہوگی، مجھے جانا ہے۔“ بچے نے ذمہ داری سے جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں تھوڑی دیر بس۔“ بھیلہ نے ہلکی سی التجا کی ہو۔

کیوں؟ وہ خود نہ جان سکی۔

”جی باجی!“

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”راجا سکندر۔“ اس نے جواب دیا۔

”راجا سکندر!..... ہا ہا ہا ہا راجا اور سکندر بھی۔“

”کیوں باجی! کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں، پڑھتے ہو کیا؟“

”جی باجی!“

”کون سی جماعت میں؟“

”تیسری میں ہوں جی۔“ وہ فخر سے بولا۔

”اچھا تو یہ کام کیوں کرتے ہو پھر؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ابا مزدور ہے جی، دیہاڑی میں پوری نہیں پڑتی۔ اماں بیمار رہتی ہے، گھر کا خرچہ مشکل سے چلتا ہے اسی لئے۔“

رنگا ڈاکو

زور آدروں کے ظلم اور انصاف نہ ملنے پر ایک شریف اور
سیدھے سادے نوجوان کو اورنگ پھیلنے پر مجبور کر دیا۔

محمد رضوان قیوم



شمارہ جولائی 2014ء میں ایک کہانی "نسۃ" میں رنگا ڈاکو کا سرسری سا ذکر آیا تھا۔ میں نے قارئین سے وعدہ کیا تھا کہ رنگا ڈاکو کی کہانی پھر بھی تفصیل سے سناؤں گا۔ حسب وعدہ یہ کہانی پیش خدمت ہے۔ (مصنف)

بٹی نورالحسن کو تلاش کر کے لاؤ۔ اورنگزیب بھی ماں سے لپٹ کر رونے لگا جبکہ ولایت الدین انہیں تسلیاں دینے لگا۔

"ماں! ہم نے نورالحسن کو بہت تلاش کیا لیکن اس کا کچھ پتہ نہیں چلا رہا ہے۔" اورنگزیب نے اُسے بتایا۔ کچھ دیر بعد زمیندار راجا کھیرن اپنے چند کارندوں کے ساتھ آ گیا۔ اسے دیکھ کر ولایت الدین اس کے قریب روتا ہوا گیا اور اس کے پاؤں پر گر کر گڑگڑا کر بولا۔

"راجا صاحب! میری بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے، میں نے اور اورنگزیب نے اسے بہت تلاش کیا لیکن وہ ہمیں نہیں ملی، میری اس معاملہ میں مدد کرو۔"

راجا کھیرن نے اسے قدموں سے اٹھایا اور اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "ولایت الدین! میں نے اپنی حویلی میں تیری بیٹی کی گمشدگی کی اطلاع سن لی تھی۔ تو پریشان نہ ہو میں ابھی تیرا یہ مسئلہ حل کرتا ہوں۔" اس نے ولایت کے مکان میں موجود لوگوں کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ "تم ایک لمحے کے لئے میرے پاس آؤ۔" سب اس کے پاس آ گئے۔

"تم لوگ یہاں فضول کھڑے کیا کر رہے ہو؟" راجا کھیرن نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "مورکھو! تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ تمہارا پڑوسی ولایت الدین اس وقت کتنے کڑے کرب سے گزر رہا ہے، اس کی بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے۔ ہم سب کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ ہم ولایت الدین کی اس مصیبت میں اس کا بھرپور ساتھ دیں۔ تم میں سے

اورنگزیب کا باپ ولایت الدین کھاریاں کے قریب ایک گاؤں کے ایک ہندو زمیندار راجا کھیرن کے کھیتوں میں بحیثیت حزارے کا کام کیا کرتا تھا۔ 1932ء میں اورنگزیب کی عمر 19 سال اور اس کی بہن نورالحسن کی عمر 17 سال تھی۔ ولایت الدین کی بیوی تب دق کے عارضہ کے باعث کافی عرصہ سے کاٹھ سے لگی معذوری کی زندگی گزار رہی تھی۔ ولایت الدین نے اپنے مکان کے سامنے کچھ بھیڑ بکریاں پالی ہوئی تھیں جنہیں کبھی اورنگزیب اور کبھی نورالحسن چرا یا کرتے تھے۔ بکریوں کا دودھ راجا کھیرن کی حویلی میں فروخت کیا جاتا تھا۔ اس سے ولایت الدین کو اضافی آمدنی ہو جایا کرتی تھی جبکہ گوشت کے قابل فریب بھیڑ بکریوں کو ولایت الدین مقامی قصابیوں کو گوشت کی غرض سے فروخت کر دیا کرتا تھا۔ ولایت الدین جس جگہ رہتا تھا وہاں ارد گرد ہندو، سکھ کی اکثریتی آبادی تھی۔ ہندو، سکھ فطری طور پر مسلمانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اسی لئے ولایت الدین بھی اُن سے ٹھٹھنے مٹنے کی کوشش نہ کرتا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت عبادت میں گزارہ کرتا تھا۔

ایک صبح نورالحسن اپنی بھیڑ بکریوں کو چرانے علاقہ کی قریبی وادی میں گئی تو شام کو اس کی بکریاں تو واپس آ گئیں لیکن وہ نہ آئی۔ ولایت الدین اور اورنگزیب تشویش اور پریشانی کے عالم میں اُسے ارد گرد کے علاقہ میں ڈھونڈنے نکل گئے۔ انہوں نے پہاڑوں، چراگاہوں میں چلا چلا کر پکارا۔ "نورالحسن..... نورالحسن!" لیکن ان کی تلاش بسیار کے بعد انہیں نورالحسن نہ ملی۔ وہ تھک ہار کر مایوسی کے عالم میں اپنے گھر آ گئے جہاں نورالحسن کے لاپتہ ہونے کی خبر سن کر لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ولایت الدین کی بیوی کاٹھ پر پڑی ہلک ہلک کر لوگوں سے فریاد کر رہی تھی کہ خدا کے واسطے میری

چتا نہ کرو کہ میں تمہیں انصاف نہ دلاؤں گا۔ میں تمہاری بہن کے قاتل اور اس کی عزت خراب کرنے والے کو عبرت کے نشان میں تبدیل کر دوں گا لیکن مجھے اب اس معاملہ میں باقاعدہ قانونی کارروائی کرنی ہے۔ میری آپ دونوں سے استدعا ہے کہ تم دونوں میرے ساتھ بھرپور تعاون کرنا اور جیسا میں کہوں ویسا ہی کرنا۔

”سرکار! ہم رہے غریب مزارعے۔“ اور نگزیب نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ”ہماری کون سنتا ہے؟“

”ارے میں نے تجھے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ تُو اس بات کی فکر نہ کر کہ تمہیں انصاف نہیں ملے گا۔“ تھانیدار نے کہا۔ ”ارے میں جو آ گیا ہوں تمہاری دادرسی کے لئے۔“

زمیندار راجا کھیرن جو قریب ہی کھڑا تھا، وہ دونوں باپ بیٹے کے قریب آیا اور اُس نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نوراعین کی عزت لوٹنے اور اُسے قتل کرنے والے خونِ ہاتھوں کی کھوج لگا کر رہوں گا۔ تم لوگ صبر سے کام لو۔ تھانیدار نہل دھرم کو اپنی قانونی کارروائی کرنے دو۔“

”سرکار! کیسی قانونی کارروائی کریں گے؟“ ولایت نے پوچھا۔

”جو بہتر ہوگا ہم وہ کریں گے۔“ تھانیدار نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یاد رکھو! اس بات کی احتیاط رہے کہ تم نے مقتولہ کی میت کو کسی حال میں چھیڑنا نہیں ہے۔ ہم نے اس کی میت کو پونمارٹم اور کچھ ضروری میڈیکل رپورٹوں کے لئے جہلم شہر کے سرکاری ہسپتال لے کر جانا ہے۔“

”نہیں، خدا کے واسطے میری مظلوم بیٹی کی میت کی بے حرمتی نہ کرنا۔“ ولایت الدین کی بیوی نے چار پائی پر پڑے بے بسی سے روتے ہوئے کہا۔

”بابا جی! مقتولہ کے ساتھ ظلم کرنے والے کو

نوجوانوں کی نہیں دور دراز کے علاقہ جات میں بھی کی تلاش میں نکلیں اور اچیز عمر افراد ارد گرد کے اُن علاقوں میں جائیں جہاں نوراعین اپنی بھیڑ بکریوں کو چرانے جایا کرتی تھی..... ولایت الدین میرا پرانا وفادار حذرارع ہے اس نے میری بڑی خدمت کی ہے۔“

راجا کھیرن نے ولایت الدین اور اورنگ زیب کو کہا کہ تم دونوں آرام سے اپنی جھونپڑی میں بیٹھو۔ یہ گاؤں کے لوگ تیری بیٹی کو ڈھونڈ لائیں گے۔ گاؤں کے ہر عمر کے لوگ ساری رات قریب قریب پھر کر گمشدہ نوراعین کو تلاش کرتے رہے۔ بالآخر رات کے دوسرے چہر نوراعین مردہ حالت میں گاؤں کی حدود سے باہر ایک سوکھے کنواں میں مل گئی۔ نوراعین کی لاش کو گاؤں کے چند نوجوان اٹھا کر لائے تو ولایت الدین بیٹی کی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گیا جبکہ نوراعین کی ماں نے دیوانوں کی طرح اپنے بال نوچنا شروع کر دیے۔ اور نگزیب رو رو کر اتنا بلکان اور بے حال ہوا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

نوراعین کا منہ بری طرح سو جا ہوا اور پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں جبکہ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ کسی نے اس کے ساتھ پہلے زیادتی کی اور پھر اُسے قتل کر دیا۔

”ہائے..... کس نے میری بیٹی کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے؟“ اسی کی ماں آسمان کی طرف منہ کر کے بین کرنے لگی۔ ”اے خدا! میری بیٹی کے ساتھ جس نے اتنا ظلم کیا ہے تو اسے اسی طرح ذلیل و رسوا کرنا جس طرح ہم ہوئے ہیں۔“

وہ بیچاری اس کے سوا اور کبھی کیا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد متعلقہ تھانے سے پولیس بھی پہنچ گئی۔ نہل دھرم تھانیدار نے سب سے پہلے ولایت الدین اور اورنگ زیب دونوں کو اپنے پاس بلا کر پہلے اُن سے نوراعین کے بہانہ قتل پر اظہارِ افسوس کیا اور پھر انہیں کہا کہ تم اس بات کی

صاحب سنبھال لیں گے۔" راجا کھیرن نے اورنگزیب کی بات سن کر کہا۔

"بس، تھانیدار صاحب امیری بہن کا قاتل کسی صورت نہیں بچتا چاہئے۔" اورنگزیب نے کہا۔

تھانیدار دھرم نھل اورنگزیب کے قریب گیا اور اُسے اپنے دل سے لگا کر چمکارتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! دیکھ میں حیری بہن کے ساتھ ظلم کرنے والے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہوں۔ میں اُسے پاتل سے بھی ڈھونڈ لاؤں گا۔"

"نھل دھرم! تو کچھ ایسا کر کہ قانونی تقاضے بھی پورے ہو جائیں اور مقتولہ کا پوسٹ مارٹم بھی نہ ہو۔" راجا کھیرن نے تھانیدار سے کہا۔

تھانیدار دھرم نھل نے کافی دیر تک مردہ نورالعین کے جسم کا مختلف زاویوں سے جائزہ لینے کے علاوہ اس کی کئی تصاویر بنوائیں اور کئی مقامی دیہاتیوں کے بیانات لئے۔ اس کے بعد اس نے ولایت الدین اور اورنگزیب کو میت دفنانے کی اجازت کے ساتھ یہ کہا کہ تم دونوں مجھ سے رابطہ میں رہنا۔ ادھر زمیندار راجا کھیرن نے بھی دونوں باپ بیٹے کو یہ یقین دلایا کہ وہ تھانیدار سے اس کیس کی کچھ بہ لحد رپورٹ لیتا رہے گا۔

نورالعین کو آہ و سسکیوں کے ساتھ دفنایا گیا۔ اس کی اپاہج ماں، باپ ولایت الدین اور بھائی اورنگزیب آخر تک دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ وہ بیچارے اس کے سوا کبھی کیا سکتے تھے۔

مقتولہ کی تدفین اور کفن، دفن، پڑسہ کے لئے آنے والے مہمانوں کے تمام اخراجات راجا کھیرن نے ادا کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ تھانیدار دھرم نھل، اورنگزیب اور ولایت الدین کے ساتھ مختلف جگہوں میں جا کر انویسٹی گیشن کرتا رہا۔

"تو اب بوڑھا ہو گیا ہے۔" تین روز بعد راجا

پکڑنے اور قانونی عمل سے گزرنے کے لئے یہ سب کچھ تو کرنا پڑے گا۔" تھانیدار نے کہا۔

یہ باتیں سن کر ہجوم میں سے ایک ہندو بڑھیا آگے بڑھی اور اس نے تھانیدار پر چلاتے ہوئے کہا۔ "ایک تو نورالعین کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور اب تم یہ چاہتے ہو کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی لاش کی چیراچھاڑی کروا کے تزییل کر دائی جائے؟"

"ماس! تو درمیان میں ہمیں اپنا مشورہ نہ دے۔" تھانیدار نے کہا۔ "مقتولہ کے خاندان سے پوچھنے دے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ یہ جیسا چاہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

"ادھر آؤ ولایت الدین! راجا کھیرن نے کہا۔ "تو نے مقتولہ کا پوسٹ مارٹم کروانا ہے یا نہیں؟ تو جیسا چاہے گا میں تھانیدار صاحب سے کہہ کر ویسا ہی کروا دیتا ہوں۔ یہ بہت اچھا تعاون کرنے والا انسان ہے، یہ وہی کرے گا جو میں اسے کہوں گا۔۔۔۔۔ ولایت الدین تو کیا کہتا ہے؟"

"سرکار! مجھے تو سچی بات ہے کچھ بھائی نہیں دے رہا ہے۔" ولایت نے غمزدہ آواز میں کہا۔ "کسی ظالم نے میری بیٹی کی نہ صرف بے حرمتی کی بلکہ اُسے جان سے بھی مار دیا ہے۔ راجا صاحب! اب آپ ہی بتلائیں میرا اب کیا رہ گیا ہے۔ مجھے بس میری بیٹی کی جان اور عزت کو پامال کرنے والا مجرم چاہئے۔"

"نہیں بابا! میں اب یہ گوارہ نہیں کروں گا۔" اورنگزیب نے ٹوپ کر کہا۔ "میری بہن کی میت کو شہر کے ہسپتال میں چیر پھاڑ اور دیگر ڈاکٹری رپورٹوں کے لئے کھینٹا جائے۔"

"ولایت الدین! تیرے ساتھ جو ظلم ہو گیا سو ہو گیا لیکن اب تو اپنی مری بیٹی کو قسمل دے کر عزت سے قبر کے حوالہ کر۔ رہا سوال قانونی چارہ جوئی کا تو وہ تھانیدار

الدین کو ماہانہ دوسو روپے بھیجتا رہا۔

اس کہانی میں ایک نیا سوڑ اس طرح آیا کہ ایک دن اورنگزیب اپنی بکریوں کو چراتے ہوئے ایک ایسی جگہ جا لگا جہاں ٹھہرے پانی کا بہت گہرا جوہڑ تھا، وہ وہاں اپنی بکریوں کو پانی پلانے کی غرض سے جا رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں لٹک لٹک شکاف آوازیں گھرائیں۔ ”بچاؤ، بچاؤ، بھگوان کے واسطے کوئی ہے جو میری زندگی بچالے میں ڈوب رہا ہوں۔“ اورنگزیب بجلی کی رفتار سے اُس گس (جوہڑ) کی طرف بھاگتا ہوا پہنچا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ ایک آشنا شخص جوہڑ میں تقریباً ڈوبنے کے قریب ہے اور وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اورنگزیب نے آؤ دیکھانہ تاؤ قریب پڑی ایک لمبی سی شاخ اٹھا کر اس کی جانب بڑھائی تاکہ وہ اُسے پکڑ کر باہر آ جائے۔ ڈوبنے والے نے اس شاخ کو پکڑنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اسے پکڑنے میں ناکام رہا تو اورنگزیب نے اُسے کہا کہ ٹوٹ کر نہ کر میں خود جوہڑ میں اتر کر تجھے بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔

”نہیں نہیں میرا بچنا مشکل ہے۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”تم اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈالو۔“

اورنگزیب نے کہا کہ بے شک تمہیں بچانے میں میری زندگی ہی کیوں نہ چلی جائے میں کوشش ضرور کروں گا۔

اورنگزیب نے اپنی جان پر کھیل کر ڈوبتے ہوئے اُس شخص کو بچا کر اُسے ایک خشک جگہ پر لٹایا۔

”اورنگزیب! تم نے میری زندگی بچا کر مجھے عمر بھر کے لئے خرید لیا ہے۔“ اُس آدمی نے اُس کے پاؤں پکڑ کر کہا۔

”میں تمہیں نہیں جانتا لیکن تم نے مجھے کیسے پہچانا تم

کون ہو؟“ اورنگزیب نے پوچھا۔

”میرا نام دھوٹی ہے۔“ اس شخص نے کہا۔ ”اور

کھیرن نے ولایت الدین کو کہا۔“ تو اب گھر پر آرام کر اور میں تجھے دوسو روپے ماہانہ وظیفہ دیا کروں گا اور ان پیسوں کے علاوہ اپنی بھیڑ بکریوں اور دودھ کا کام جاری رکھ۔“

ولایت الدین کو راجا کھیرن کی بات مناسب لگی اور اُس نے مفت کے دو سو روپے ماہوار لینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اب اورنگزیب اپنے باڑے میں پالی ہوئی بھیڑ بکریوں کو چراتا۔ ان سے حاصل دودھ کو راجا کھیرن کی حویلی اور ارد گرد کے صاحب حیثیت لوگوں کو فروخت کرتا جبکہ ولایت الدین گوشت کی غرض سے دودھ سے سوکھی بکریوں کو قصا بوں کو فروخت کرنے کے معاملات وغیرہ سنبھالا کرتا تھا۔

اسی دوران تھانیدار نبل دھرم نے نورالحین کے قتل اور زیادتی کے شبے میں گاؤں کے کئی مشکوک لوگوں کو پکڑ لیا لیکن اس نے ان سب کو بغیر کسی پیش رفت کے چھوڑ دیا۔ وہ ولایت الدین، اورنگزیب کو آئے روز تھانے بلا کر طفل تسلیاں دیتا رہا۔

دوسری طرف راجا کھیرن کچھ روز تک دونوں باپ بیٹے کے ساتھ تھانے پکھریوں میں جاتا رہا لیکن پھر اُس نے بھی اُن کے ساتھ اپنے تعاون میں شست روی دکھانا شروع کر دی۔ بالآخر ایک دن ولایت الدین خود ہی تھک بار کر دھرم نبل تھانیدار کے دفتر میں چلا کر کہا۔

”میں نورالحین کے قتل اور بے حرمتی کا معاملہ اپنے خدا پر چھوڑتا ہوں۔“

تھانیدار نے اس کی جانب سے یہ بیان سن کر یہ کیا کہ نورالحین کے قتل اور اس کیس اتھ زیادتی کا کیس کسی نامعلوم شخص پر ڈال کر کیس فائل کر دیا۔ اسی دوران نورالحین کی ماں جو پہلے ہی تپ دق کے مرض کا شکار تھی وہ اپنی بیٹی نورالحین کی عزت لٹنے اور قتل کا صدمہ برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ زمیندار راجا کھیرن حسب وعدہ ولایت

ابھی ان دونوں کے مابین یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک دھومنی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور ساتھ ہی اسی حالت میں اورنگزیب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”دھومنی بھائی! تجھے کیا ہوا ہے تو اس طرح بلک بلک کر کیوں رو رہا ہے؟“ اورنگزیب نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ابھی تم نے کچھ لمحے پہلے مجھے کہا تھا کہ تمہارا خدا تمہارے مرنے کے بعد تم سے پوچھتا کہ تم نے کسی اوجھے شخص کو ڈوبنے سے کیوں نہ بچایا۔ تم نے مجھے مرنے سے بچا کر اپنے ضمیر کے زندہ اور خدا کے سامنے سرخرو ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ تم نے تو اپنے ضمیر کو مرنے نہیں دیا لیکن میں نے بھی تو اپنی مرگ کے بعد اپنے بھگوان کی عدالت میں پیش ہو کر اپنے کالے کرتوتوں کا جواب دہ ہونا ہے۔“

”تم اور کالے کرتوت؟“ اورنگزیب نے ایک بار پھر تجسس ہو کر پوچھا۔

”ہاں، لڑکیوں عورتوں کی عزتوں سے کھیلواڑ کرنے والے ظالم بے رحم زمیندار راجا کھیرن کی عیاشی کے لوازمات کا انتقام کرتا ہوں۔“ دھومنی نے کہا۔ ”اب تو میں سوچ رہا ہوں کہ کاش تم مجھے بھگوان کی صورت میں آ کر اس جوہڑ میں ڈوبنے سے نہ بچاتے، میں مرجاتا تو بہتر ہوتا۔“

”دھومنی تم اس قسم کی ابھی باتیں کر کے مجھے ہسٹیلیوں میں نہ ڈالو۔“ اورنگزیب نے کہا۔ ”تم مجھے اب وہ بتلاؤ جو تم کو پریشان کر رہا ہے۔“

”اورنگزیب بھائی! تم میرے محسن اور شریف انسان ہو۔“ دھومنی نے کہا۔ ”تم نے تو میرا ضمیر جگا دیا ہے۔“

”یہ تم اپنے ضمیر کے جاگنے کی کیا بات کر رہے ہو۔“ اورنگزیب نے تجسس سے اس سے پوچھا۔ ”کیا

میں زمیندار راجا کھیرن کے پورے کا خاص بندہ ہوں۔“

(پنورہ یا پنورے دراصل پنے سے نکلا ہے۔ پناسے مراد علاقہ کے بڑے بد معاش یا زمیندار کی رہائش گاہ سے ہٹ کر وہ بڑی بیٹھک ہوتی تھی جہاں اس کے پار دوست ڈیرہ لگاتے تھے۔ اسے رہائش گاہ بھی کہہ سکتے ہیں)۔ ”تم تو میرے لئے بھگوان بن کر آ گئے جس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے نیا جیون دیا ہے۔“ دھومنی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”اگر میں تمہیں نہ بچاتا تو میرا ضمیر مجھے ساری عمر حن طعن کرتا۔“ اورنگزیب نے اسے اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ ”اور اس بات کے لئے مجھے خدا کے آگے جوابدہ ہونا پڑتا۔ ویسے بھی میں زندہ کہاں ہوں میری پیاری بہن نورالطین کا جس دن قتل ہوا ہے میں تو اسی دن مر گیا تھا۔ میں تو صرف ایک زندہ لاش ہوں۔ تم بار بار اپنی جان بچانے کا مجھ سے شکریہ ادا نہ کرو۔ ہاں، یہ تو میں بھول گیا کہ تم سے پوچھوں کہ میں تو اس جگہ اپنی بھیل بکریاں چرانے آیا تھا تم یہاں کیسے آئے اور ڈوبنے لگے؟“

”میں دراصل یہاں اپنے مالک راجا کھیرن کے لئے جنگلی خرگوش کے شکار کے لئے آیا تھا۔“ دھومنی نے کہا۔ ”میں نے ایک بڑے خرگوش کو سونبا (ایک قسم کا چھوٹا ہتھیار جس سے چھوٹے جانور شکار کئے جاتے تھے) ماری تھی جس سے وہ ہلکا سا زخمی ہو کر بھاگ رہا تھا۔ اسے پکڑنے کی کوشش میں اس جوہڑ میں گر کر پانی کے اندر موجود چکنی کیچڑ میں دھنسنے لگا تھا۔ راجا کھیرن کو جو شکاری جنگلی خورگوش پکڑ کر لا کر دیتا ہے تو وہ خوش ہو کر انعام میں کچھ روپے دے دیتے ہیں۔ سچی بات ہے میں اسی لالچ میں یہاں آیا تھا۔ آج راجا کھیرن کے چند خصوصی دوست آ رہے ہیں انہوں نے مجھے کہا تھا کہ تم چند جنگلی خرگوشوں کا شکار کرنے کی کوشش کرو، وہ اسے اپنے ”توں کو دیسی شراب کے ساتھ پیش کریں گے۔“

پہلے تمہارا ضمیر سویا ہوا تھا؟ میں تو اس بات سے الجھ گیا ہوں۔"

"میں تمہارے سامنے ایک بھیانک انکشاف کرنے والا ہوں۔" دھومنی نے کہا۔ "پہلے تو تم مجھ سے وعدہ کرو کہ اُسے سن کر فوری طور پر اشتعال میں نہ آؤ گے اور نہ ہی فوری طور پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرو گے۔"

اور نگزیب نے اس سے وعدہ کیا کہ جیسا وہ چاہے گا وہ ویسا ہی کرے گا۔

دھومنی نے اس کے سامنے یہ بھیانک انکشاف کیا کہ تیری بہن نورالعمین کی بے حرمتی اور اسے قتل کرنے والا مرکزی کردار راجا کھیرن ہی ہے۔ اور نگزیب نے اس وقت دھومنی کے منہ سے یہ انکشاف بڑے قتل سے سنا۔ دھومنی نے اس واردات کی تفصیل یوں سنائی۔

ایک دن راجا کھیرن کے تین بد معاش دوست اُسے ملنے اس کے ڈیرے میں آئے۔ بلراج، سانو اور مکیش۔ دراصل راجا کھیرن نے اپنے دوستوں کے لئے یہ دعوت شراب اور زنا کے لئے سہائی تھی۔ اس وقت پنورے میں راجا کھیرن اور پنورے کا کرتا دھرتا ماجو سنگھ بھی تھا۔ یعنی یہ نوٹل 5 افراد تھے۔ یہ پانچوں ایک مخصوص جگہ بیٹھ کر شراب کے ساتھ کاجو اور جنگلی خرگوش کے مزے اڑا رہے تھے۔

"یار اگر کسی حسینہ کا بندوبست ہو جائے تو ہمارا مزہ دو آتھ ہو جائے۔" مکیش نے راجا کھیرن کو کہا۔

"ہاں یار کھیرن! تیری یہ دعوت بغیر جسمانی راحت کے ادھوری ہے۔" بلراج نے درمیان میں یہ لقمہ دیا تھا۔

"تمہاری راحت کا سامان اس لئے مشکل ہے۔" راجا کھیرن نے کہا۔ "کیونکہ آج کل میری رکھیل سونیا بٹارس گئی ہوئی ہے ورنہ میں اس کو بلا لیتا۔"

"ارے کھیرن! اس قسم کی باتیں کر کے ہمارے نشہ کا مزہ کرنا نہ کر۔"

یہ پانچوں دوست آپس میں بیٹھے قہقہے منگولہ کرنے لگے۔ اسی دوران ماجو سنگھ کسی کام سے باہر گیا اور وہ تھوڑی دیر بعد اپنے ساتھ تیری معصوم بہن نورالعمین کو چراگاہ سے درغلا کر لے آیا اور اُسے کہا کہ تیرا باپ راجا کھیرن کے پنورے میں ہے اور وہ تجھے بلارہا ہے۔ وہ بیچاری اُس کے بہکاوے میں آ گئی اُس نے جب پنورے میں اپنے باپ کو نہ پایا اور وہاں راجا کھیرن اور اس کے چار دوستوں کی شیطانی نظروں کو دیکھا تو اُس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اُس کے بھاگنے کی تمام کوشش اس وقت رائیگاں گئی جب راجا کھیرن سمیت پانچوں کتوں نے اُس معصوم بچی کو آرام سے دیوچ کر باری باری اپنی ہوس کا شکار بنا دیا۔ اگر اچھا لڑا پنورے میں پڑے بکریوں کو ہٹانے والے ڈنڈے سے مزاحمت کی کوشش کی تھی لیکن بھیڑیوں کے آگے وہ معصوم بے بس ہو گئی اور اپنی عزت گنوا بیٹھی۔ اس کے بعد راجا کھیرن نے مضبوطی سے اس کا گلا گھونٹا جب تک وہ مرنے لگی۔ اس کے دوست تو خوش ہو کر چلے گئے لیکن اب راجا کھیرن کے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ مقتولہ نورالعمین کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ اس نے ماجو سنگھ کو کہا کہ لڑکی کی لاش کو کسی دیران کنویں یا مناسب جگہ پھینک آؤ۔ لہذا اس کے حکم پر تیری بہن کی لاش کو راجا کے غنڈوں نے مناسب جگہ پھینک دیا۔"

اور نگزیب نے بڑے قتل سے دھومنی کی بات سنی اور پھر اس سے پوچھا کہ کیا تم بھی اُن لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے میری بہن کی لاش کو سوکھے کنویں میں پھینکا تھا۔

"نہیں، اور نگزیب بھائی! دھومنی نے کہا۔" میں اس وقت پنورے کی رسوائی میں راجا کھیرن کے دوستوں کے لئے شراب اور میوہ جات کا بندوبست کر رہا تھا۔ بھگوان جانتا ہے جس وقت تمہاری بہن کو راجا کھیرن اور

صرف میرا دو سو روپے کا وظیفہ باندھ دیا ہے بلکہ اپنی مارکیٹ میں اُس نے مجھے دکان بھی دی ہے اور اُس سے بڑھ کر اُس نے نورالعیین کو تلاش کرنے اور پھر اس کے قتل ہونے کے بعد تھانہ کچھریوں میں ہماری کتنی مدد کی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ راجا کھیرن کے کسی دشمن نے مجھے اس کے خلاف من گھڑت کہانی سنا کر بھڑکا دیا ہے۔ نہیں بیٹا لگتا ہے تجھے غلط فہمی ہو گئی ہے۔ تو مجھے اُس کا نام تو بتلا جس نے تجھے یہ بات بتلائی ہے۔ باپ کے بہت اصرار کے باوجود اورنگزیب نے دھومنی کا نام نہ بتلایا۔

دوسرے روز اورنگزیب تھانیدار دھرم نہل کے پاس تھانے پہنچا اور اسے کہا کہ وہ نورالعیین کی عزت لٹنے اور قتل کے سلسلہ میں راجا کھیرن کے خلاف پرچہ کاٹے۔ تھانیدار دھرم نہل نے اُسے جھڑکی دیتے ہوئے کہا کہ تیرے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے کہ راجا کھیرن ہی اس میں ملوث ہے۔ اورنگزیب نے اسے کہا کہ یہ بات مجھے اُس کے ڈیرے کے ایک خاص آدمی نے بتلائی ہے۔ ”تو مجھے اُس گواہ کا نام بتلائے گا تو میں اس کی بنیاد پر راجا کھیرن کے خلاف پرچہ کاٹوں گا۔“ تھانیدار نے کہا۔

اورنگزیب جانتا تھا کہ اگر اس نے دھومنی کا نام بتا دیا تو راجا کھیرن اسے بھی مراد دے گا۔ اس لئے اس نے تھانیدار سے کہا کہ وہ پرچہ کاٹ لے۔ وہ وقت آنے پر گواہ پیش کر دے گا۔

تھانیدار نے اُسے لتاڑ کر تھانے سے بھاگ دیا۔ تھانے سے ذلیل و خوار ہونے کے بعد اورنگزیب اپنے گھر نہ آیا۔ اس کا باپ ساری رات دروازہ پر اس کی راہ نکلتا رہا۔ اسی طرح پندرہ دن ہو گئے اورنگزیب کا کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گیا۔

ادھر زمیندار کھیرن نے اس کے باپ ولایت الدین کو یہ کہہ کر ذلیل و خوار کرنا شروع کر دیا کہ میں نے

اس کے دوست اپنی ہوس کا نشانہ بنا رہے تھے تو وہ منظر مجھ سے اور میرے ساتھی پران سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔“

”یہ پران کون ہے؟“

”اورنگزیب بھائی! دراصل پران اور میں راجا کھیرن کے ڈیرے کی رسوئی میں اس کے جل پان کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔“

اس کے بعد اورنگزیب نے دھومنی سے مکیش، بلراج، سانو کے بارے میں تفصیل سے اُن کی رہائش گاہوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

آخر میں دھومنی نے اسے نصیحت کی کہ اُسے قانون سے کوئی انصاف نہیں ملے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راجا کھیرن کے ہاتھ بہت لمبے اور اثر رسوخ والے ہیں۔ وہ اپنی دولت کی بدولت قانونی مشینری کو اپنے مقصد کے لئے کرتا ہے۔ دھومنی نے اس کے سامنے یہ بھی انکشاف کیا کہ زمیندار راجا کھیرن نے تھانیدار دھرم نہل کے منہ میں بھی بڑے لوٹوں کی گڈیاں ٹھونس کر اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ تھانیدار دھرم نہل نے جان بوجھ کے قتل اور عزت لٹنے میں کسی کو ملزم نامزد نہیں کیا بلکہ اُس نے نامعلوم لمزمان کے خلاف کچا پرچہ کاٹا ہے۔

”دھومنی! تم اس سلسلے میں کس طرح میری مدد کر سکتے ہو؟“ اورنگزیب نے پوچھا۔

دھومنی نے اُسے کہا کہ وہ ڈیرے کی ہر خبر اُسے کسی طے شدہ جگہ پر دیا کرے گا۔ دونوں واپس اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

گھر پہنچ کر اورنگزیب نے سب سے پہلے دھومنی کی طرف سے کیا گیا انکشاف جب اپنے باپ ولایت الدین کو بتلایا تو اس نے پہلے راجا کھیرن کے اس میں ملوث ہونے کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اُسے کہا کہ راجا کھیرن ایک اچھا اور ہمارا ہمدرد انسان ہے۔ اس نے نہ

دو چیزیں

☆ دو گھنٹہ اللہ کو بہت پسند ہیں ایک غصے کا دوسرا صبر کا۔
☆ دو قطرے اللہ کو بہت پسند ہیں ایک جہاد میں خون
کا قطرہ اور تنہائی میں خوفِ خدا سے نکلا آنسو۔

☆ دو قدم اللہ کو بہت پسند ہیں۔ فرض نماز کے لئے اٹھا
اور بیمار کی عیادت کے لئے اٹھا قدم۔ (نیم سیکڑہ صدف)
☆ محبت کرنے والے کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی اور
ضرورت مند کو کسی چیز سے محبت نہیں ہوتی۔ (حکیم محمود)

☆ دو چیزیں کسی کی شخصیت کی وضاحت کرتی ہیں:
(1) صبر۔ جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔
(2) آپ کا رویہ۔ جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔
(نبیلہ نازش)

منہ سے صرف یہ سنتا ہے کہ وہ میری بہن کا مجرم ہے کہ
نہیں۔

راجا کھیرن کی کمر میں ایک نقاب پوش نے بڑی
زور سے گونسا مارا جس سے وہ لڑکھڑا گیا۔ "بول جو سوال
رنگا پوچھ رہا ہے ہاں یا ناں؟ نہیں بولتا تو میں تیری زندگی
کی ڈور کاٹ دوں۔"

"ہاں، ہاں یہ سچ ہے۔" کھیرن نے لڑتی
آواز میں کہا۔ "میں نے اور میرے دوستوں نے نورالحین
کی نہ صرف عزت لوٹی تھی بلکہ اُس کے بعد میں نے اپنے
گناہ کا ثبوت چھپانے کے لئے اس کا گلا دبا کر مار دیا
تھا۔"

اس اقرارِ جرم کے بعد وہ اورنگزیب سے اپنی
زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ دوسرے کمرے سے راجا
کھیرن کی جوان بیٹی سندری اپنی آنکھیں ملتی ہوئی آئی۔
"کیا ہوا ہاجی!"

"سندری تم امداد جاؤ۔" راجا کھیرن کی بیوی نے
گھبراہٹ ہوئی حالت میں اُسے کہا۔

تیرے خاندان پر لاتعداد احسانات کئے ہیں۔ تیرا بیٹا مجھے
بی نورالحین کے قتل کے جرم میں ملوث کر رہا ہے۔ راجا
کھیرن نے اس کے باپ کو دھمکی دی کہ وہ اس کا ماہانہ
وظیفہ بند کر دے گا بلکہ اُسے اُس کی دکان سے بھی بے
دھل کر دے گا۔

اورنگزیب کے لاپتہ ہونے کے پندرہ روز بعد
رات کے تیسرے پہر راجا کھیرن کے ڈیرے کی پچھلی
دیوار میں سے دیس نقاب پوش کودے۔ انہوں نے سب
سے پہلے وہاں کے دو چوکیداروں کے ہتھیار چھینے اور پھر
اُن کو باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ نقاب پوش راجا کھیرن کی
خوابگاہ میں گھسے۔ اُن نقاب پوشوں نے تیرا راجا کھیرن اور
اس کی چچی کو سوتی حالت میں بندو قوں کے بٹ مار کر
اٹھایا۔ دونوں بڑبڑا کر اٹھے۔ ان نقاب پوشوں میں سے
ایک نے اپنا نقاب اٹھایا تو راجا کھیرن اُسے دیکھ کر دہل
گیا۔

"تم اورنگزیب، کیا چاہتے ہو؟" اس نے بڑبڑائی
آواز میں کہا۔

اورنگزیب نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق کا
بٹ اس کے سر پر مارتے ہوئے کہا۔ "اورنگزیب نہیں،
رنگا اورنگزیب مر چکا ہے۔ میں تجھے جان سے
مارنے آیا ہوں لیکن اگر تو میرے سامنے میری بہن کی
عزت لوٹنے اور اس کے قتل میں ملوث ہونے کا اقرار
کرے تو میں تیری زندگی بخش دوں گا میرے سوال کا
جلدی جواب دے کھیرن! ورنہ میں گولی کا سیسہ تیرے
سینے میں اتار دوں گا۔"

"بھگوان کے واسطے میرے چچی کو نہ مارو۔" اس کی
بیوی اورنگزیب کے قدموں پر گر کر اس کی زندگی کی بھیک
مانگنے لگی۔

"میری تجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے، تو درمیان میں
نہ آ۔" اورنگزیب نے ڈپٹ کر کہا۔ "مجھے راجا کھیرن کے

رنگا ڈاکو کی شکل اختیار کرے۔ تقریباً دو گھنٹہ بعد راجا کھیرن پاؤں میں پٹی بندھا ہوا آپریشن سے فارغ ہو کر وہاں پہنچ گیا۔ وہ حالانکہ شدید تکلیف میں تھا۔

”راجا صاحب! آپ فکر نہ کریں“ تھانیدار دھرم نہل اس کے قریب گیا اور اُسے کہا۔ ”میں بہت جلد اورنگزیب اور آپ کی بیٹی کو آپ کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

”تو نے اب تک کیا کیا ہے؟“ راجا کھیرن نے اس پر غصہ سے چڑھائی کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ الفاظ سنا کر مطلق تسلیاں نہ دے کہ میں اورنگزیب کے قبضے سے سندری کو چھڑا لوں گا۔ مجھے ہر حال میں اورنگزیب اور اپنی بیٹی چاہئے اور یاد رکھ اگر تو اس سلسلہ میں ناکام لوں تو اسی کرب سے گزرے گا جس میں میں گزر رہا ہوں۔“

”راجا صاحب!“ تھانیدار دھرم نہل دلی کر بولا۔ ”میں ابھی اور اسی وقت اورنگزیب کی تلاش اور سندری کی بازیابی کے لئے چھاپہ مار نہیں تکفیل دیتا ہوں۔“

تھانیدار دھرم نہل نے اورنگزیب کی گرفتاری کے لئے فوری طور پر پولیس کی تین ٹیموں کی منظوری ہیڈ آفس سے لی۔ پولیس کی ان تینوں ٹیموں نے اورنگزیب کو گاؤں در گاؤں بد معاشوں کے ٹھکانوں اور جہاں جہاں انہیں اس کی موجودگی کا شک تھا وہاں اسے خوب تلاش کیا لیکن وہ ناکام رہے۔ اسی دوران راجا کھیرن نے بڑے پولیس ہیڈ کوارٹر لاہور میں اورنگزیب کے ہاتھوں اپنی بیٹی کے اغوا کی رپورٹ کر دی۔ اس کی اس رپورٹ پر اورنگزیب کو تلاش کرنے کے لئے مزید پولیس پارٹیاں تشکیل دی گئیں اور اس کی براہ راست نگرانی ایس پی سنگھ نے سنبھال لی لیکن اورنگزیب کا کچھ علم نہ ہو سکا۔ یہ خبر ہندوستان سے نکلنے والے بڑے اخبارات اور ریڈیو کی زینت بن گئی۔

ایک دن راجا کھیرن کے خاص آدمی مکیش کی

اورنگزیب نے سندری کو دیکھا تو اس نے اپنے نقاب پوش ساتھیوں کو کہا۔ ”اسے قابو کرو۔“

”تم جو چاہے مجھے سزا دے دو۔“ کھیرن نے التجا کی۔ ”لیکن میری لاڈلی بیٹی کو ہاتھ نہ لگنا۔“

”میں تجھے ایسی موت دوں گا جس سے تو ایک دم نہیں بلکہ روزمرے گا۔ اسی طرح تڑپے گا جس طرح میرا خاندان میری ماں میرا باپ اور میں تڑپا ہوں۔“ اورنگزیب نے قہر بھری آواز میں کہا۔ ”اٹھا لو اس کی لاڈلی بیٹی کو۔“

”نہیں، نہیں..... اتنا ظلم نہ کرو۔“ کھیرن نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اورنگزیب نے ایک گولی راجا کھیرن کی ٹانگ میں ماری اور اس کی بیوی کو کہا کہ اگر تو نے مزید روٹا دھونا کیا تو میں تیری سندری کو گولی مار دوں گا۔ لہذا تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم اپنی زبانیں بند رکھو۔ نقاب پوش ساتھیوں نے سندری کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور اُسے کندھے پر اٹھا کر بجلی کی رفتار سے راجا کھیرن کے ڈیرے سے بھاگ گئے۔

راجا کھیرن کے ڈیرے میں نقاب پوش اورنگزیب اور ساتھیوں کے حملہ اور سندری کے اغوا کی خبر سن کر پورے گاؤں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگ دانتوں تلے انگلیاں دبا کر حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ تھانیدار دھرم نہل کی قیادت میں پولیس کی بھاری نفری راجا کھیرن کے ڈیرے میں پہنچ گئی۔

ہسپتال میں راجا کھیرن کے پاؤں میں لگی گولی کا آپریشن ہوا تھا۔ وہ ہسپتال میں داخل تھا جبکہ اس کی بیوی چندال میں جمع دیہاتیوں اور پولیس کے سامنے واہلا کر رہی تھی۔ تھانیدار راجا کھیرن کی بیوی کو پہنچا دے رہا تھا کہ میں اس بے حیثیت چوہے کو کبھی شیر نہیں بنے دوں گا۔ اورنگزیب کی اتنی پسلی نہیں ہے کہ وہ کالا نقاب پہن کر

بار سرکاری خزانوں کے کاناؤں (قافلہ) کو لوٹا تھا۔ حکومت وقت نے اس زمانہ میں رنگا ڈاکو کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر 20 ہزار روپے نقد اور 10 مہینہ نہری زمین بطور انعام کا اعلان کیا تھا۔

اُس زمانے کے لوگ بتاتے ہیں کہ رنگا ڈاکو نے اپنی بہن نورالین کی عزت لوٹنے والے ایک کردار سونو کے گھر میں گھس کر پہلے اُس کی جوان بیوی کو قابو کرنے کے بعد اپنے ہی ڈاکوٹولہ کے ایک ڈاکو کے حوالہ کر دیا تھا جس نے پہلے سالو کے سامنے اس کی عزت لوٹی اور پھر اسے سالو کے حوالہ کرنے کے بعد اُس کے دونوں بازوؤں کو گولیوں کا برست مار کر ساری زندگی کے لئے اپالچ کر دیا۔ سالو نے طیش میں آ کر ڈاکوؤں کے ہاتھوں عزت لوٹنے کے بعد اپنی بیوی کو گولی مار دی۔

رنگا ڈاکو کا کہنا تھا کہ اُسے زمینداروں، گوروں سے نفرت ہے۔ یہ گورے ظالم زمینداروں کے بل بوتے پر غریب عوام پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

ادھر راجا کھیرن کی بیٹی سندری کو رنگا ڈاکو کے ہاتھوں اغوا ہوئے اڑھائی سال گزر گئے۔ اس کی حالت نیم پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ ممتا کی ماری اس کی بیوی نے اس کا جینا حرام کیا ہوا تھا کہ وہ ہر قیمت پر اس کی بیٹی کو ظالم رنگا ڈاکو کے ہاتھوں سے چھڑائے۔

گوروں نے رنگا ڈاکو کے سر کی قیمت 20 ہزار روپے سے بڑھا کر 50 ہزار روپے کر دی تھی جس میں سے 30 ہزار روپے راجا کھیرن نے حکومت کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔

ایک دن راجا کھیرن کے ڈیرے میں ایک چٹھی ملی جس میں سندری کی نکاحی میں لکھا گیا تھا کہ میں نے مسلمان ہونے کے بعد اپنی مرضی سے اورنگزیب سے شادی کر لی ہے اور آپ کا ایک نواسہ بھی ہے۔ آخر میں اُس نے لکھا کہ اورنگزیب ایک اچھا قدر دان انسان

سرمیدہ لاش گاؤں کے قریب ایک ویرانے سے ملی۔ کمیشن ان مجرموں میں شامل تھا جنہوں نے نورالین کی عزت لوٹی تھی اور مقتولہ کو سسکے کنویں میں پھینکنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہر زبان پر ایک ہی جملہ تھا کہ اورنگزیب نے اپنی بہن کا بدلہ لیا ہے اور وہ باقی مجرموں کو بھی نہیں چھوڑے گا۔

اورنگزیب کے ہاتھوں کمیشن کی ایسی بھیانک موت کو دیکھ کر پورے گاؤں میں سراسیمگی اور خوف کی لہر دوڑ گئی۔ پولیس نے اس کے باپ ولایت الدین کو اس خیال سے اپنی حراست میں لے لیا کہ اپنے باپ کی محبت کی خاطر اورنگزیب لامحالہ اپنی گرفتاری دے گا لیکن پولیس کی یہ سیکیم بھی ناکام ثابت ہوئی۔

پولیس کی انٹیلی جنس رپورٹ کے مطابق اورنگزیب نے زمیندار راجا کھیرن کے ہاتھوں اپنی بہن کی عزت لوٹنے اور قتل اور پولیس انتظامیہ کی جانب سے عدم تعاون، بے حسی سے بدلہ ہو کر راجا کھیرن اور اس کے ساتھیوں سے بذات خود انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور اس نے ارد گرد کے وارداتیوں کے ساتھ مل کر اپنا ڈاکوؤں کا گروہ بنا لیا ہے اور اس کا ٹولہ ڈسکہ تاجاندھر کے درمیان کسی خفیہ مقام میں چھپا بیٹھا ہے۔ اب وہ اورنگزیب سے ”رنگا ڈاکو“ کے نام سے شہرت پا چکا تھا۔

دراصل اورنگزیب کو رنگا ڈاکو کا خطاب اس وقت کے میڈیا نے انگریزوں کی ایما پر دیا تھا۔ رنگا ڈاکو نے اپنی وارداتوں کا دائرہ پانی پت تک مزید بڑھا دیا تھا۔ اس نے ایک آزادی پسند تحریک ہافیوں کے گروہ سے اپنے ٹولے کا الحاق کر لیا تھا۔ اس تحریک آزادی کی قیادت اتم سنگھ کا ٹولہ کرتا تھا۔ رنگا ڈاکو اور اتم سنگھ اعلیٰ انگریز اور اٹھین افسران کو نشانہ بنایا کرتے تھے۔ انہوں نے لاکپور (فیصل آباد) کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹومر، گورانیجر میو (Mioy) کو گولی ماری۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے کئی

نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔

اورنگزیب نے سندری کو کہا کہ تُو بچے سمیت پولیس کے پاس چلی جا۔ یہ کہتے مجھے کسی حالت میں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ سندری نے اورنگزیب سے پوچھا کہ کیا تُو بھی ہمارے ساتھ اپنے آپ کو پولیس کے حوالہ کرے گا؟ اُس نے کہا کہ نہیں میں مر کر بھی ایسا نہیں کروں گا۔

سندری نے اس کے پاؤں پر گر کر کہا کہ تم میری خاطر نہیں تو اپنے بچے کی خاطر اپنی ضد چھوڑ کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔

اورنگزیب نے بھی اپنی جگہ ضد پکڑ لی کہ وہ مر جائے گا لیکن وہ خود اور اپنے ساتھیوں کو کبھی بھی پولیس کے حوالے نہیں کرے گا۔ سندری نے اورنگزیب کے کندھے پر اپنا سر رکھتے ہوئے قسم کھائی کہ وہ ہر حال میں اس کے ساتھ ہی رہے گی۔ اورنگزیب نے اپنے ڈاکو ساتھیوں کو کہا کہ سندری اور بچے کو زبردستی پکڑ کر گھر کا دروازہ کھول کر پولیس کے حوالے کر دیں۔ انہوں نے دلوں کو زبردستی کھینٹ کر دروازہ سے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن سندری اُن سے اپنا آپ چھڑا کر واپس اورنگزیب کے پاس آ گئی۔ اسی کشاکش میں ایس بی سنکھو نے اپنے پولیس کمانڈرز کو حکم دیا کہ وہ گھر کے گرد اپنا حصار تنگ کر دیں۔ ادھر اورنگزیب نے پولیس کی اپنے گھر کی جانب پیش قدمی کو بھانپا تو اس نے اپنے پانچوں ساتھیوں کو پوزیشن لے کر پولیس سے آخری وقت تک مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ اُس نے اپنے چاروں اسلحہ بردار ساتھی چھت پر چڑھادیئے۔ جبکہ اُس نے خود اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مکان کے نچلے کمرے کی کھڑکیوں کی آڑ لے کر پولیس سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

ادھر ایس بی سنکھو تنگ نے پولیس نفری کو حکم دیا کہ وہ پہلے مقابلہ کرنے والوں کی جانب بے ہوش کرنے والی گیس پھینکے (اس کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ سندری، بچے اور

ہے۔ وہ تم لوگوں کے ظلم کی بناء پر ایک شریف انسان ہونے کے باوجود ڈاکو بنا ہے۔ مجھے آپ سے نفرت اور رنگ ڈاکو کی بیوی ہونے پر نفرت ہے۔ ہمیں تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ (سندری)

رنگ ڈاکو کو کس طرح پکڑا اور سندری کو اُس کے ہنگل سے کیسے چھڑایا جائے۔ انتظامیہ کے افسران اس مسئلہ پر سر جوڑ کر غور و خوض کرنے لگے۔

ایک دن پولیس ایشلی جنس کے کارندوں نے انتظامیہ کو یہ خفیہ رپورٹ دی کہ اورنگزیب نے اپنی بیوی سندری اور اور بچے کو محلہ افغاناں میں اپنے ایک جگری دوست موسیٰ خان کے مکان میں چھپا کر رکھا ہوا ہے اور وہ ہر جمعہ کو اپنا روپ بدل کر سندری سے ملنے آتا ہے۔

ایس بی سنکھو تنگ بڑی احتیاط سے اورنگزیب کو قابو کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے ضلع جہلم سے ہماری اضافی پولیس نفری کو بلوایا جن میں زیادہ تر ماہر نشانہ باز کمانڈوز تھے۔ وہ مکان کی نگرانی کرنے لگے۔ آخر چار دن بعد ان کی محنت رنگ لائی۔ رنگ ڈاکو بھیس بدل کر اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ محلہ افغاناں میں موسیٰ خان کے گھر میں اپنی بیوی سندری اور بچے سے ملنے آیا تو پولیس کی ہماری نفری نے اس مکان کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ایس بی سنکھو نے پولیس نفری کو یہ ہدایات جاری کی تھیں کہ ہر ممکن طریقہ سے سندری کو زندہ بازیاب کروانا ہے نیز اورنگزیب کو کسی صورت میں بھاگنے نہیں دینا۔

رنگ اپنے پانچ ڈاکو ساتھیوں کے ساتھ سندری اور بچے کے کمرے میں موجود تھا۔ اسی دوران ایس بی سنکھو نے میگافون سپیکر پر اُسے باور کرواتے ہوئے کہا کہ اب تم کھل طور پر پولیس کی ہماری نفری کے زرخے میں ہو۔ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ تم سندری، اپنے بچے اور اپنے ساتھیوں سمیت خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تم لوگوں کی زندگیوں کو ہرگز

انہیں پورے گھر میں اور نگزیب کی لاش کہیں بھی نہ ملی۔

وہ کہاں گیا؟ وہ اگر پولیس مقابلہ میں مارا گیا تو اس کی لاش کہاں گئی۔ پولیس پارٹی کو ان سوالات کے جوابات نہ مل سکے۔ تاہم رنگا ڈاکو کے شدید زخمی ساتھی نے دم توڑتے ہوئے یہ بیان دیا تھا کہ میرے ساتھ آخری وقت تک اور نگزیب چھت پر پولیس سے مقابلہ کر رہا تھا۔ میری کمر میں گولی لگ گئی تھی اس نے مجھے کہا تھا کہ نیچے کمرے میں چلے جاؤ۔ میں جب نیچے آیا تو سندری اپنے بچے کے ساتھ چٹھی بھی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس نے مایوسی سے کہا کہ ہمارے پاس گولیاں ختم ہو گئی ہیں تم اور نگزیب کو نیچے بلا لوتا کہ اب ہم اپنے آخری لمحوں میں اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ کر سکیں۔ میں نے آواز دے کر چھت پر چڑھے اور نگزیب کو کمرے میں نیچے بلایا تھا۔ اور نگزیب نے نیچے اتر کر سندری اور مجھے کہا کہ میں تمہیں اس بات کی اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو پولیس کے حوالہ کر دو۔ اس طریقہ سے تم تینوں کم از کم زندہ رہ سکو گے لیکن سندری اور میں نے اُسے وچن دیا تھا کہ ہم سب ساتھ جئیں اور مریں گے۔ اس کے ساتھ ہمارے کانوں میں گریینڈ پھینے کی صرغ خراش آواز سنائی دی۔ میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ مجھے اس کے بعد کچھ بھی پتہ نہ چلا بعد میں وہ شدید زخمی ڈاکو بھی مر گیا۔

پولیس پارٹی نے اس مکان تو کیا اس علاقہ کا چپہ چپہ کنی بار کھنگالا لیکن انہیں کہیں بھی اس امر کا سراغ نہ مل سکا کہ حیرت انگیز اور پراسرار طور پر اور نگزیب کی لاش کہاں گئی۔ آیا جبکہ وہ مرا بھی تھا یا کسی طرح پولیس کا نرغہ توڑ کر بھاگا تھا۔

رنگا ڈاکو کا آج تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں گیا اور نہ ہی وہ کبھی منظر عام پر آیا۔ اس کے بیٹے کو ایک ہندو بے اولاد جوڑے نے گود لے لیا تھا۔

تمام ڈاکوؤں کو زندہ گرفتار کیا جائے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایس پی سنگھو سنگھ نے جب یہ محسوس کیا کہ اور نگزیب اور اس کے ساتھیوں کی جانب سے شدید مزاحمت اور مقابلہ ہو رہا ہے اور بے ہوش کرنے والی گیس سے خلاف توقع کوئی اثر نہیں ہو رہا تو اس نے اپنے نشانہ باز پولیس کمانڈرز کو حکم دیا کہ وہ سب سے پہلے چھت سے مقابلہ کرتے رنگا کے ڈاکو ساتھیوں کو گولی کا نشانہ بنائیں۔ پولیس نشانہ بازوں نے چھت پر چڑھے مقابلہ کرتے چاروں ڈاکوؤں کو جب مار دیا تو رنگا اور اس کے ساتھی نے خود چھت پر چڑھ کر مقابلہ کی ٹھانی۔ دونوں نے مکان کی چھت پر چڑھ کر آگے بڑھتی پولیس پر گولیاں برسانا شروع کر دیں جبکہ سندری ہستول بھر بھر کر دونوں کو چھت پر سپلائی کرتی رہی۔ دونوں جانب سے چھوٹے بڑے اسلحہ کا بے دریغ آزادانہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ ماحول میں بارود اور دھوئیں کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

پولیس اور رنگا ڈاکو کی جانب سے مقابلہ تقریباً دو گھنٹہ جاری رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ سلسلہ ایک خوفناک دھماکے کی آواز سے یکدم رک گیا۔ یہ گریینڈ کا دھماکہ تھا۔

ایس پی سنگھو کا یہ خیال تھا کہ شاید مقابلہ کرتے بقیہ کینوں نے اسلحہ ختم ہونے کے بعد مشترکہ خودکشی کر لی ہے۔ ایس پی نے کچھ دیر مزاحمت کاروں کی جانب سے مزید متوقع مزاحمت کا انتظار کیا۔ اسے جب قوی یقین ہو گیا کہ سارے مارے جا چکے ہیں تو اس نے پولیس پارٹی کو مکان کے اندر جانے کا حکم دیا۔ پولیس جب مکان کے اندر گئی تو کمرے کے اندر انہیں سندری کی لاش سے چمٹا بے ہوش بچہ اور قریب پڑا شدید زخمی حالت میں رنگا ڈاکو کا ساتھی ملا۔ جبکہ چھت پر اس کے چاروں ڈاکو ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں لیکن حیرت انگیز طور پر

مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں
رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں

دستِ شفاء

ایک پُر اسرار مرض کا علاج!

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)

0321-7612717

ڈی۔ ایچ۔ ایم ایس (DH.Ms)

ممبر میڈیکل ایسوسی ایشن پنجاب

ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن

شعبہ طب و نفسیات

میرے اس عزیز کی تو ماشاء اللہ بہت اچھی پریکٹس چل رہی ہے اور بہت نامی گرامی ڈاکٹر ہیں اور خدا نے انہیں بہت عزت دی ہے۔

ایک بار میں اچانک راولپنڈی ایک سرکاری کام کے سلسلے میں گیا تو ان کے ہاں قیام کیا۔ صبح کو کھیل آباد سے چل کر دوپہر ان کے ہاں پہنچا، سب لوگ مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں کھانا کھا کر سو گیا۔ شام کو جاگا تو سب اہل خانہ کو بہت سرا سیمہ پایا۔ خاصا کر ید کرید کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میرے بہنوئی کی والدہ صاحبہ کے دائیں ہاتھ میں بہت تکلیف ہے۔ سب ڈاکٹر صاحبان ان کے آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور شہد کی مکھیاں کی طرح ساتھ ہی واقع (دوائی خانہ کے چکر کاٹ رہے ہیں) کبھی ایک صاحب کوئی دوا اٹھا رہے ہیں کبھی دوسرا

اس ماہ کا کیس دینے سے قبل ہم قارئین سے ایک گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ کہ جب بھی ڈاکٹر صاحب سے منا ہو پہلے فون پر ناٹم ضرور لیں۔ اچانک آنے کی صورت میں پیدا ہونے والی پریشانی کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ دوا شروع رکھنے سے قبل ”فارم ہدایت“ بغور پڑھیں تاکہ ہر بات ان کے ذہن میں کلیئر ہو اور مجوزہ مدت تک علاج لازمی کریں تاکہ مرض کا جز سے خاتمہ ہو جائے۔

اب ہم اس ماہ کے کیس کی طرف آتے ہیں۔ یہ کیس تقریباً چار پانچ سال پرانا ہے۔ ہوا یوں کہ راولپنڈی میں ہمارے ایک نہایت قریبی عزیز ہیں ان کے والد صاحب آری میں کمیٹین تھے اور وہ خود اور دیگر اہل خانہ (سب بھائی) بھی ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں اور

کے لئے کسی نامی گرامی پیر صاحب نے دم کر کے دیا ہے کہ "ہاتھ پر باندھ دیں فوراً ٹھنڈ ہو جائے گی۔"

مگر یہاں تو معاملہ ہی اتنا ہو گیا تھا۔ پورے ہاتھ میں ہلکے بازو میں درد کی شدید لہریں اور جلن سو جن لہریاں۔ میں نے اس بیڑے کو اتارا اور پھر ہاتھ صاف کر کے معائنہ کیا تو حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ دبا کر چیک کیا تو صاف پتا چلا کہ ساری پتھلی PUS سے بھری ہوئی ہے۔ اب میں نے انہیں بتایا کہ جب تک یہ PUS خارج نہیں کی جاتی نہ تو مریض کو سکون ہوگا اور نہ ہی کوئی دوا کام کرے گی۔

"یہ کیسے ہوگا؟" سب نے پوچھا۔

"ایک چھوٹا سا کٹ لگا کر انکشن والی سرنج سے یہ مواد نکال دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا ورنہ مریضہ کی جان پر بنی رہے گی اور یہ انکشن پھیل بھی سکتی ہے، بعد میں کوئی مناسب دوا دیں گے۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کیوں بھی اس میں کیا رکاوٹ ہے؟ میں تو ہمیشہ ایسے کیسوں میں ایسے ہی کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ جب انہوں نے مزید انکشاف کیا کہ جناب ایسا اس لئے نہیں کر سکتے کہ مریضہ کو شوگر ہے اور جلد پر کٹ لگنے کی صورت میں خون بند نہ ہوگا اور مریضہ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ جناب ایسا ہی کرنا پڑے گا کیونکہ اور کوئی طریقہ نہیں جس سے یہ PUS نکالی جاسکے۔ میں نے نہایت حیرت سے ان کی طرف دیکھا جنہیں اس قانون قدرت کے بارے میں قصفا کوئی علم نہ تھا اور کئی لوگوں کو شاید اب بھی نہ ہو، وہ یہ کہ جب ایسا گندہ مواد جسم میں کہیں پیدا ہوتا ہے تو قدرت باقی جسم کو اس کے خطرناک اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اس مادے

صاحب اپنی عقل کے مطابق دوسری دوا اور پھر تیسری صاحب تیسری دوا۔ مگر درد ہے کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ ادھر وہ بھاری درد سے بے حال مگر وہ اللہ کے نیک بندے سب اپنی اپنی ڈاکٹری لڑا رہے ہیں۔ مزید پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ معاملہ کئی دن سے چل رہا ہے مگر ہاوجود سب دوا میں اور تدبیریں (تعویذات، عملیات) کرنے کے معاملہ دن بہ دن گڑبڑ ہو رہا ہے اور کوئی ڈاکٹر ہار ماننے کو تیار نہیں حالانکہ مریضہ کی جان پر بنی ہوئی تھی مگر ان کو اپنے طریقہ علاج پر اتنا یقین تھا کہ جتنا مسلمانوں کو روز قیامت پر ہے۔

چونکہ میں بھی میڈیکل کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا اس لئے رہا نہ گیا اور آخر دل کڑا کر کے پوچھ ہی لیا کہ جناب اگر مجھ ناچیز کو کسی قابل سمجھیں تو شامل راز کر لیں۔ شاید کوئی حل بتا سکوں۔ آخر کار نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں بولنا پڑا (کیونکہ ان کی) ناک نیچی ہوئی تھی کہ ایک "غیر ہومیو پیتھک" کے سامنے اعتراف شکست کیسے کریں۔ یاد رہے کہ میں شروع میں ایلو پیتھک پریکٹس بھی کرتا تھا اور اسے غار نہیں سمجھتا بشرطیکہ وہ کسی بنیاد (Base) پر کی جائے اور Proper Dose دی جائے۔ (یہ معاملہ بعد میں لکھوں گا)۔

بہر حال میں نے کہا کہ پہلے میں متاثرہ ہاتھ کا معائنہ کروں گا اور باقی معاملات بعد کے ہیں کہ کون سی دوا دینی ہے۔ جب میں نے ہاتھ دکھانے کو کہا تو انہوں نے اس کے اوپر لپٹا ہوا موٹا سا کپڑا کھولا۔ پھر ایک پٹی سی بندھی تھی وہ کھولی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے اوپر گندھے ہوئے آنے کا ایک بیڑا چڑا کر کے رکھا ہوا ہے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ دم کیا ہوا آٹا ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "درد

”علم“ صرف کتابیں پڑھنے سے مکمل نہیں ہوتا، پریکٹیکل بھی ضروری ہے اور آخری بات یہ کہ کبھی بھی کسی Base کے بغیر صحیح علاج نہیں ہو سکتا۔ تمام ڈاکٹر حضرات سے میری گزارش ہے کہ اچھی طرح تسلی کر کے مریض کی وجہ دریافت کریں یعنی Diagnosis کریں اور پھر علاج میں ہاتھ ڈالیں بے شک کوئی بھی طریقہ علاج ہو، اس کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

آخری اور نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ تمام معالجین کبھی بھی مجوزہ Prescribed Dose سے زیادہ ہرگز نہ دیں۔ یہ تمام ادویات علیحدہ علیحدہ ہیں اور میں نہایت دکھ کے ساتھ ایک بات لکھتا ہوں کہ محض مریض پر دھاک بٹھانے کی خاطر بعض ڈاکٹر و حکیم حضرات مقرر کردہ خوراک Prescribed Dose سے بھی زیادہ دے دیتے ہیں جن کے نہایت خطرناک اثرات مریضوں پر نمودار ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ جلد آرام پر ضد نہ کریں اور معالج کو بتادیں کہ مریض (خصوصاً نازک مزاج لوگ) کو دوا زیادہ یا تیز مقدار میں ہرگز نہ دیں بے شک دو دن کے بعد آرام آئے ہمیں جلدی نہیں ورنہ مریض کے ساتھ بعد میں جو ہوگا اس کے بارے میں آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مریض جان سے بھی جا سکتا ہے، یا عمر بھر کے لئے معذور بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے ایسے کئی کیس دیکھے ہیں مگر آفرین ہے ان ڈاکٹر حضرات پر کہ پردوں پر پانی نہیں پڑنے دیتے اور مریض کو بلا ضرورت ڈبل ڈوز دے دیتے ہیں حالانکہ ان کے فارما کوپیا اور دیگر کتابوں میں کیسریہ بات درج ہے مگر پتا نہیں کیوں وہ اپنی غلط بات پر بضد ہیں۔ بس اللہ ہی ان کو ہدایت دے سکتا ہے۔ آپ بھی دعا کریں!

✽

اور جسم کی جلد کے درمیان ایک موٹی جھلی پیدا کر دیتی ہے ورنہ اگر ایسا نہ ہو تو یہ گندہ مواد سارے جسم میں پھیل کر جلد ہی سارے خون کو زہریلا کر دے اور انسان کی جلد موت واقع ہو جائے۔ اس لئے اس کٹ یا Minor Surgery سے قطعاً کوئی نقصان نہیں۔ مگر یہ بات بڑی مشکلوں سے ان کے دماغ میں آئی اور وہ چارو تا چار اس بات پر تیار ہوئے۔ آپ یقین کریں کہ تقریباً دو سر نہیں 5cc کی ٹپس۔ پھر سپرٹ اور روٹی سے زخم کو صاف کر کے Pyodene لگا کر پٹا باندھ دی گئی۔

جلد ہی مریض کے چہرے پر سکون آ گیا اور جس درد نے اسے کئی دن رات سے بے حال کیا ہوا تھا وہ فوراً ختم ہو گئی۔ وہ سب کتابی ڈاکٹر (پیار سے میں ہو میو پیٹھک حضرات کو کتابی/علاماتی ڈاکٹر کہتا ہوں) بے حد حیران تھے اور ممنون بھی کہ وہ درد جو سب ادویات دینے کے باوجود ختم نہ ہو رہی تھی اب غائب تھی (ابھی کوئی دوا میں نے نہیں دی تھی مگر درد کی وجہ ختم ہو گئی تھی) اب وہ دوا کے بارے میں پوچھنے لگے تو میں نے کہا کہ اب سب دوائیں بھی اثر کریں گی۔ اگرچہ کوئی ڈاکٹر اپنی ”انا“ کی وجہ سے مجھ سے دوا نہیں پوچھے گا تاہم عوام الناس کی بھلائی کی خاطر میں از خود دوائیں بھی لکھ دیتا ہوں۔ وہ یہ ہیں:

- (1) Apis Mel6 1+1+1
 - (2) Heper SLF6 1+1+1
 - (3) Pyrogenium 6 1+1+1
- (One week)

اگر دوائی 6 میں دستیاب نہ ہو تو 30 میں بھی دے سکتے ہیں۔

یہاں میں نے جو بات بتائی ہے اس کو تمام ڈاکٹر حضرات پھر پڑھیں اور آزمائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ



دھوکے ہیں دھوکا پہ بازی گر کھلا

دھوکے باز دوسرے شخص پر اس قسم کا نفسیاتی اثر ڈالتے ہیں اور اپنی باتوں سے ایسا پہنا کر دیتے ہیں اور دوسرے کو ایسا سحر زدہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس کی باتوں میں آ جاتا ہے

☆ 0301-4845557 حبیب اشرف صہوتی

پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کچھ واقعات پیش کرتا ہوں جن کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں محتاط رہیں اور دھوکے بازوں سے بچیں۔

☆ آج سے تقریباً 40 سال قبل میں شام کو دفتر سے واپس آیا اور آرام کرنے کی غرض سے لیٹا ہی تھا کہ کال بیل بجی۔ میں بادل ناخواستہ اٹھا۔ کمر کی میں سے نیچے دیکھا تو ایک شناسا چہرہ نظر آیا اور مجھے دیکھتے ہی نیچے آنے کو کہا۔ میں مجبوراً نیچے گیا۔ اس نے سلام و دعا کے بعد میرے بڑے بھائی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ یہاں سے شفٹ ہو کر ماڈل ٹاؤن چلے گئے ہیں۔ ان کا گھر کا نمبر اور فون نمبر اس کو بتا

دھوکے بازوں کے واقعات اور کہانیاں ہم ازل سے سنتے آ رہے ہیں اور اب تک یہ داستانیں رہیں گی۔ دھوکہ دینے والے اپنے فن میں اتنے ماہر ہوتے ہیں اور ایسے طریقے استعمال کرتے ہیں کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی ان کے دھوکے میں آ جاتا ہے۔ روزانہ اخبارات میں اور اپنے ملنے جلتے والوں میں اس قسم کے واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ قتل حیران رہ جاتی ہے۔ دھوکے باز دوسرے شخص پر اس قسم کا نفسیاتی اثر ڈالتے ہیں اور اپنی باتوں سے ایسا پہنا کر دیتے ہیں اور دوسرے کو ایسا سحر زدہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس کی باتوں میں آ جاتا ہے اور اس کے اشاروں

تکلیف دہ گزر رہا ہے۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ گھر کے باہر ایک پھل والے کی دکان تھی جس سے میں پھل وغیرہ لیتا تھا۔ میں نے اس آدمی کی پریشانی بتائی اور کہا کہ تمہارے پاس اگر 600 روپے ہیں تو دے دو میں تمہیں ابھی گھر چا کر دیتا ہوں۔ اس نے اپنے غلے میں سے تمام میوے نکالے وہ تقریباً 450 روپے نکلے۔ میں نے وہ میوے گن کر اس آدمی کو دے دیئے اور کہا کہ اس کو آپ اپنی ضرورت کے لئے پورا کریں اور مجھے واپس نہ کریں۔ اس نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے پیسے اپنی جیب میں ڈال لئے اور گھر کی طرف چل دیا۔

اس کے جاتے ہی محلے کے دولڑکے جو نزدیک ہی کھڑے تھے، بھاگے ہوئے میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اس کو کس سلسلہ میں پیسے دیئے ہیں۔ میں نے ساری کہانی ان لڑکوں کو بتادی۔ اتفاق سے ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے کا کوئی کام میں نے کروا دیا تھا جو ناممکن تھا، وہ میرا بڑا مشکور رہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ شخص بڑا دھوکہ باز ہے۔ مختلف جیلے بہانوں سے لوگوں سے پیسے ٹھگ لیتا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اس سے پیسے واپس لے کر آؤں۔ اس سے قبل بھی میں نے اس کو اس قسم کی واردات کرتے ہوئے پکڑا ہے۔ میں نے اس لڑکے کو اجازت دے دی۔ وہ بھاگا ہوا گیا اور اس کو گریبان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لے آیا اور کہا کہ ان سے کس حساب میں پیسے لئے تھے۔ جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے اس کے ایک ٹھنڈے پٹھر مارا اور کہا کہ ان کے پیسے واپس کرو اور اس نے بغیر کسی جھجک کے پیسے واپس کر دیئے۔ میں سوچتا رہا کہ انسان چند سو روپے حاصل کرنے کے لئے انسانیت سے کتنا گر جاتا ہے اور کتنا جھوٹ اور فریب کاری کرتا ہے۔ اب خدا اور ناحق میں بھی تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

☆ میرے والد کے ایک دوست کی کتابوں کی

دیا کہ وہاں جا کر مل لیں۔ اس نے بتایا کہ آپ کے بڑے بھائی میرے بچپن کے دوست ہیں اور ہم ایک ساتھ اسکول میں پڑھتے رہے ہیں۔ میں واپڈا میں ملازم ہوں۔ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں میرا گھر ہے۔ میں اس وقت سخت پریشانی میں ہوں اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں آپ کے بھائی صاحب کے پاس ماڈل ٹاؤن جا سکوں میرا آٹھ سال کا بیٹا کئی دنوں سے ہسپتال میں داخل تھا۔ منویہ ہو گیا تھا، پیسہ پانی کی طرح بہا دیا لیکن اس کو شفا نہیں ہوئی اور آج اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ میت گھر میں پڑی ہوئی ہے کفن دفن کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں مجھے صرف 600 روپے چاہئیں جو پہلی تاریخ کو آپ کو مل جائیں گے۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھ کی گھڑی اتار کر میرے ہاتھ میں پہنا دی اور سونے کی انگلی بھی اپنی انگلی سے اتار کر میرے ہاتھ میں پہنا دی اور کہا کہ یہ دونوں چیزیں آپ اپنے پاس رکھ لیں جب میں پیسے واپس کروں گا تو یہ دونوں چیزیں آپ سے لے لوں گا۔ یہ حرکات کرتے ہوئے اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ میں نے اس کو دونوں چیزیں واپس کر دیں اور کہا کہ میں آپ کی خدمت کروں گا۔ یہ دونوں چیزیں اپنے پاس رکھ لیں۔ گھر کے نزدیک ایک نائی نے مجھ سے کچھ رقم ادھار لی ہوئی تھی میں اس آدمی کو لے کر نائی کے پاس گیا تاکہ اس کی مجبوری بتا کر رقم اس سے واپس لوں۔ جب نائی کی دکان پر گیا تو پہچان چلا کہ وہ دکان پر نہیں ہے۔ کہیں کام سے گیا ہوا ہے۔ ایک گھنٹے تک آئے گا۔ میں نے اس آدمی سے کہا کہ وہ ایک گھنٹے تک آ جائے میں اس سے رقم لے کر تمہیں دے دوں گا اور واپس نہیں لوں گا۔

وہ آدمی کہنے لگا کہ میں ایک گھنٹے کا انتظار نہیں کر سکتا، آپ مجھے کم ہی پیسے دے دیں۔ میرا ایک ایک

غزل

ریحان آفاق

روز اک مشغلہ تو رہتا ہے

اک نیا مسئلہ تو رہتا ہے

ہم ابھی ایک ہو نہیں پائے

درمیاں فاصلہ تو رہتا ہے

تجھ کو دل نے بھلا دیا لیکن

دل میں اک آبلہ تو رہتا ہے

راستے ختم تو نہیں ہوتے

اک نیا راستہ تو رہتا ہے

طے جو کرتا ہے عشق کی منزل

عشق میں جہلا تو رہتا ہے

دکان مسلم مسجد لوہاری دروازہ کے نیچے واقعہ تھی۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک روز صبح ایک نئی گاڑی شاندار قسم کی ان کی دکان کے آگے آ کر کھڑی ہوئی۔ شوہر نے دروازہ کھولا اور ایک بڑے معزز آدمی ہاتھ میں چٹری لئے ہوئے میری دکان میں آئے اور بڑے پُر تپاک طریقے سے سلام کیا۔ ان کی شخصیت اتنی شاندار اور پُر عجب تھی کہ میں ان کے استقبال میں کھڑا ہو گیا اور کہا کہ فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ بڑی معیاری اور اچھی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ میں کچھ کتابیں لینا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ کتابیں سامنے لگی ہوئی ہیں پسند فرمائیں۔ انہوں نے تین چار ہزار روپے کی کتابیں پسند کیں اور کہا کہ انہیں پیک کروادیں۔ میں نے پیک کروادیں۔ جب کتابیں پیک ہو گئیں تو انہوں نے ڈرائیور کو آواز دی اور کہا کہ یہ پیک گاڑی میں رکھو۔

ڈرائیور پیک اٹھا کر لے گیا۔ اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ مل بتائیے۔ میں نے رقم بتائی۔ انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ کیا آپ کچھ رعایت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ میں نے مروتا کہا کہ آپ وہ پیسے ہی لے جائیے۔ کہنے لگا کہ بہت بہت شکریہ اور بغیر رقم دیئے چلا۔ جب وہ چلا گیا تو جب مجھے ہوش آیا کہ وہ پیسے بھی دے کر نہیں گیا۔

ملا میرے ایک دوست بہت تعلیم یافتہ اور محتاط آدمی ہیں لیکن ایک روز وہ دھوکہ بازوں کے زخموں میں آ گئے اور بہت سمجھدار ہونے کے باوجود کئی ہزار روپوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔

بقول ان کے ایک روز انہوں نے بنگ سے ایک لاکھ روپے نکالے۔ پیسوں کو احتیاط سے جیب میں رکھا اور کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی تھی، اس میں جا کر بیٹھ گئے۔ ابھی گاڑی سٹارٹ کرنے والے تھے کہ ان کو محسوس ہوا کہ

کوئی شخص پیچھے سے ان کی گاڑی کے ساتھ ٹکرایا ہے اور گاڑی کے نیچے ٹکس گیا ہے۔ وہ فوری طور پر گاڑی سے اترے۔ دیکھا کہ ایک چدرہ سولہ سال کا لڑکا گاڑی کے نیچے گھسا ہوا ہے اور پانچ پانچ سو اور ہزار روپے کے نوٹ زمین سے اٹھا کر چن رہا ہے۔ میں نے اسے آواز دی کہ گاڑی کے نیچے سے نکل آیا اور کہا کہ یہ پیسے گاڑی کے نیچے گرے ہوئے تھے، آپ کے تو نہیں ہیں، چیک کر لیں؟ میں نے کہا کہ میرے نہیں ہیں۔ تھوڑی دیر وہ نوٹ گنتا رہا اور ایک طرف کو بھاگ گیا۔ میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔ اتنے میں ایک بوڑھا آدمی روتے ہوئے میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں سامنے بک سے پیسے نکلوا کر لایا تھا اور جہاں آپ کی گاڑی کھڑی ہے وہاں سواری کا انتظار کر رہا تھا۔ جب یہاں سواری نہیں ملی تو میں آگے چلا گیا، شاید آگے سے کوئی سواری مل جائے۔ جب سواری مل گئی اور میں اس میں بیٹھنے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میری جیب میں رقم موجود نہیں ہے۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں سواری میں نہیں بیٹھا اور یہاں تلاش کرنے آ گیا ہوں۔ پچاس ہزار روپے مالیت کے نوٹ تھے اور میں نے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے نکلوائے تھے۔ میں نے بتایا کہ ایک لڑکے نے میری گاڑی کے نیچے سے نوٹ اٹھائے ہیں اور وہ سامنے کی طرف بھاگا ہے۔ وہ بوڑھا کہنے لگا کہ خدا کے لئے میری مدد کریں میں آپ کا احسان مند ہوں گا۔

میں نے بوڑھے کو گاڑی میں بٹھالیا اور اس کو تسلیاں دیتا رہا اور وہ بوڑھا مجھے بتاتا رہا کہ ادھر چلیں ادھر چلیں۔ میں بڑا حیران تھا کہ اس کو کس طرح پتہ ہے کہ وہ لڑکا کہاں ہوگا؟ تھوڑی دور جانے کے بعد ہم نے لڑکے کو تلاش کر لیا۔ میں نے بوڑھے سے کہا۔ اس لڑکے کے پاس تمہارے پیسے ہیں۔ میں نے اس لڑکے سے کہا کہ تم نے جو پیسے میری گاڑی کے نیچے سے اٹھائے تھے وہ ان بزرگ ہیں۔ اس لڑکے نے نشانی پوچھی کہ 500 روپے کے کتنے نوٹ ہیں، 1000 روپے کے کتنے نوٹ ہیں؟ اس بوڑھے نے تعداد بتائی اور کہا کہ وہ سب نوٹ ملے ہیں۔ اس لڑکے نے گن کر نوٹ اس بزرگ کو دے دیئے۔ اب اس بزرگ نے لڑکے سے کہا کہ ان پیسوں کے ساتھ سونے کی انگوٹھی بھی تھی وہ بھی لڑکے نے کہا کہ میری تلاشی لے لو جو پیسے میں نے اٹھائے تھے تمہیں دے دیئے۔ بوڑھا آدمی زور زور سے بولنا شروع ہو گیا اس کی آواز سن کر دو تین لوگ اور بھی آ گئے اور لڑکے سے کہا کہ تم تلاشی دو۔

لڑکے نے تلاشی دے دی۔ اب وہ بوڑھا آدمی کہنے لگا کہ یہ صاحب جو مجھے لے کر آئے ہیں ان کی بھی تلاشی لو۔ یہ لڑکے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے بوڑھے سے کہا کہ تم شرم کرو، میں نے تمہاری مدد کی، گاڑی میں بٹھالیا اور اس لڑکے تک پہنچایا۔ تم میرے احسان مند اور شکر گزار کیا ہو گے تم مجھ پر بھی الزام لگا رہے ہو۔ میرا نہ اس لڑکے سے تعلق ہے اور نہ تم سے۔ میں جا رہا ہوں۔ نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔ وہ بوڑھا مسلسل یہی کہے جا رہا تھا کہ ان کی بھی تلاشی لو۔ دو تین آدمی وہاں کھڑے تھے وہ بھی بوڑھے کی تائید کرنے لگے کہ آپ بھی اپنی تلاش دے دیں۔ بوڑھے آدمی کی کسی ہو جائے گی۔ انہوں نے زبردستی میری تلاشی یعنی شروع کر دی۔ میری جیب سے ایک ناکھ روپے نکالے اور خدا جانے کس طریقے سے 50 ہزار روپے اس میں نکالے اور بتایا پیسے میری جیب میں ڈال دیئے اور کہا کہ آپ کی ہم نے تلاشی لے لی ہے۔ انگوٹھی نہیں ہے، آپ جا سکتے ہیں۔ جب گھر آ کر رقم گنتی تو 50 ہزار روپے غائب تھے۔ خدا جانے انہوں نے کس طریقہ سے پیسے نکالے

کہ مجھے پتہ بھی نہیں چلا اور یہ نیکی میرے گلے پڑ گئی اور نیکی مجھے پہلی پڑی۔

☆ میرے ایک دوست اپنی دکان سے اٹھ کر جمعہ کی نماز کو جا رہے تھے، جیب میں کچھ رقم بھی تھی۔ ابھی مسجد سے کچھ دور ہی تھے کہ ایک لڑکا رنگ کی بالٹی لے کر سامنے سے آ رہا تھا۔ جب وہ نزدیک آیا تو وہ بڑی تیزی سے میرے دوست کے ساتھ ٹکرایا اور رنگ ان کے کپڑوں پر گر گیا اور وہ بھاگ کر ایک گلی میں چلا گیا۔ اتنے میں دو ہارٹس لوگ بھاگے ہوئے میرے دوست کے پاس آئے اور انسوس کا اظہار کیا۔ لڑکے کو بُرا بھلا کہتے رہے اور کپڑے دھلانے کے بہانے مسجد میں لے گئے۔ قیص اتروائی، رنگ کو صاف کیا اور قیص پہنا دی اور فوری طور پر وہاں سے غائب ہو گئے۔ جب میرے دوست نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو رقم غائب تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ پورا ایک گینگ ہے۔

☆ چند ماہ قبل میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک دکان میں بیٹھا ہوا تھا اور گپ شپ کا پروگرام چل رہا تھا کہ اتنے میں ایک ضعیف آدمی جو انتہائی کمزور تھا اور اس سے چلا بھی نہیں جاتا تھا، ہمارے پاس آ گیا اور درخواست کی کہ وہ فقیر نہیں اور نہ کچھ مانگنے آیا ہے بلکہ سخت بیمار ہے اور چلنے میں بھی دقت ہو رہی ہے۔ سخت بخار ہے، مجھے خالی دوائی دلو دیں۔ اتفاق سے چند دکانیں چھوڑ کر ایک ڈاکٹر کی دکان تھی میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس کے پاس چار پانچ مریض بیٹھے تھے اور اپنی ہاری کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر کے کیاؤنڈر سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے کہیں کہ اسے اچھی طرح چیک کریں اور اس کو دوائی دیں۔ جتنے پیسے ہوں گے میں دے دوں گا۔ کیاؤنڈر نے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ بے فکر ہو کر جائیں میں نے بزرگ آدمی سے کہا کہ اگر ڈاکٹر صاحب کوئی دوائی لکھ کر دیں تو

میرے پاس لے کر نسخہ آ جائیں میں دوائیاں دلوادوں گا اور اگر اپنے پاس سے دیں تب بھی مجھے بتا دینا۔ کچھ دیر بعد میں بزرگ ڈاکٹر کے پاس سے آیا اور ایک نسخہ دے دیا کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھ کر دیا ہے۔ میں ایک کیسٹ کی دکان پر گیا اور کہا کہ ایک ہفتہ کی دوائیاں دے دو۔ وہ بزرگ کہنے لگا کہ مجھے ایک ماہ کی دوائیاں لے کر دو۔ میں بڑی دور سے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ بابا جی آپ ایک ہفتہ دوائی استعمال کریں اگر اس سے آرام نہ آیا تو یہ دوائیاں بے کار جائیں گی اور اگر ان دوائیوں سے آرام آ گیا تو ڈاکٹر صاحب کو آ کر بتا دیں وہ نسخہ میں مزید تبدیلی کر کے دوائیاں دے دیں گے اور میں اس دکان پر روز آ کر بیٹھتا ہوں فکر نہ کریں۔ اگر میں نہ بھی ہوا تو میں نے ڈاکٹر کے کیاؤنڈر سے کہہ دیا ہے کہ یہ بزرگ جب بھی آئیں ان کا ڈاکٹر صاحب سے چیک اپ کروائیں اور کیسٹ کو بھی کہہ دیتا ہوں کہ جب بھی آپ آئیں ان کو دوائی دے دیں لیکن وہ بزرگ مسلسل یہی کہتا رہا کہ مجھے ایک ماہ کی دوائیاں لے دیں۔ میں نے 15 روز کی دوائیاں لے دیں تو وہ بزرگ کہنے لگا کہ مجھے فلاں جگہ جانا ہے۔ رکشے کا کرایہ بھی دے دیں۔ میں نے اُسے کرایہ بھی دے دیا بلکہ اس سے بھی زیادہ پیسے دے دیئے تاکہ بزرگ کو پریشانی نہ ہو اور دکان سے واپس آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بزرگ دکان سے نکس آیا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ دیکھوں کہ یہ بزرگ رکشہ میں بیٹھتا ہے یا نہیں۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ راستے میں کئی رکشے آئے وہ کسی میں نہیں بیٹھا۔ اب اس کی چال میں بھی تیزی آ گئی تھی۔ پھر میں نے دیکھا وہ ایک کیسٹ کی دکان میں داخل ہو گیا۔ میں بھی جلدی سے اُس کے پیچھے دکان میں داخل ہو گیا۔ دکان میں گاؤں کا رش تھا۔ جب رش کم ہوا تو بزرگ سبز مین کے

کے پیسے دے جاتا ہوں۔ جتنے استعمال ہوں گے ان کے پیسے کاٹ لیجئے گا باقی رول آپ رکھ لیجئے گا اور اس کے پیسے واپس کر دیجئے گا۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے وہ چند روز بعد آئے کہا کہ صرف 2 رول استعمال ہوئے ہیں۔ آٹھ باقی آگئے ہیں ان کے پیسے دے دیں۔ میں نے رول چیک کئے مکمل طور پر بند تھے۔ میں نے دو کے پیسے کاٹ لئے اور آٹھ رول کے پیسے واپس کر دیئے۔ کچھ دنوں بعد ایک صاحب آئے اور ایک فلم رول لے گئے۔ دوسرے روز وہ ڈکان پر آئے، سخت ناراض تھے۔ کہنے لگے کہ فنکشن شروع ہونے سے پہلے میں نے فلم رول کھولا تو اس میں سے یہ گنڈیری کے چھکے نکل آئے۔ آپ مذاق کرتے ہیں؟ میں کافی دیر سے یہ واپس کرنے آیا ہوں۔

اس نے مجھ سے بہت بحث کی اور کہا کہ میں آپ کا پرانا گاہک ہوں ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ میں نے اُسے دوسرا رول دیا۔ اس نے میرے سامنے رول کھولا تو اس میں سے بھی گنڈیری کے چھکے نکلے۔ وہ گاہک کہنے لگا کہ اب آپ خود انصاف کر لیں۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ جو صاحب آٹھ فلم رول واپس کر کے گئے تھے یہ ساری کارستانی اُن کی ہے۔ صبر کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

اسی طرح ان صاحب کی ڈکان میں ایک بڑے اپ لوڈیٹ صاحب آئے۔ انہوں نے کئی ہزار کی شاپنگ کی، جب پیسے دینے لگے تو کہنے لگے کہ میں باہر سے آیا ہوں، میرے پاس ڈالر ہیں، آپ لے لیں۔ میں نے کہا کہ ہمیں پاکستانی کرنسی دیں اسے ہم کہاں تبدیل کراتے رہیں گے۔ انہوں نے کہا مجھے یہ سامان بہت ضروری چاہئے میں ٹوٹل رقم پر 1500 روپے زیادہ دیتا ہوں میرے دوست لالچ میں آگئے۔ ڈالر وصول کر لئے اور سامان دے دیا۔ دوسرے روز ڈالر مارکیٹ میں بھیجے تو پتہ چلا کہ ڈالر جعلی تھے، ان کو کئی ہزار کا نقصان پہنچ گیا۔

پاس گیا اور کہا کہ یہ دوائیاں میں نے کر گیا تھا، اب یہ دوائیاں ختم گئی ہیں۔ اس کو واپس کر لیں اور پیسے مجھے دے دیں۔ جب بزرگ نے یہ الفاظ سنا تو کہے اور لفافہ اس کے ہاتھ میں پکڑا یا تو میں نے فوری طور پر لفافہ سنا میں سے لے لیا اور بزرگ سے کہا کہ یہ دوائیاں اس وجہ سے تم ایک ماہ کی لے رہے تھے کہ ان کو بیچ کر پیسے اپنی جب میں ڈالو۔ تمہیں اپنی عمر دیکھنی چاہئے اور جو تم کام کر رہے وہ دیکھو میں نے تو تم کو ترس کھا کر دوائیاں دلو میں اور رکشے کے پیسے دیئے۔ تم دن میں یہ ڈرامہ کر کے کتنے لوگوں کو بے وقوف بناتے ہو گے۔ دکان میں جو دوسرے لوگ کھڑے ہوئے تھے انہوں نے بھی بزرگ کو شرمندہ کیا۔

اس کے بعد میں ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور اُن سے پوچھا کہ آپ نے اس کی کون سی بیماریاں دیکھیں اور اتنی دوائیاں لکھ دیں اور اس کو کیا بیماری تھی۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ جب وہ آیا تو بہت کمزوری کی حالت میں چل رہا تھا تو میں نے اس سے بیماری پوچھی تو اس نے بتایا کہ اسے سانس اور دم کی بیماری ہے اور جیب سے ایک نسخہ نکال کر مجھے دیا اور کہا کہ میں یہ دوائیاں کھاتا ہوں تو ٹھیک رہتا ہوں، مجھے یہ دوائیاں لکھ دیں لیکن جب اس کا تھیںلی معائنہ کیا تو اس میں اس قسم کی بیماری کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کے کہنے پر اور مجبور کرنے پر میں نے دوائیاں لکھ دیں۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب کو صحیح صورت حال بتائی تو وہ بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ اب کس کو کس طرح سمجھیں کہ یہ حقدار ہے، اچھے اور بُرے آدمی میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

میرے ایک دوست کا ایک بڑا ستور ہے جہاں مختلف قسم کی چیزیں ملتی ہیں۔ ایک روز ایک صاحب بظاہر بہت شریف نظر آتے تھے، آئے اور کہا کہ مجھے ایک شادی کے فنکشن کے لئے دس فلم رول چاہئیں۔ میں ان

دن سبک رفتاری سے گزرتے گئے۔ کتے کی خوفناک آوازیں، اُس کے بے رحمانہ شکار جاری رہے۔ موسلا دھار بارشیں، آندھیاں، جھکڑ اور طوفان اُس حویلی کی خاموش راتوں کو نہ اسرار بناتے رہے لیکن جنگل انہیں سکا۔



جنگل

وقار احمد ملک، میانوالی

رات کے وقت اس گلی کے حنوط شدہ سکوت کے مقابلہ میں گورستان کی خاموشی بھی شکست کھا جائے گی۔ وہ راتیں جب اس گلی میں تیز بارشوں کا موسم شروع ہوتا ہے اس گلی کو اور بھی بڑا اسرار بنادیتی ہیں۔ دسمبر کی غنچ بست راتوں کے جھکڑ آسمان کے درختوں کے مرہل، زرد سوکے چوں کو ایک دوسرے کے پیچھے لگائے پھرتے ہیں۔ اس گلی میں تھوڑا آگے جائیں تو بائیں طرف ایک پرانی طرز کا حویلی نما مکان ہے۔ دوسرے مکانات کے برعکس اس حویلی کے اندر پرانے آسمان کے درختوں کے ساتھ ایک بوڑھا بوڑھا درخت بھی موجود ہے جس کے چار پانچ فٹ محیطہ میں بے شمار گلابوں نے رہائش اختیار کی ہوئی ہے۔ درختوں کے اس قدیم تنج سے ہٹ کر دو تین پرانے کمرے، ایک غلام گردش، باروچی خانہ اور ایک سنور پر مشتمل قدیم عمارت ہے۔

قیام پاکستان کے بعد میرٹھ سے ہجرت کر کے آنے والے لوہا ہٹا جوڑے نے جب یہ حویلی الاٹ کرائی تھی تو

شہر کا یہ قدیم حصہ آہستہ آہستہ سکون ہوتا جا رہا ہے۔ لوگوں نے اس خاموش علاقہ کے بڑے بڑے کشادہ مٹیوں کو چھوڑ کر نئے شہر کی جدید کالونیوں کے چند مریلوں کے متعش ڈربوں میں خوشی خوشی قید قبول کر لی ہے۔ زمانہ جدید کے شور و غل اور ترقیوں کے کلنگے سے شہر کا یہ پرانا حصہ اب بھی آزاد ہے۔ اس پرانے علاقے کی ایک گلی جو اینٹوں سے بنائی گئی تھی دن کے وقت بھی شام کا سماں پیدا کیے رہتی ہے۔ اس تاریکی کا سبب اس گلی کی دونوں جانب مغلوں کے زمانوں کے تعمیر شدہ پرانے مکانات اور حویلیوں کی اونچی اونچی دیواریں اور ان دیواروں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے بوڑھے آسمان کے درخت ہیں۔ اس گلی کے سکون کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جنگ ہونے کی وجہ سے ان میں موٹروں اور گاڑیوں کا گزر نہیں ہوتا۔ اس گلی کے مین زیادہ تر اوجیز عمر اور بزرگ لوگ ہیں جن کی اولادوں نے اس گلی کو چھوڑ کر نئے شہر میں رہائش اختیار کر لی ہے۔

اُس وقت بھی شاید اس کی حالت زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ قاضی قمر الدین نے، جو پہلے ایک نواب کا منشی مقرر ہوا بعد میں بلند پائی دفتر میں شیو گرافر کی ملازمت حاصل کر لی۔ قاضی صاحب اپنی متانت، شرافت اور پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے گلی میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قاضی صاحب کی زوجہ شیریں بی بی کے نام سے معروف تھیں۔ پورے محلے کی خواتین سے اُن کی سلام دعا تھی۔ گوان کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن اسے انداز اور ہلکے پھلکے ہٹاؤ سنگھار کی وجہ سے ایک نوجوان لڑکی کے مشابہ تھیں۔ شیریں بی بی دراز قد، کھلتی ہوئی سفید رنگت اور موتیوں جیسے دانتوں سے پھوٹنے والی مسکراہٹ کے سبب اس گلی کی حسین خواتین میں شمار کی جاسکتی تھیں۔

میاں بیوی کے درمیان محبت بھی لافانی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں ادبی ذوق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جوانی میں راتوں کا ایک طویل حصہ غالب اور میر کے دانشورانہ اور رومانوی اشعار کی نظر ہو جاتا۔ منٹو کا جو بھی نیا افسانہ شائع ہوتا دونوں میاں بیوی گلی گلی گھٹنے اس پر بحث کرتے۔ تقسیم موضوع پر لکھے ہوئے منٹو کے افسانہ "لوہہ فیک سنگھ" پر تو قاضی صاحب اور شیریں بی بی کی گفتگو اور تبصرے کئی دن جاری رہے۔ کئی مہینوں تک مذاق ہی مذاق میں وہ اس افسانے کے پاگل ہیرو کی مشہور گالی سے ایک دوسرے کو نوازتے رہے۔

اولاد دہریہ کی خواہش کی تکمیل نے اس وسیع مکان کے مختصر گھرانے کی خوشیوں میں توسیع قزح کے رنگ بکھیر دیے۔ ننھے قاقب کی کلکاریوں نے خاموش حویلی کو گویائی عطا کر دی۔ قاضی صاحب کی محدود تنخواہ اس مختصر کنبے کی خوشیوں میں حائل نہ ہو سکی۔ شاید اس وجہ سے شیریں بی بی اور قاضی صاحب کی غیر مادی دلچسپیاں تھیں۔ وہ قیمتی ملبوسات، زیور یا سامان آرائش و زیبائش کا لطف کسی اچھے شعر، افسانے یا کسی بھول بسری یاد کو کرید کر حاصل کر لیتے۔ زندگی انتہائی دلچسپ ریوے کے سفر کی طرح گزرتی گئی۔ ادھر قاقب نے فہم اور ادراک کی ابتدائی

سیڑھی پر قدم رکھا، ادھر محبت کرنے والے جوڑے کی آزادی ختم ہونے لگی۔ میاں بیوی کی باہمی محبت واحد بچے کی محبت سے بازی لے گئی۔ جیسے ہی قاقب کی آنکھیں بند ہوئیں شیریں بی بی جھٹ پٹ اُسے اٹھا کر ساتھ والے لڑکے بیٹیوں والے کمرے میں پہلے سے تیار شدہ بستر پر ڈال آتی لیکن اکثر قاقب تھوڑی دیر بعد روتا ہوا واپس آ جاتا اور گاڑی کے دو پہیوں کو پھر سے جدا کر دیتا۔ قاقب کی عمر چھ سات سال ہو چکی تھی اور اس نے سکول جانا بھی شروع کر دیا تھا۔ شیریں بی بی نے ایک دن غلام گردش کے دوسری طرف واقع سنور کی صفائی شروع کر دی۔ کمرے کو ان تصویروں، رنگوں اور مناظر سے حیرن کر دیا جو ایک کسمن بچے کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ قاقب کے اندر بہادری کے مردانہ جوہر بیدار کرنے کے لیے اُسے نازن کی کہانیاں بھی سناتا شروع کر دیں۔ قاقب کو نیا کمرہ بہت پسند تھا جس میں اُس کے لیے نئے نئے کھلونے بھی لا کر رکھ دیئے گئے تھے۔ چابی والا کتا تو اُس کو بہت پسند آیا تھا۔ جیسے ہی اُس کھلونا کتے کو چابی دی جاتی وہ اپنی چھوٹی سی دم ہلا کر بھوں بھوں کرنا شروع کر دیتا۔ کتے کے علاوہ بھالو، بندر، طوطے اور کچھوے بھی اُس کے لیے دلچسپی کا باعث تھے۔ چند دنوں بعد جب قاقب کو یہ اطلاع دی گئی کہ اب اُس کو شب ب سری بھی اس سے کمرے میں کرنی پڑے گی تو اُس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ قاقب نے جب رات کو اکیلے کمرے میں سونے سے انکار کر دیا تو پہلی مرتبہ قاضی صاحب نے اُس کو زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔ سُرخ پھولے ہوئے رخسار اور پھول گئے اور ان کا رنگ گہرا گلابی ہو گیا۔ آنسوؤں کی ایک جھڑی فوراً بہہ نکل۔ یہ رمضان المبارک کی انتہائی رات کا واقعہ ہے جسے "چند رات" بھی کہا جاتا ہے۔

چند راتیں قاقب نے جاگ کر گزاریں لیکن اب آہستہ آہستہ وہ حویلی کی پرانی کمین "تہائی" کا عادی ہوتا

لطیفہ

لوکی اپنے ابو سے، وہ سامنے والوں کا لڑکا مجھے بہت
تگ کرتا ہے۔

ابو میں اسے پولیس کے حوالے کرتا ہوں تاکہ اسے
سخت سزا ملے۔

لوکی: نہیں ابو، میں تو اسے اس سے بھی سخت سزا دینا
چاہتی ہوں۔

ابو: کیسے؟

لوکی شرماتے ہوئے۔ ابو آپ میری اس سے شادی کر
دیں!

ابو! وہ بیٹی انتہام لینے میں بالکل اپنی ماں پہ گئی ہو۔
(اشفاق شاہین، کراچی)

اُس کا ایک کان کاٹ کر بلوگڑے کے کان کے ساتھ جوڑ
کرنج میں دفن کر دیا۔

دن سب رفتاری سے گزرتے گئے۔ کتے کی

خونناک آوازیں، اُس کے بے رحمانہ شکار جاری رہے۔

موسلا دھار ہار تھیں، آندھیاں، جھکڑ اور طوفان اُس حویلی کی

خاموش راتوں کو نہ اسرار بناتے رہے۔ لیکن جنگلات نہ بن سکا۔

پاکستان بنے تین دہائیاں مکمل ہو چکی تھیں۔ میاں

بیوی کے بالوں میں چاندی اترنا شروع ہو گئی۔ قاتب کے

چہرے پر بھی سبزہ نمودار ہونا شروع ہو گیا۔ یہ اُس خاموش

حویلی کے تمام مکینوں کی عمروں کا عبوری دور تھا۔ دو تین

سالوں کے بعد قاتب ایک خوب رو جوان کی شکل دھار

گیا۔ موٹی موٹی آنکھیں، چھوٹی، چھوٹی خوبصورت تراشی

ہوئی موچیں اور چستے دار۔ کسی دھنیں قاتب کی دلکش

فحشیت کی آئینہ دار بن گئیں۔ قاتب اُس خاموش گلی کی

کین چند لڑکیوں کا ہیرو بن گیا۔ چوہدری فتح داد کی بیٹی

فارہ نے جب قاتب کو پہلی مرتبہ دیکھا تو دم بخود رہ گئی۔

لیکن قاتب ان سب رومانوی چکروں سے ماورا فلسفی دنیا

میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ مقابلے

گیا۔ ساری گلی کے مکانوں کی چھتیں ایک دوسری سے
متصل تھیں۔ تین گھر دور چوہدری فتح داد کا مکان تھا۔

چوہدری صاحب نے شوقیہ طور پر ایک کتاب لکھا تھا۔

مکانوں کی ساری چھتیں اُس کتے کی ملکیت تھیں۔ ایک

رات ایک بلی اپنے نو مولود بچے کو منہ میں اٹھائے کہیں

لے جا رہی تھی کہ چوہدری صاحب کے کتے نے اُس کو

دیکھ لیا۔ وحشیانہ انداز میں بھونکا ہوا کتابلی کے پیچھے بھاگا۔

بلی کے منہ سے اُس اچانک آفت کے باعث بچہ گر گیا۔

کتے نے بلی کی بجائے اُس بلوگڑے کے پیچھے بھاگنا

شروع کر دیا اور بالآخر قاضی صاحب کے مکان کے ستور

کے اوپر بنے دودکش کے قریب اُس کو پکڑ لیا۔ کتے نے

بلوگڑے کو پکڑتے ہی اُس کی نکال پٹی کر دی۔ خون کے چند

قطرے دودکش سے ہوتے ہوئے نیچے ستور میں بھی گرنے

لگے۔ کتے کی خوفناک آواز سے نفعے قاتب کی آنکھ مکمل

گئی۔ کڑکی سے آتی ہوئی چاندنی کی ایک کرن دودکش

کے نیچے ایک پرانے اور متروک چولہے پر پڑ رہی تھی۔

قاتب نے جب خون کے قطرے دیکھے تو اس کی شش کم

ہو گئی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے

دروازہ کھولا اور غلام گردش سے ہوتا ہوا امی ابو کے کمرے

کی طرف بھاگا۔ اس نے دروازہ بجایا لیکن اندر والے

شاید گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے دروازہ نہ کھلا۔ چارونا چار

خوف، شرمندگی اور زندگی کے ایک نئے احساس کے ساتھ

قاتب اپنے کمرے کے بستر پر آلیٹا۔ خونی کھیل ختم ہو چکا

تھا۔ بلوگڑے کا ایک کٹا ہوا مصوم سا کان دودکش کے

اندرفرش پر پڑا تھا۔ خون مزید نہیں گرا تھا۔ شاید اُس بے

زبان کی رگوں کی کل متاع ہی یہی چند قطرے تھے۔

قاتب نے صبح ناشتہ کرتے ہوئے امی ابو کو رات کا

واقعہ بیان کیا اور التجا کی کہ ہمارے مکان کی چھتوں کے

ارد گرد دیوار بنا دی جائے تاکہ پھر ایسا واقعہ نہ ہو۔ قاضی

صاحب اور شیریں بی بی کو بھی جان قاتب کی شب بیتی پر

بڑا ترس آیا۔ ابو نے جنگلات جلد بنانے کا وعدہ کیا۔ اگلے دن

قاتب نے چابی والا کتا ایک بھاری پتھر سے مسل ڈالا اور

کے امتحان میں بیٹا اور صوبہ بھر میں ساتویں پوزیشن حاصل کی۔ چند دنوں بعد اُس ننگہ کا سپرنٹنڈنٹ مقرر ہو گیا جس میں اُس کے والد قاضی صاحب نے معمولی ملازمت کرتے ہوئے اپنی عمر گزار دی تھی۔

میاں بیوی کی گاڑی کے دو پیچوں کے فرائے ختم ہو گئے تھے لیکن گھر گھر رکتی ہوئی ست رفتار گراہوں والا دھیرا دھیرا سڑاب تک جاری تھا۔ فراغت ملی تو ایک دوسرے کی ضرورت اور بڑھ گئی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تو قاضی صاحب نے اب حویلی سے باہر نکلنا بہت ہی کم کر دیا تھا۔ ادبی ذوق میاں بیوی میں ہنوز باقی تھا بلکہ پہلے سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اے حید کے افسانے قاضی صاحب دیکھ ہی سے پڑھتے تھے۔ اے حید کی امرتسر کی یادوں کو وہ میرٹھ کی تصوراتی نگاہوں سے پڑھتے۔ بعض اوقات تو اے حید کے افسانوں کی دبیز روانیت اور سکوت قاضی صاحب کے چہرے پر ایک گہری طمانیت کا احساس پیدا کر دیتا کسی سطر کو پڑھتے ہوئے وہ زیر لب مسکرانے لگتے۔ کوئی صفحہ اُن کی آنکھوں میں یادوں کے سمندر میں تیرتے ہوتے آنسوؤں کو جلوہ گر کر دیتا۔ آنسوؤں اور مسکراہٹوں کی دھوپ چھاؤں شیریں بی بی کو بڑی عجیب لگتی۔

گھر کی آمدن معقول تھی۔ قاضی صاحب کی پنشن اور قاقب کی اچھی خاصی تنخواہ اُن کی ضرورت سے زائد تھیں۔ قاقب کا کمرہ اب چمکانہ تصویروں سے خالی ہو گیا تھا۔ اب اس کمرے میں صادقین اور دوسرے معروف مصوروں کے خطاطی کے نمونے اُس کے عمدہ جمالیاتی ذوق کا احساس دلاتے تھے۔ تاریک راتیں، موسلا دھار بارشیں اور چوہدری صاحب کے کتوں کے شکار اب قاقب کو خوفزدہ نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف چوہدری صاحب کی بیٹی بھی سیاسیات میں ایم اے کرنے کے بعد مقامی گزٹ کالج میں لیکچرار مقرر ہو گئی تھی۔

اس مرتبہ جب سردیوں کی موسلا دھار بارشیں تھیں تو گلابی جاڑے نے سخن میں طمانیں کس دیں۔ کچھ دن اور گزرے تو ماحول میں ہنستی رنگ بھلنے لگا۔ 23 فروری کو

شہر میں ہنست منائی گئی۔ محلے کے سارے نوجوان چھتوں پر چڑھ دوڑے۔ پچھلیں اڑائی گئیں، بچ لڑائے گئے۔ قاریہ اپنی بہنوں اور کزنوں کے ساتھ ہنستی جوڑے میں خوب کھلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ قاقب نے جب قاریہ کو تمام نوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز دیکھا تو احساس رقابت کی وجہ سے اُس کا ناقہ اُنہ جائزہ لیے بغیر نہ رہ سکا۔ واقعی قاقب نے کافی وقت ضائع کیا تھا لیکن اب مزید وقت ضائع کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ قاقب نے ایسا بچ لگایا کہ چوہدری صاحب کی پتنگ چند ہفتوں میں قاضی صاحب کے خاموش آنگن کی زینت بن چکی تھی۔

قاضی صاحب اور شیریں بی بی خود سے ساتھ والے کمرے میں کھسک گئے اور اپنا کمرہ نئے جوڑے کو دے دیا۔ ابھی دلہن کے ہاتھوں کی مہندی نہیں اتری تھی کہ اچانک شیریں بی بی کے دل کی شریانیں سکڑنا شروع ہو گئیں۔ ذیابیطیس کا مرض تو اُن کو سالوں سے ہو چکا تھا۔ سادون شروع ہو گیا۔ چھتوں کے پرنا لے موسلا دھار بارشوں کے پانی کو راستہ نہ دے سکے اور یہ سادون کا پانی چھتوں کے ہیروں اور چمچوں کو عبور کر کے صحنوں میں گرنے لگا۔

ایک روز کمرہ کی کمر کی کے قریب اُداس اور دیران آنکھوں سے قاضی صاحب بھی بارش میں نہاتے ہوئے بوڑھ اور بوڑھے آم کے درختوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ شیریں بی بی کتنی دیر سے ان کے ساتھ کھڑی تھیں۔ قاضی صاحب کو متوجہ کرنے کے لیے شیریں بی بی نے پرانا ٹرا استعمال کیا۔ اپنی کمرہ ہوتی ہوئی دتشین آواز میں قاضی صاحب کے چاندی جیسے بالوں کو گدگداتے ہوئے گویا ہوئیں۔

تھے اپنی چادر سے میں ڈھانپ لوں زمین آسمان کچھ دکھائی نہ دے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا جو تھوڑی دیر بعد ہلکے سے قہقہہ میں تبدیل ہو گیا۔ چند دن قبل قاضی صاحب ساتھ والے محلے کے ایک حکیم سے بیگم کی گرتی ہوئی طبیعت کے بارے میں مشورہ کرنے گئے

اللہ پر یقین رکھو

مجھے خود پر بہت افسوس ہوتا ہے جب میں اپنا سر زمین کے نا خداؤں کے آگے جھکاتا ہوں لیکن اس اللہ کے آگے نہیں جھکاتا جو پوری کائنات کے ذرے ذرے کا مالک ہے جب مسجد سے آواز آتی ہے تو علی الفلاح آؤ کامیابی کی طرف میں یہ آواز من کر بھی نہیں جانتا کیوں آخر کیوں کیا میں اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا۔ میں جو بھی کام کرتا ہوں میری یہی سوچ ہوتی ہے جس کا میں نے کام کیا ہے وہی شخص مجھے پیسے دے گا۔ میں اللہ پر یقین کیوں نہیں رکھتا؟ جب مجھے اللہ پر یقین آ جائے گا تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

(راشد لطیف صبرے والا، ملتان)

اندرونی گزرتا ہے۔ اے حمید کے ساتھ ساتھ ہارڈی کے اردو کے ترجمہ شدہ ناول اور مختل فریم والی ایک تصویر قاضی صاحب کی کل کائنات ہے۔ بڑھاپے نے اُن کی جوانی والی اہمیت، حوصلہ اور بہادری کا قلع قمع کر دیا تھا۔ کل سی آہٹ بھی اُن کو ڈرا کر رکھ دیتی ہے۔

دسمبر کی ایک بے رات کو قاضی صاحب اور قاضیہ رات دیر گئے کسی تقریب سے لوٹے اور آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔ قاضی صاحب نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے میاں بیوی کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے غلام گردش میں سے گزر کر کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ کبھی ایسے ہی جوش و ولولہ کے ساتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر قاضی صاحب اور شیریں بی بی غلام گردش میں گردش کیا کرتے تھے۔ جب ننھا قاضی صاحب نے انجانے خوف و ہراس میں جکڑی زندگی گزار رہا تھا اور حسرت بھری نگاہوں سے اپنی کوٹھری کی سلاخ دار کھڑکیوں سے والدین کی آزاد، مطمئن اور بے خوف زندگی کو دیکھا کرتا تھا۔

نصف شب ہونے کو ہے۔ قاضی صاحب کو دسمبر کی بے راتوں کی خوفناک خاموشی سونے نہیں دے رہی۔

تھے۔ حکم صاحب نے صبح اور رات سونے سے پہلے شہد کے ساتھ میں میں دانے ہادام کی غذا تجویز کی۔ جب اس دیکھی دوا کا وقت آتا قاضی صاحب بڑے اہتمام سے ایک ایک دانہ گن کر شیریں بی بی کو کھانے ہادام کھلاتے جیسے چڑیا اپنے بچوں کو چوگا ڈالتی ہے۔

ایک روز قاضی صاحب عصر کی نماز ادا کرنے مسجد میں گئے ہوئے تھے۔ قاریہ اپنے کمرے میں پرچوں کی مارنگ کر رہی ہے۔ قاضی صاحب دفتر سے نہیں آیا۔ چاک شیریں بی بی کی ہلکی سی چیخ بلند ہوئی۔ قاریہ بھاگتی ہوئی آئی اور دیکھا کہ آرام کرسی پر شیریں بی بی بڑے بے سکون انداز میں ابدی نیند سو رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد قاضی صاحب مار مار کر رو رہا تھا۔ قاضی صاحب نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ شاید اس وجہ سے کہ انہوں نے آنسوؤں کا محدود ذخیرہ مرتے دم تک آہستہ آہستہ لٹا دیا تھا۔

درخت اپنے بچے اتار چکے ہیں۔ رات کے وقت ہواؤں کے جھکڑ خشک پتوں کی خوب دوڑ لگوار ہے ہیں۔ شدید سردیوں نے ویران حویلی کے کینوں کو کمروں میں مقید کر رکھا ہے۔ قاضی صاحب اور قاریہ پچھلے اتوار کو کچھ پانچ پانچ خرید کر لائے تھے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے فریج پر بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے میں سجا دیا گیا ہے۔ دونوں میاں بیوی بڑے احترام سے قاضی صاحب کا بستر اور کتا میں غلام گردش سے دوسری طرف والے ستور میں منتقل کر رہے ہیں۔ قاضی صاحب بے سکون چہرے سے ساری کارروائی دیکھ رہے ہیں۔ قاریہ جیسے ہی ان کی طرف پڑی شیریں بی بی کی خوبصورت لہریں میں لگی تصویر ہٹائی ہے تو اسے ایک بندر والی نظر آتا ہے۔ قاضی صاحب سے پوچھ کر جب وہ جلدی جلدی رومال کو کھولتی ہے تو ہادام کی گریباں نیچے گر جاتی ہیں۔ میاں بیوی کو قاضی صاحب کی چپکے چپکے اس خوش خوراکی کے عمل پر ہنس آ جاتی ہے۔ قاضی صاحب فوراً ہادام کی گریبوں کو بچوں کی طرح پیریاں چنے والے انداز سے اپنے جیب کے اندر ڈال کر محفوظ کر لیتے ہیں۔

قاضی صاحب کا زیادہ وقت ستور نما بیڈ روم کے

قاضی صاحب شیریں بی بی کی طرف حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتے دیکھتے گلے شکوہوں میں لگ گئے۔

شیریں..... اور میری شیریں! میں نے کیا بکاڑا تھا تیرا؟

کیوں مجھے زہر کا ٹکا لگا کر..... میری جھوک جاہ کر کے میرے گھر سے نکل گئی؟

میری عمر بھر کی محبتوں کا اجماع ملد پاٹو نے۔ کب بلا رہی ہو مجھے اپنے پاس؟ آنکھیں کیوں پکڑ رہی ہو؟

اس کوٹھری کی وجہ سے؟ ناں میری شیریں! ناں! میں اس کوٹھری میں خوش ہوں۔ اس بڑے کمرے میں تیری خوشبو،

تیری یادیں کہاں مجھے سونے دیتی تھیں۔ میرا بیٹا اور بہو بہت اچھے ہیں کہ انہوں نے میری خاطر اس بڑے کمرے میں رہائش اختیار کر لی۔ ہاں ایک بات بتانی ہے تم کو۔

میں نے تمہارا شہد اور بادام سنبھال رکھا ہے۔ تمہاری صرف دو خوراکیں باقی ہیں۔ حکیم صاحب کہتے ہیں کہ

خوراک مکمل ہوتے ہی تم بالکل صحت مند ہو جاؤ گی۔ دیکھو میں نے تمہاری کتابیں، کپڑے اور وہ انگلیشی بھی سنبھال

رکھی ہے جو شادی سے پہلے میں نے تم کو تحفہ میں دی تھی۔ روزانہ صبح قاقب چائے کا کپ اور ڈبل روٹی کا

روایتی ناشتہ بابا جی کی کوٹھری میں لے کر آتا۔ چند دنوں سے قاقب محسوس کر رہا تھا کہ قاضی صاحب کی آنکھیں

سُرخ ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک روز صبح ناشتہ دیتے وقت قاقب نے اس کی وجہ پوچھ لی۔

قاضی صاحب نے کہا۔ ”بیٹے جاتی اور تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ صرف رات کو یہ چوہدری صاحب کا کتا

چھت پر دوڑتا ہے تو آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر نیند نہیں آتی۔ ٹو ایک مہربانی کر ہماری چھتوں کے ساتھ ایک چھوٹا

ساجنگلا بنوادے۔ تاکہ کتا میری بے سکون نیند کو خراب نہ کر سکے۔“ قاقب نے کہا جی اب بہت جلد یہ کام ہو جائے گا۔

قاقب اور قادیہ بہت مصروف زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن اس مصروفیت میں بھی ایک قسم کی طمانیت موجود

تھی۔ زندگی کی گونا گوں مصروفیات کی وجہ سے چھتوں کے

اوپر دیواریں کھڑی نہ ہو سکیں۔ اب قاضی صاحب نے بھی اپنے مسئلہ کا حل نکال لیا تھا۔ ان کی نیند کا دشمن چوہدری

صاحب کا بل میرٹیر کتا تھا جو رات بھر جاگا کرتا اور بلیوں کو چھتوں پر بھاگائے رکھتا۔ لیکن دن چڑھتے ہی اپنے لئے

بنائی گئی مخصوص کوٹھری میں سو جاتا۔ چوہدری صاحب کا بیٹا صبح اس جانور کو ایک پیالے میں دودھ اور ڈبل روٹی کے

چند ٹکڑے ڈال جاتا۔ یہ ناشتہ کرتے ہی وہ سو جاتا۔ دن بھر اس کی آواز کوئی نہ سنتا۔ اب قاضی صاحب نے بھی

جگ راتوں کی کمی دن کو سو کر پوری کرنا شروع کر دی۔ آنکھوں کی سُرخمی ختم ہو گئی۔ رحمت بیٹے نے بھی سکون کا

سانس لیا کہ چلو ابوی گشہ نیندیں لوٹ آئی ہیں۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ کتے نے جانے کون سی

چیز دیکھ لی اور دیوانہ وار چھتوں کے چکر لگانا شروع کر دیئے۔ قاضی صاحب جس کوٹھری میں سوئے ہوئے تھے، اس کی

چھت پرانی ہونے کی وجہ سے بوسیدہ ہو چکی تھی اور کتا بھی رات بھر اپنے پنجوں سے اس کی مٹی کریدتا رہتا تھا۔ اچانک

کتے کے بوجھ کی وجہ سے کوٹھری کی دو اینٹیں نیچے گر گئیں۔ ایک اینٹ قاضی صاحب کے پاؤں پر آن گری۔ پاؤں کی

ہڈی کے ٹوٹ جانے کی آہل سے آواز پیدا ہوئی۔ پاؤں کی دو انگلیوں سے خون جاری ہو گیا۔ کتے نے بھی سوزناغ کے

قریب ڈیرہ لگا لیا اور ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد تھوٹھنی اندر ڈال کر بھاؤں بھاؤں کرنے لگ جاتا۔ قاضی صاحب شدید

درد کرب کے عالم میں بمشکل بستر سے اٹھے۔ غلام گروش کو عیور کر کے سامنے والے کمرے پر دستک دینے ہی والے

تھے کہ اچانک اُن کے ہاتھ رک گئے۔ ان کے لاشعور سے ایک یاد لپک کر شعور میں آ گئی۔ انہیں ایسی ہی ایک رات یاد آ

گئی جب وہ اپنی محبوب بیوی شیریں کے ساتھ گرم لحاف میں مزے کی نیند سو رہے تھے اور باہر سخت سردی میں تھا قاقب

خوف کے مارے دروازے پیٹ رہا تھا۔ وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح جھٹکے جھٹکے

قدموں سے واپس لوٹ گئے۔

انوکھا طریقہ شراب

کاش سینما سچ لکھوادیتا "سینما محرم اور ربیع الاول اور رمضان شریف
میں بند رہے گا" اس طرح اس کی جڑ میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔

☆ بشیر احمد بھٹی

ثواب حاصل ہوتا۔ یہ تو تھی حدیث پام، سبحان اللہ!
انسان کو اسلام میں بڑی رعایت ہے۔
اب آئیے! آپ کو اپنے شہر بہاولپور کا ایک
دلچسپ واقعہ سنا تا ہوں۔ ایک انسان کی عقل مندی کا
واقعہ جس نے مفت کی نیکیاں حاصل کرنے کا ایک
بہترین عمل کیا۔ آہ واقعہ پڑھ کر کافی محظوظ ہوں گے۔
کوئی دور تھا، جب سینما پر عروج ہوتا تھا۔ لوگ
جوق و جوق فلم بینی کا شوق پورا کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو ہر
سینما پر تماشا بینوں کا غلطیوں کا مارنا سمندر رش کی صورت
میں نظر آتا تھا۔ ہمارے شہر میں یوں تو کئی سینما گھر تھے
جن کے نام یہ ہیں۔ عباسیہ ٹائیکز، رین یو، ریوالی،

انسان کی اپنی سوچ فائدے کا کچھ نہ کچھ درجہ
ہر رکھتی ہے۔ اک اسلامی واقعہ پڑھا تھا کہ ایک
مختص مکان بنوا رہا تھا۔ روشن دالوں تک مکان تعمیر ہو چکا
تھا۔ سرکار کا وہاں سے گزر ہوا۔ آپ نے اس شخص سے
پوچھا۔ یہ روشن دان کس کام آئیں گے۔ مکان کے
مالک نے عرض کی۔ سرکار ان روشن دالوں سے تازہ ہوا
آئے گی۔ آپ نے تبسم فرمایا اور اس مالک مکان سے
فرمایا۔ اگر تم یہ کہہ دیتے کہ ان روشن دالوں سے اذان کی
آواز آئے گی تو تمہارے اعمال نامے میں نیکیاں لکھ دی
جاتیں۔ تازہ ہوانے تو ہر حال میں آتا ہے۔ تمہیں اس
نیت کا کہ ان سے آذان کی آواز آئے گی۔ مفت میں

فلمیں دکھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اپریل تو ویسے بھی کاٹ چھانٹ کے باہر ہوتے ہیں، کئی پمپ فلموں نے عوام کا مزہ کرکرا کیا تو وہ ایک ٹکٹ میں دو فلموں سے بھی بدظن ہو گئے۔

اب عالم یہ تھا کہ ٹکٹ کھڑکی سے بند کر دیا گیا۔ سینما کے پوسٹروں والے برآمدے کے سامنے کرسیاں بچھا کر عجلہ بیٹھ جاتا اور ٹکٹ کی کاپیاں تھال میں رکھ کے فروخت کرتے۔ اکا دکا تماشائی سینما ایریا میں داخل ہوتا، تماشائیوں کی عادت ہوتی ہے۔ ٹکٹ خریدنے سے پہلے پوسٹر جو جالیوں میں نصب ہوتے ہیں ان کو دیکھتے ہیں، بعد میں ٹکٹ خریدتے ہیں۔ ٹکٹوں والی تھال برادری ہر آنے والے تماشائی کو مجبور کرتی کہ فوراً ٹکٹ لے لو۔ لائٹ گرنے والی ہے۔ یعنی سکرین پر تصویریں آنے والی ہیں۔ اُن کی اس بات سے فوراً اوپر کھنٹی بجتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا کہ فلم شروع ہونے والی۔ غلٹ میں ٹکٹ لے کر اندر جانے والے اندر جا کے مایوس ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ سیٹوں پر چند سرخی نظر آتے ہیں۔ دو تھرڈ کلاس میں بیٹھے ہیں تو تین فرسٹ کلاس میں اور ایک گیلری میں۔ جب کل چھ آدمی فلم دیکھنے والے ہوں گے تو بھجو بجلی کا بل بھی سینما انتظامیہ کے گلے میں پڑ گیا۔ ایسے میں کون پوری فلم دکھاتا ہے۔ الٹی سیدھی چند تصویریں دکھا کے دی اینڈ، اختتام کے حروف سامنے آ جاتے۔

اس طرح یار لوگوں نے سینما کے عروج کا بیڑہ غرق کیا ہے۔ لوگ اب سینماؤں سے مکمل طوط پر ہی بدظن ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی ہم ماضی پر ایک نظر ڈالیں تو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ عوام پر خصوصاً غریب عوام پر سینما کی چار دیواری میں بڑے ظلم ہوئے ہیں۔ لاہور کے بڑے بڑے ایکٹروں اور کلاکاروں کی کوشیوں میں غریب عوام کا خون پسینہ لگا ہوا ہے۔ غریب عوام کو ٹکٹوں کے حصول کے لئے پولیس کے ادنیٰ سے سپاہی کے ڈنڈے

فالوس، بیراڈائیز، شمع، چیلکن، کسان سینما یہ بھی عرض کرتا چلوں ان میں قدیم سینما عہدہ ناکیز تھا یا پھر ریوالی سینما تھا۔ جو ریلوے سٹیشن کے قریب ریلوے لائنوں کے پار تھا۔ اس سینما پر دوری کی وجہ سے لوگ بہت کم جاتے تھے۔ اس سینما کا مالک منیجر تبدیل کرتا رہتا تھا۔ اس کا پرانا نام ریوالی تھا پھر اس کا نام منم رکھا گیا۔ بعد میں اس کو روہی سینما کا نام دیا گیا۔ سینما شہر سے باہر تھا اس لئے نقصان میں جا رہا تھا۔ خصوصاً سردیوں میں لوگ سردی کی وجہ سے اس طرف کا رخ کم ہی کرتے تھے۔

کسی دور میں مجھے یاد ہے ذرا ذرا اس پر بلیک اینڈ وائٹ فلمیں چلتی تھیں۔ جن پیارا، جند جان وغیرہ۔ کسان سینما بستی جمانیاں جو اب جدید بڑی کالونی ہے، اس کے بار بغداد سٹیشن روڈ پر کھیتوں میں بنایا گیا تھا۔ قریب ہی شیخیم کے درخت تھے۔ پہلے روز افتتاحی فلم چلی اور وہ بھی مغرب کے بعد جب اندھیرا ہو گیا کیونکہ سینما کی چھت نہیں تھی۔ روپے پیسے کی بھی لوگوں کے پاس کی تھی اس لئے کئی جیالوں نے درختوں پر چڑھ کے پہلا شومفت میں دیکھا۔ غالباً فلم نغمہ اور حبیب کی تھی۔ یہ جوڑی کسی دور میں مقبول تھی۔ کسان سینما تو چند روز ہی چلا پھر بند ہو گیا۔ درختوں کی وجہ سے لوگ بغیر ٹکٹ فلم دیکھ لیتے تھے جس کی وجہ سے سینما انتظامیہ کو خسارہ ہوا تو سینما بند کر دیا گیا۔ بعد میں آہستہ آہستہ دیو قامت دیواروں کی بنائیں بھی غائب ہو گئیں۔ روہی سینما نے بعد میں چائنا کی ایکشن فلموں کا سہارا لیا۔ انگلش فلمیں بھی چلتی رہیں۔ پھر وہ بھی بند ہو گیا۔

کئی سینماؤں پر گیت مالا اور ہمراہ سائیڈ پروگرام بھی دکھائے گئے لیکن عوام کو آہستہ آہستہ ڈش ایشیا اور کیبل نے سینما بھلوا دیئے۔ فالوس سینما کو توڑ کے وہاں کاروباری پلازہ بنا دیا گیا۔ بیراڈائیز سینما بھی ختم ہو گیا۔ پلاٹ میں لنڈا بازار بن گیا۔ شمع سینما پر ایک ٹکٹ میں دو

”داستان مردانِ خُرکی“

اندلس کی ناگن

عنایت اللہ کے قلم سے

- شراب کے اُس جام کی کہانی جس میں ہسپانیہ کو غرق کرنے کی سازشیں کی گئیں
- اُن مردانِ خُرکی داستانیں جن کے خون کے قطرے سرزمینِ اندلس پر موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔
- اُن حسین ناگوں کے قصے جن کا زہر بالآخر اُلتے لبہ کو مسموم کر گیا۔

کتاب چھپ کر تیار ہے اپنے
آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

مکتبہ داستان

26 پیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ۔ لاہور

فون: 042-37356541

کھانے پڑتے تھے۔ غلیظ گالیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ رشتی کی وجہ سے لامحالہ قطار میں دھکم پیل سے بدھمی پیدا ہوتی تھی۔ دھکے کھانے پڑتے تھے۔ مظر گر جاتے تھے۔ جوتیاں ٹوٹ جاتی تھیں۔ جینیں کٹ جاتی تھیں۔ گھڑیوں کے چمبن ٹوٹ جاتے تھے۔ پولیس کے سپاہی ڈنڈے برساتے تھے۔ کھڑکی سے صرف دو گت دیے جاتے تھے۔ باقی گت سرعام بلک میں فروخت ہوتے تھے۔ پولیس کی موجودگی میں ہلکی گت فروخت کرتے تھے۔ پولیس والے اپنا حصہ وصول کرتے تھے۔ عوام کی خوب مٹی پلید ہو رہی تھی۔ خدا خدا کر کے عوام کی سینما انتظامیہ کے ظلم و ستم سے جان چھوٹی ہے۔

اب وہ بڑے مرے سے کیبل کے مرے لوٹ رہے ہیں جبکہ فلمی نگار خانوں کے مالکوں اور بڑے ایکٹروں کا یہ دعویٰ ہے کہ عوام ایک بار پھر سینما کا رخ کریں گے۔ یہ صرف اُن کے خیالی پلاؤ کی دہلیں ہیں جو انہوں نے تصور ہی تصور میں عارضی چلبھوں پر چڑھا رکھی ہیں۔ عوام اتنی بھی پاگل نہیں کہ دوبارہ پولیس کے ڈنڈے کھانے کے لئے اب سینما کا رخ کرے گی۔ کیبل کے ذریعے ہزاروں مختلف آئٹم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فلمیں، خبرنامے، گیت مالا، مزاحیہ پروگرام تو یہ سب چھوڑ کے عوام کو کیا پڑی ہے کہ صرف ایک فلم کی خاطر سینما پر ذلیل ہو۔

اب وہ دن ہوا ہو گئے جب سینما کے اشتہار پر لکھا ہوتا تھا ”ایڈوانس بکنگ جاری ہے“ اب کئی سینماؤں کو سٹیج ڈراموں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ہمارے شہر بہاولپور کا عباسیہ ٹائیکز بھی اب فلموں کی بجائے سٹیج ڈرامے دکھا رہا ہے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ فلاپ ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ گت مہنگے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے افضل خان عرف ربیو بھی ڈرامہ کرنے آیا تھا۔ معاوضہ نہ ملنے پر کانوں کو ہاتھ لگا کے بہاولپور سے گیا ہے کہ اب نہ آؤں

کا، بے وفا شہر میں۔

لگتا ہے بڑی نرمی ہے خدا کے قہر میں اس لئے تو
ٹھیکیدار گھبراتے نہیں اور رئیس پی جاتے ہیں۔ حقوق
العباد کا خیال نہیں کرتے۔ آخرت کا دم نہیں بھرتے۔ مال
کھا کے بھی ہارٹ اٹک سے نہیں مرتے۔

آئے! اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ
ایک سیانے شخص نے نیکیاں کمانے کا ایک انوکھا طریقہ
اپنایا۔ قارئین کو یاد ہو گا جب سینماؤں پر عمل عروج تھا تو
محرم کے مہینے میں دو دن سینما بند ہوتے تھے۔ محرم کا مہینہ
شروع ہوتا۔ فلمیں چلتی رہتی تھیں۔ محرم کی نو اور دس تاریخ
کو اعلانیہ محرم کے احترام میں سینما بند کر دیے جاتے
تھے۔ گیارہ محرم کو پھر فلمیں چلنا شروع ہو جاتی تھیں جو
پورے مہینے چلتی رہتی تھیں۔ ہمارے شہر بہاولپور میں بس
اڈے کے قریب (پرانی سبزی منڈی) روڈ پر ایک سینما
ہے جس کا نام گیرین سینما ہے۔ اس سینما کے لگت زیادہ
مہینے نہیں ہوتے تھے اس لئے اس سینما پر عوام کا زیادہ رش
ہوتا تھا۔ جتنا عرصہ بھی یہ سینما چلا ہے خوب بزنس ہوا
ہے۔ آخر وہی ہوا پرانا سودن لوہاں لوہاں، جہاں پرانے
سینما ہٹ گئے گیرین پر بھی زوال کا وقت آ گیا۔ موٹی
موٹی طوائفوں کی نکلی رانوں والے پوسٹر بھی لگائے گئے،
رقص بھی دکھائے گئے لیکن عوام بھی طوطا چشم ہے۔ آخر
طوطے کی طرح پھر سے اڑ گئی۔ پھر اظہارِ فلمیں بھی
چلائی گئیں لیکن کوئی حربہ کامیاب نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ
سموسوں اور بوتلوں والے ڈکاء اور بھی بھاگ گئے۔

میرا ایک دوست وحید ہے، وہ بھی وہاں کا ٹھیکیدار
تھا، سموسوں کا۔ وہ بھی ڈکان چھوڑ آیا ہے۔ اب فتح خان
بازار کی چڑھائی پر فروٹ چاٹ کی ڈکان کر رہا ہے۔
انیس جنوری 2014ء بروز اتوار میں سبزی منڈی روڈ پر
آ رہا تھا۔ گیرین سینما کے قریب سے گزرا تو بڑے گیٹ
کے ساتھ دیوار پر موٹا موٹا لکھا ہوا تھا۔ محرم کے احترام

میں محرم کے پورے مہینے سینما بند رہے گا۔ میں یہ تحریر پڑھ
کے ٹھٹک گیا اور سوچنے لگا۔ واہ بھئی واہ! کیا بات ہے۔
محرم کا یہ احترام تو واقعی قابل ستائش ہے۔ وہ بھی دور تھا جب
محرم میں صرف دو دن نو دس کو سینما بند ہوتے تھے۔ اب
احترام کا یہ عالم ہے کہ سینما پورا مہینہ بند کر دیا گیا ہے۔ یہ
تو بڑی ایمان افروز بات ہے۔ آخر حیرت تو ہوتی ہے۔
خوف خدا بھی کوئی چیز ہے۔ اگر اتنا خوشی انسان کے دل
میں جاگزیں ہو جائے تو یہ خوف ایمان دار ہونے کی
دلائل کرتا ہے۔ یہ اشتہار محرم کے مہینے کا تھا۔ اب تو خیر
سے ربیع الاول کی 17 تاریخ ہو چلی تھی۔ یعنی محرم کا مہینہ
گزر گیا تھا۔ ظاہر ہے اب سینما کو کھل جانا چاہئے تھا۔

میں تھوڑا سا آگے ہوا اور کھلے گیٹ سے اندر جھانکا
وہ برآمدہ سامنے ہی ہے جس میں پوسٹر لگے ہوتے ہیں،
میری نگاہ برآمدے کی اُن جالیوں پر گئی جس میں پوسٹر
لگے ہوتے تھے پوسٹر غائب تھے۔ جالیاں ویران تھیں۔
اندروں کی تھی۔ بندہ نہ بندے کی ذات۔ مجھے حیرت بھی
ہوئی اور سینما ٹیجر کی نیکی پر رشک بھی آیا۔ اب سوال یہ تھا
کہ محرم کا مہینہ تو ختم ہو چکا تھا جس کے احترام میں سینما
بند کیا گیا تھا۔ اب ربیع الاول کی سترہ تاریخ تھی، اب
نیک سینما کو دوبارہ کھل جانا چاہئے تھا مگر وہ ابھی تک بند
تھا۔ اندر ہو کا عالم طاری تھا۔ میں نے ذہن پر ڈرا سا زور
دیا تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ سینما مالک نے
جب دیکھا کہ فلمیں تو ویسے بھی فلاپ ہو رہی ہیں، لوگ
آنے کا نام نہیں لے رہے تو اس نے بورڈ آؤٹ کر دیا
کہ محرم کے پورے مہینے سینما احترام میں بند رہے گا۔ یہ
نیکل کمانے کے اس کے نیک خیالات تھے۔ اب لوگ تو
ویسے نہیں آ رہے تھے۔ کاش سینما منیجر لکھوا دیتا "سینما
محرم اور ربیع الاول اور رمضان شریف میں بند رہے گا"
اس طرح اس کی جڑا میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔



میں ذات کا ہر رنگ ہوں۔ البتہ نے حکومت دی ہے تو
بھاگتے کیوں ہو اطمینان اور فراغت سے زندگی بسر کئے جاؤ
بھگوان جسے جیسا چاہتے ہیں بنا دیتے ہیں۔ ان کی لیلیا اہم اپار ہے۔

روپ بہروپ



مظفر حسین ملک ایم۔ اے

☆

اپنی تقدیر پر قانع اور شاکر ہو چکے تھے لیکن پھر بھی رات کی
تہائیوں میں جب کبھی وہ ایک دوسرے سے دلجوئی اور
پیار کی باتیں کرتے تو اولاد سے محرومی کے تذکرے سے
باز نہ رہ سکتے۔

”البتہ کے پاس کیا کمی تھی جو ایک چاند سا بچہ ہمیں
بھی دے دیتا جو ہمارے گھر کی رونق اور ہمارے
بڑھاپے کا سہارا ہوتا۔“ لیلیا دلی نہایت مایوسی کے انداز

1817ء کی ایک صبح کو جب بنارس کے بڑے
مستی بازار میں گنگا دین چمار پر بھوکا نام جپتے ہوئے
حسب معمول اپنی دکان کھولنے کے لئے آیا تو وہ یہ دیکھ
کر حیران رہ گیا کہ پانچ چھ سال کا ایک خوبصورت لڑکا
اس کی دکان کے ٹھڑے پر پڑا سو رہا ہے۔ گنگا دین چمار
پچاس سال کی عمر میں بھی بے اولاد تھا۔ اس کی بیوی
لیلا دلی سن پاس کو پہنچ چکی تھی اور بظاہر دلوں میاں بیوی

سے کہتی۔

گنگا دین کو لیلادتی کی بے فہمی کا صدمہ اس سے کم نہ تھا لیکن پھر بھی وہ اپنی شریک حیات کی حوصلہ افزائی کے لئے "ایٹور کی مرضی" کا جملہ دہرا دیتا اور پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بات کا رخ کسی دوسری طرف موڑ دیتا۔ کبھی کبھی وہ کسی رشتہ دار یا ہمسائے کا بچہ لے کر پالنے کی تجویزیں بھی بناتے مگر یہ تجویزیں کسی نہ کسی بناء پر عملی جامہ سے محروم رہتیں۔

لڑکے کو دیکھتے ہی گنگا دین کے دل میں اولاد کی خواہش کے جذبات جاگ اٹھے اور اس نے نرمی سے بچے کو جگایا اور پوچھا کہ وہ کون ہے۔ لڑکا جاگا اور گنگا دین کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "میں چاند ہوں، میری ماں مجھے چاند کہا کرتی تھی۔"

"کہاں ہے تمہاری ماں؟" گنگا دین نے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ مر گئی ہے۔ چند دن ہوئے لوگوں نے اس کی لاش کو جلا دیا تھا۔" بچہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"اور تمہارا باپ کہاں ہے؟" گنگا دین نے اہل دردانہ لہجہ میں دریافت کیا۔

"میں نے اپنا باپ کبھی نہیں دیکھا۔ میری ماں کہا کرتی تھی کہ وہ بھگوان کے پاس میرے لئے کھلونے لینے گیا ہوا ہے۔" لڑکے نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارا کوئی اور بھی بہن بھائی ہے؟" گنگا دین کا لہجہ پہلے سے بھی اہل دردانہ تھا۔ لڑکے نے سسکتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے آنسوؤں کے قطرے گالوں اور ٹھونڈی پر سے ہوتے ہوئے اس کی میلی کرتی پر گر رہے تھے۔

لڑکا روئے جا رہا تھا اور گنگا دین اپنا جھریوں بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھے خاموش کھڑا تھا مگر اس کا ذہن عجیب کشش میں مبتلا تھا۔ ایک خوبصورت قیم بے یار و

مددگار لڑکا ایک بے اولاد گھر کی رونق کا سامان تو ضرور بن سکتا ہے مگر وہ چار سے اور لڑکا کیا معلوم کسی اونچی جاتی سے تعلق رکھتا ہو۔ آج ممکن ہے کوئی برہمن یا کھتری اسے گھر میں پناہ نہ دے مگر اسے جب ایک چمار نے اپنا لیا تو یہ معاملہ فرقہ وارانہ کشش کا باعث بن کر خطرہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ لڑکے کو اس کے حال پر چھوڑ کر ڈکان کھولے۔ وہ اس کے سر سے اپنا ہاتھ ہٹانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ دوبارہ لڑکے کے معصوم اور خوبصورت چہرے پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی لڑکے کو اپنانے کی خواہش فرقہ وارانہ فساد کے خطرے پر غالب آ گئی اور گنگا دین ڈکان کھولنے کی بجائے چاند کو لے کر اپنے گھر کی طرف ہو گیا۔

لیلادتی گھر کے آگن میں جھاڑو دے رہی تھی کہ خلاف معمول اپنے خاوند کو واپس آتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے گنگا دین کے گھر میں آئے تیس سال سے زیادہ گزر چکے تھے، وہ کبھی دوپہر کے کھانے سے پہلے ڈکان سے گھر واپس نہیں آیا تھا اور پھر یہ لڑکا کون ہے؟ اس نے اس سے پہلے تو اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ گنگا دین نے گھر میں قدم رکھتے ہی لیلادتی کو صبح کے واقعہ سے آگاہ کیا اور لڑکا اس کے حوالے کر کے ڈکان پر واپس چلا گیا۔ ٹھاکر ہر دت کے لڑکے کی شادی نزدیک آ رہی تھی اور بھوکے پاؤں کی جوتیاں ابھی تیار ہونا باقی تھیں، ٹھاکر صاحب کے آدمی روزانہ یاد دہانی کرا جاتے تھے۔

لیلادتی نے بچے کو دلاسا دیا۔ نسلی اور جوار کی روٹی کھانے کو دی اور پاس بیٹھ کر دلجوئی کی باتیں کرنے لگی۔ چاند بچے کی لیلادتی کے لئے چاند بن کر آیا وہ اس سے مادرانہ شفقت سے پیش آتی اور بھی اپنی آنکھ سے اوجھل جہنہ ہونے دیتی۔

ڈکان پر واپس جا کر گنگا دین نے بچے کے خاندان اور ورثہ کی تحقیقات کی غرض سے اکثر گاؤں اور

ہمیشہ اس تجویز کی مخالفت کرتی۔ وہ کہتی کہ بھگوان جانے یہ لڑکا کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور ہم اسے چھار کیوں بنائیں۔ جوان ہو کر اس شہر سے نکل جائے گا اور کہیں دور جا کر محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پال لے گا۔ ایثار کی دیا سے اگر اس کے بھاگ اچھے ہو گئے تو ہمارے احسان کو فراموش نہیں کرے گا۔ یہ اصل معلوم ہوتا ہے۔ یہ گفتگو اکثر چاند کے سامنے ہوتی اور غالباً اسی کا اثر تھا کہ وہ برہمن کے اسباق میں روز بروز زیادہ دلچسپی لیتا فور سے سنتا اور محنت سے یاد کرتا۔

1808ء میں لارڈ ولیم بینٹ گورنر جنرل ہو کر ہندوستان میں تشریف لائے۔ انہوں نے آتے ہی ٹنگی کے انسداد کی مہم شروع کی۔ ٹنگی کے جرم کے لئے سزائے موت تجویز ہوئی اور شہر بہ شہر منادی کی گئی کہ جو کسی ٹنگ کو پکڑوائے گا اسے خاطر خواہ انعام دیا جائے گا۔

یہ اعلان چاند نے بھی سن لیا۔ اب وہ اٹھارہ انیس برس کا نوجوان تھا کچھ کرنے اور کمانے کے ولولے سے سرشار اور جوانی کی جرأت سے مالا مال تھا۔ برہمن نے یا تو اپنے لڑکے سے مایوس ہو کر یا اپنا سرمایہ علم ختم ہو جانے کی وجہ سے اسباق کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ سوچا کہ اب وقت ہے کہ وہ اس شہر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دے اور پردیس میں جا کر قسمت آزمائی کرے۔ لیلاوتی اور گنگا دین سے مشورے ہوئے اور چند دن بعد چاند ایک گڑوی، ڈوری اور چند کپڑوں کی گٹھڑی لئے ایک قلع لکھنؤ کی سڑک پر سفر کر رہا تھا۔

بنارس سے ابھی چند میل حق دور گیا تھا کہ پیچھے سے دھبہ پیوں کی کڑکھڑ سنائی دی۔ چاند سڑک کو چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا وہ کچھ ٹکان محسوس کر رہا تھا۔ ابھی تک اس کے ذہن کی حالت کچھ غیر یقینی سی تھی وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ ٹنگوں کے متعلق جو حکایات اس نے سن رکھی تھیں وہ خاصی خوفناک تھیں اسے خطرہ تھا کہ

دوسرے ڈکانداروں سے تذکرہ کیا مگر کوئی پتہ نہ چل سکتے پر خاموش ہو گیا۔ اس طرح چاند کی پرورش جو خدا جانے کس خاندان کا چشم و چراغ تھا، ایک چھار کے گھر ہونے لگی۔

گنگا دین کا کچا مکان ایک برہمن کے محل سے متصل تھا۔ محل کے ساتھ یہ کوٹھالیوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ملک کے سامنے کوئی بھکاری بچہ کھڑا بھیک مانگ رہا ہو مگر قدرت کی ستم طرینی سے یہ محل اور جھوپڑا برسوں سے ہم نشین تھے۔ برہمن چھار کی مسائیلی کو ناپسند کرنے پر بھی برداشت کر رہا تھا کیونکہ گنگا دین اس کے کنبہ کے سب افراد کی جوتیوں کی ہرمت کی کوئی اجرت نہ لیتا تھا۔

برہمن کا ایک لڑکا تھا جو کندھلی میں اپنی مثال آپ تھا برہمن روزانہ اسے صبح سویرے بالا خانے میں بٹھا کر دیدوں سے منتر اور اشوک یاد کرواتا۔ سو سو دلہہ کھلواتا مگر اس نالائق کو کچھ نہ یاد ہوتا اور برہمن تھک کر اس محل کو دوسرے دن پر ملتی کر دیتا۔ اس بالا خانے کی ایک کھڑکی گنگا دین کے صحن کی طرف کھلتی تھی جہاں بیٹھ کر چاند مرغیوں کی مگرانی کیا کرتا تھا۔ خالی الذہن ہونے کے باعث اس کے کان برہمن کی آواز کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اس طرح وہ اسباق جو برہمن اپنے لڑکے کو دیتا تھا چاند اپنی خداداد ذہانت کی بناء پر اپنے ذہن میں مرغیاں ہنکاتے وقت یاد کر لیتا۔ کسی کو اس کا گمان بھی نہ تھا ورنہ اچھوت کے کانوں میں مقدس اشوک کی سماعت کے جرم میں پکھلا ہوا سیسہ بھرنے والوں کی اس دور میں کی نہ تھی۔

وقت گزرتا گیا گنگا دین نے کئی دلہہ اس خیال کا اظہار کیا کہ چاند ڈکان پر جا کر مرمت کے کام میں اس سے ہاتھ مٹائے اور نئے جوتے بنانا سیکھ لے کیونکہ اب وہ بوڑھا ہو رہا تھا اور چاند کو وہ اولاد کی طرح اسی لئے پال رہے تھے کہ بڑا ہو کر ان کی ضعیفی کا سہارا بنے۔ مگر لیلاوتی

ہوں۔ میرے پاس چند مجرب نسخے ہیں جو مختلف ڈبوں میں بند اس صندوق میں رکھے ہیں جس پر میں بیٹھا ہوں۔ تمہارے ذمے یہ کام ہوگا کہ جب میں مجمع لگا کر ادویات فروخت کرنے لگوں تو مجھے مختلف ڈبے جن کی طرف میں اشارہ کروں پکڑاتے جاؤ۔ فرصت کے اوقات میں ادویات پیتا اور تمہ کے بیلوں کی خبر گیری بھی تمہارے ذمہ ہوگی۔“

چاند کو یہ مشغلہ دلچسپ معلوم ہوا اور وہ یہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا وہ بھی دوائیاں کوٹنے کو نئے سنیا سی بن جائے گا؟

سادھو نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ میں نے بھی کسی زمانہ میں تمہاری طرح ایک سنیا سی سے یہی سوال کیا تھا اور جواب تمہارے سامنے ہے۔

مرٹھے اور سادھو کی گفتگو کی شیرینی چاند کے خدشات پر غالب آ چکی تھی اور وہ بخوشی سادھو کی ملازمت پر تیار ہو گیا۔

سادھو نے جسے اب چاند سنیا سی جی کے لقب سے مخاطب کر رہا تھا چاند کو شاہاش دیتے ہوئے اس کی ذہانت اور معاملہ فہمی کی تعریف کی اور بتایا کہ اگلا قصبہ نزدیک ہی ہے جہاں پہنچ کر وہ قدرے آرام کرنے اور کھانا کھانے کے بعد مجمع لگائیں گے۔

باتوں باتوں میں وہ قصبے میں پہنچ گئے۔ ایک سستی سی سرائے میں اترے بیلوں کے چارے اور پانی کے بعد انہوں نے فراغت سے کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد تیسرے پہر کے قریب سادھو نے اپنا صندوق کھولا اور چھ سات میلے میلے ڈبے اور ایک چمچی نکالی۔ ایک چھوٹے سے کنستری سے سیاہ روغن نکال کر اس میں اٹھ پلا اور دو چار مرے اور کھال اترے ہوئے سانڈے اس میں ڈال دیئے ایک بچہ کھولا اور اس میں سے خالی شیشیاں اور ڈبیاں نکالیں۔ پڑیاں باندھنے کے لئے ردی

کہیں وہ بھی ان کا شمار نہ ہو جائے۔ اگرچہ اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ کسی ٹھگ یا گروہ کا پتہ چلا کر اعلان کے مطابق انعام حاصل کرے مگر ظاہر ہے کہ اسے اس کام کا کوئی تجربہ نہ تھا وہ اس ذہنی کشش میں جلا سڑک کے کنارے کھڑا تھا کہ تمہ اس کے پاس آ کر رک گئی۔ تمہ میں گہرے کپڑے پہنے ایک سادھو سوار تھا اس نے چاند سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ چاند نے جواب دیا کہ وہ پیکار ہے اور تلاش معاش میں سرگرداں ہے۔ سادھو نے اسے تمہ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر اس پیشکش کو قبول کرنے پر چاند آمادہ نہ ہوا اور اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ سہا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سادھو نے اپنی پیشکش کو دہرایا کہ اسے تمہ میں سوار ہو کر اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے اور دوران سفر میں ملازمت کی شرائط طے کر لینی چاہئیں۔ اگر اسے سادھو کی پیش کردہ شرائط پر ملازمت منظور ہو تو بہتر ورنہ اسے اختیار ہوگا کہ اگلے شہر میں وہ تمہ سے اتر کر اپنی راہ لے، سادھو کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

اس تقریر سے چاند متاثر ہو کر نیم دلی سے تمہ میں سوار ہو گیا۔ سادھو نے اسے چاول کا مرٹھا کھانے کے لئے دیا اور اس طرح گفتگو کا آغاز کیا۔

”تمہارے چہرے پر ذہانت نمایاں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ فائدے میں رہو گے۔ میں تمہیں اتنی تنخواہ دے دوں گا جو نہ صرف تمہاری موجودہ ضروریات کے لئے کافی ہوگی بلکہ اگر ممکنہ دی سے کام لے کر پس انداز کرتے رہے تو مستقبل میں بھی آسائش سے بسر کر سکو گے۔“

چاند نے قدرے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کام کیا ہوگا۔“ اور مرٹھا کھانا شروع کر دیا۔ چاول اور گڑ کا استرجاع اسے بڑا لذیذ معلوم ہو رہا تھا۔

”جیسا کہ میرے لباس سے ظاہر ہے میں سنیا سی

اوٹ میں ہو گئے۔

اب سادھو نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

”صاحبو! میں سنیاسی ہوں۔ چودہ سال گورو

گورو کھناجھ کے ساتھ نیپال کی پہاڑیوں میں گھوما ہوں۔

اس سیر کے دوران میں دیوتاؤں کی سرزمین اور اگنی کنڈ

میں بھی جانا ہوا۔ سرب ناگ دیوتا سے بھی ملاقات ہوئی۔

جڑی بوٹیوں کی دوا بھی شریمان گورو جی سے سیکھی اور

اب کچھ خدمتِ خلق کی خاطر اور کچھ گورو جی کے فرمان کو

پورا کرنے کے لئے شہر بہ شہر گھوم رہا ہوں تاکہ آپ کے

دکھوں میں کمی ہو، بیماری اور کمزوری کی جڑ کٹ جائے اور

روگ کا ناش ہو جائے۔“

اس کے بعد اس نے ہندی کی قسم کی ایک گانٹھ ایک

لہے سے نکالی اور مجمع کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”یہ

جڑی گورو جی نے سرب ناگ دیوتا سے لے کر دی تھی۔

اس کی خاصیت یہ ہے کہ ذرا سے پانی میں رگڑ کر رات کو

کانٹھ اور ڈبوں میں سے ادویات نکالنے کے لئے خالی

تھپے درست کئے اور سرائے کے باہر سڑک کے کنارے

لے جا کر انہیں آراستہ کیا۔ چاند بھی ایک ہونہار شاگرد

اور فرمانبردار نوکر کی طرح چیزیں اٹھا کر سڑک تک

پہنچانے اور ان کی حفاظت میں بڑی مستعدی دکھاتا رہا۔

ادویات کو سجا کر رکھنے کے بعد سنیاسی اٹھ کر کھڑا ہو

گیا اور چند منتر چنے لگا۔ چاند نے محسوس کیا کہ سادھو کا

تلفظ اور لب و لہجہ بہت زیادہ نفاذ ہے مگر چونکہ اس کی اپنی

تعلیم بھی باقاعدہ نہ تھی اس لئے چپ ہو رہا۔

راہ چلتے لوگ جن میں بچے، بوڑھے، جوان،

تمہارت پیشہ، ملازمین، طالب علم، امیر غریب فرض ہر قسم

کے لوگ شامل تھے، سادھو کے گرد جمع ہو گئے۔ اب سادھو

نے منتر بند کر کے لطفیے اور پھبتیاں کہنی شروع کر دیں اور

پھر تالیف لڑکوں کو مجمع سے ملے جانے کے لئے کہا۔ جن

میں سے بعض تو چلے گئے اور بعض بڑی عمر کے لوگوں کی

الریاضین

20۔ اے سال انڈسٹریل اسٹیٹ، جی ٹی روڈ، گجرات

Ph: 053-3521253-3532224-3532225. Fax: 053-3535224

سرے کی جگہ چون دے دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے۔
یا ارٹھی کے تیل کو کالا کر کے اس میں چڑھ اتر اہوا ساڑا
ڈال دیا جائے تو وہ ساڑے کا تیل ہو جاتا ہے۔ یا
سپہاں اور گھونگھے طبی اصطلاح میں سچے موتی اور گرہیں
ریچھ اور شیر کی چربی کہلاتی ہے۔ ہر دوا دوسری دوا کا بدل
اور ہر مرض کے لئے باعث شفا ہو سکتی ہے اور سب سے
بڑھ کر یہ کہ اس شہر یا قصبہ میں دوبارہ نہیں جانا چاہئے
جس میں کہ ایک دفعہ جمع لگا یا جا چکا ہو۔

لیکن ایک دفعہ یہ غلطی ہو گئی اور وہ کسی ایسے قصبے
میں جا نکلے جہاں سنیا سی جی زیورات اور روپے دگنے کر
چکے تھے۔ سنیا سی کو دیکھتے ہی لوگوں میں چہ میگوئیاں
ہوئیں اور اس سے جیستر کہ وہ راہ فرار اختیار کرتے
دیہاتیوں نے رحمہ اور بیلوں پر قبضہ کر لیا کچھ لوگوں نے
سنیا سی جی کے کپڑے اتار لئے۔ کسی نے لہجوں اور
گھڑیوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ وہ خوش معلوم ہوتے
تھے کیونکہ نقدی اور زیورات کی شکل میں جوگی کی بچھوں
سے اس قدر مال برآمد ہو گیا تھا کہ اس نقصان سے کئی گنا
زیادہ تھا جو روپے دگنے کرانے کے شوق میں وہ برداشت
کر چکے تھے۔ دیہاتیوں کو نقد و جنس کی تقسیم میں محویت
سے مشغول دیکھ کر چاند اپنے مالک کی پروا کئے بغیر ایک
طرف کھسک گیا اور جب دیکھا کہ وہ محفوظ فاصلہ پر پہنچ
چکا ہے تو اطمینان سے دوسرے قصبے کی راہ لی۔ کافی فاصلہ
طے کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ شاید جوگی بھی ٹھک
تھا اور اگر وہ اسے پکڑ دیتا تو انعام پاتا اور پھر اس نے یہ
سوچا کہ اگر وہ خود بھی دیہاتیوں کے ہاتھ آ جاتا تو وہ دو
ٹھکوں کے پکڑوانے کا انعام پاتے۔

وہ یہ سوچتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ لکھنؤ
پہنچ گیا۔ یہاں اسے ایک بننے کے پاس ملازمت مل گئی۔
ہنیا دستہ کار دوبارہ کا مالک تھا۔ اشیائے خوردنی کی تجارت
کرتا تھا۔

سوتے وقت آنکھ میں لگائے تو اندھا نظر پائے کمزور
بیٹائی والے کی بیٹائی تیز ہو اور تندرست آنکھ ہر روگ اور
بیماری سے محفوظ رہے۔

”صاحبو! میں اس کی کوئی قیمت نہیں لینا چاہتا مگر
اس کو خالص حالت میں استعمال کرنا آپ لوگوں کے بس
کی بات نہیں۔ آپ دنیا دار لوگ پاپ اور کشت کے جنم
بھوگ رہے ہیں اور اسے خالص استعمال نہیں کر سکتے۔
چنانچہ اس کی شدت کو کم کرنے کے لئے اسے سچے موتیوں
اور جواہرات کے ساتھ ملا کر پیش لیا گیا ہے۔ پیتے وقت
مقدس ویدوں کے منتر چنے پڑتے ہیں اور پہاڑوں کی
گھاٹوں میں چلے کٹی کر لی پڑتی ہے۔ اگر میں قیمت نہ
لوں تو سچے موتی کہاں سے خریدوں۔ اس لئے میرے
دوستو! اس کی لاگت وصول کرنے اور دنیا کی بھلائی کا
سلسلہ جاری رکھنے کے لئے اس کی مناسب قیمت کہنی
بہادر کا ایک روپیہ فی شیشی رکھی گئی ہے جن دوستوں کو
ضرورت ہو ہاتھ کھڑا کر دیں۔“

چھ سات آدمیوں نے ہاتھ کھڑے کئے اور چاند
نے سنیا سی کی ہدایت کے مطابق چھ سات شیشیاں بھر کر
ان کے ہاتھ میں دے دیں اور اسی قدر روپے جوگی کی
جیب میں جھنکار تے ہوئے داخل ہو گئے۔

سرے کے بعد چورن اور چورن کے بعد درودوں
کی دوا لپی گئی۔ سنیا سی اور دوا کے شاہکار ساڑے کے
تیل کی باری آئی جس میں ریچھ اور شیر کی چربی کے علاوہ
دیوتاؤں کی پسندیدہ اور مقبول بوٹیوں کا جوہر بھی شامل تھا
وہ اس قدر بکا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس قصبہ کی تمام مرد
آبادی کو اس تیل کی ضرورت ہے۔

دن گزرتے گئے، سنیا سی اور اس کا شاگرد ایک
قصبے سے دوسرے قصبے اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں
کھوتے رہے۔ اس دوران میں چاند پر اس پیشہ کے کئی
اسرار و رموز منکشف ہوئے مثلاً اگر چورن کی جگہ مرصا اور

روشن باتیں

☆ فرمان رسول ﷺ: قیامت کے دن یقیناً اللہ کے نزدیک وہ شخص سب سے بُرا شمار ہوگا جسے لوگوں نے اس کی بدزبانی کی وجہ سے چھوڑ دیا ہو۔ (نبیلہ نازش)

☆ زمین کے اوپر عاجزی کے ساتھ رہنا سیکھ لو، زمین کے نیچے سکون سے رہ پاؤ گے۔

☆ دل میں برائی رکھنے سے بہتر ہے کہ ناراضگی ظاہر کر دو۔ (ممتاز - سرگودھا)

مال کی عقلی اور بننے کی گرفتاری کے لئے پہنچ گئے لیکن ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ مال بحق سرکار ضبط کرنے سے پہلے جس قدر قیمتی اسباب ان کے اپنے گھروں میں پہنچ جائے وہی قیمت ہے۔ چنانچہ ہر ایک کو اپنی خواہش کی تکمیل میں مجبور کیا گیا کہ چاند نے وہاں سے بھی راولپنڈی اختیار کی اور پتہ پتہ لکھنؤ سے باہر ہو گیا۔

اس کے بعد اسے جن واقعات سے دوچار ہونا پڑا اس کی تفصیل کسی آئندہ موقع پر اٹھا رکھتے ہوئے آج صرف اس قدر بتایا جاسکتا ہے کہ وہ گھومتا پھرتا وسط ہند کی ایک ریاست میں پہنچا۔ اس نے سوچا کہ دنیا میں جس قدر پیسے ہیں ان سب میں کسی نہ کسی حد تک ٹھکی ضرور ہے اور خطرہ سے خالی نہیں۔ بہتر ہے کہ اس علم کی تکمیل کی جائے جو بچپن میں اتفاقی طور پر حاصل ہوا تھا اور باقی عمر پوجا پاٹ میں بسر کر دی جائے چنانچہ اس نے برہمن کا روپ اختیار کیا اور کسی استاد کمال کا متلاشی ہوا۔

مختلف مندروں اور پانچ شالوں کا چکر لگاتے ہوئے اس کی رسائی شاعر دربار کے برہمن تک ہو گئی۔ درباری برہمن اب بڑھا ہو چکا تھا اس کے ہاں صرف ایک لڑکی تھی جو بڑی حیزی سے بچپن کی منزیلیں طے کرتی ہوئی جوانی کی دایلوں میں داخل ہو رہی تھی۔ چاند کی

یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ کا عہد تھا۔ شاہی محل کے توشہ خانے کا سارا مال اسی بننے کی معرفت منگایا جاتا تھا وہ اپنے پیسے کے اسرار و رموز کی بہت نگہداشت کرتا تھا۔ مگر چاند کو سختی اور دیانتدار ملازم سمجھ کر اس نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا مثلاً ہندی میں اگر نصف سے زیادہ اینٹیں پسوا دی جائیں تو ایک چھٹائی فی من کے حساب سے پیلا رنگ ضرور ملا لینا چاہئے۔ اگر کسی جنس کو توشہ خانے کا دار و فہ پسند نہ کرے تو اسے اس کی قیمت کا پانچ فی صدی پیشگی دے دینا چاہئے لیکن مال دیتے وقت وزن بے شک دس فی صد کم ہو کیونکہ ایسی صورت میں دار و فہ صاحب مال تولنے میں زیادہ محتاط نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے عہدہ داروں کی بھی بعض ضروریات ایسی ہوتی ہیں جو ہم لوگوں کی مدد کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں ایسے لوگوں کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔

چاند کا وقت نہایت اطمینان سے گزر رہا تھا کہ ایک دن بننے کو خرید و فروخت کے سلسلے میں باہر جانا پڑا اس کی عدم موجودگی میں باہر سے کافی مقدار میں بھی آ گیا۔ کارندوں کو قائل کیا اس کا دستِ علم ہو گیا تھا کہ بنیا ان ایام میں لکھنؤ سے باہر ہو گا انہوں نے بھی میں پچاس فیصد ملاوٹ کر دی۔ چاند اس ملاوٹ شدہ گھی کو پہچان نہ سکا اور اپنے گودام میں اس نے بھی حسب معمول گھی کی مقدار کے برابر اس میں ملاوٹ کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح سے جو مواد تیار ہوا اس میں خالص گھی کس قدر تھا اس کے اندازے کے لئے اس عہد میں کوئی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

بد قسمتی سے یہی مواد توشہ خانہ سے ہوتا ہوا شاہی دسترخوان پر پہنچ گیا۔ توشہ خانے کا دار و فہ تو ملازمت سے برخاستگی پر ہی چھوٹ گیا مگر بننے کے لئے سزائے قید اور سب جائداد کے بحق سرکار ضبط ہونے کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ بنیا ابھی لکھنؤ تک نہ پہنچا تھا کہ سرکاری کارندے

ذہانت، دیانت اور محنت نے برہمن کے دل پر اس قدر اثر کیا کہ اس نے نہ صرف اسے گوہر تعلیم سے مالا مال کیا بلکہ خانہ داماد بنا کر اپنے گھر رکھ لیا۔

چاند اب قسمت کی بلند یوں پر تھا۔ اس کے ایام نہایت اطمینان اور فراغت سے بسر ہو رہے تھے۔ اسے اگر کوئی دکھ تھا تو یہ تھا کہ وہ غریب چمار اور چمارن جنہوں نے اسے کمال محنت اور شفقت سے پالا تھا اس کی دولت میں کسی طرح حصہ دار نہ ہو سکتے تھے وہ انہیں با آسانی بلا سکتا تھا یا روپیہ بذریعہ ڈاک یا کسی اور واسطہ سے ارسال کر سکتا تھا مگر اس طرح راز افشا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اگر یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ نقلی برہمن تھا یا اس کی پرورش چماروں کے گھر ہوئی تھی تو مہاراجہ کا غضب نہ صرف اسے بلکہ اس کے سسرال کو بھی تباہ و برباد کر دیتا۔

وہ اسی فکر میں تھا کہ اس نے ایک دن ایک بڑھے چمار کو بازار میں "جوتا، بوٹ مرمت" کی صدا لگاتے ہوئے سنا۔ اسے اس کی آواز آشنا معلوم ہوئی۔ پاس جا کر دیکھا تو گنگا دین تھا۔ "ارے یہ کیا غضب ہوا" وہ دیکھ کر گھبرا گیا مگر اس نے میں گنگا دین بھی اسے پہچان چکا تھا۔ چاند اسے ایک طرف لے گیا۔ شاہی برہمن کے داماد کا ایک چمار سے گفتگو کرنا بہت معیوب امر تھا مگر مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے وہ اسے ساتھ لے کر شہر سے باہر نکل آیا۔ خیریت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ لیلادتی کا انتقال ہو چکا ہے اور گنگا دین کی دکان تباہ ہو جانے کا وجہ سے وہ اب شہر شہر گھوم کر جوتے مرمت کر کے روٹی کماتا ہے اور ساتھ ساتھ چاند کی باتیں بھی کرتا ہے۔

اتنے میں وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ چاند نے گنگا دین کو وہاں بٹھایا اور کہا کہ وہ اپنے چماروں والے تمام ہتھیار دریا میں پھینک دے اور غسل کرے۔ اتنے میں وہ نئے کپڑے لے کر واپس آ جائے گا جنہیں برہمن کر گنگا دین اپنے سہیلیوں کے گھر چلے اور اپنی بہو کو آشیر باد

دے۔ پروگرام کے مطابق چاند نئے کپڑے لے کر دریا پر پہنچا اور دیکھا کہ گنگا دین نہا چکا ہے اور تھوڑے سے دھاگے اور ایک تھلا چڑھانے اور باریک سلائی کرنے والی کنڈی کے سوا تمام ہتھیار دریا میں پھینک چکا ہے۔ چاند نے اسے نئے کپڑے پہنائے اور پوچھا کہ یہ کنڈی اور دھاگہ کیوں دریا میں پھینکے سے گریز کیا گیا ہے۔ گنگا دین نے کہا کہ غلطی سے رہ گئے ہیں اور وہ جلد ہی پھینک دے گا لیکن کپڑے بدلتے ہوئے گنگا دین نے کنڈی اور دھاگہ بھڑی کے پلو میں چھپائے۔ عمر بھر کی رفیق اشیاء کی جدائی اسے ناقابل برداشت معلوم ہوئی۔

کپڑے بدل کر گنگا دین نے ماتھے پر تلک لگایا۔ چاند نے اسے غور سے دیکھا تو شکل و صورت اور انداز میں عام برہمنوں سے مختلف نہ پایا۔ کسی صرف و دیبا کی تھی۔ اس کا یہ حل تلاش کیا کہ سوائے آشیرباد کی قسم کے عام الفاظ سے گفتگو آگے نہ بڑھنے پایا کرے اور یہ مشہور کر دیا جائے کہ سوامی جی گزشتہ کئی برس سے صرف گیان دھیان میں مگن رہتے ہیں اور کسی سے بلاوجہ اشد ضرورت گفتگو نہیں فرماتے۔

گنگا دین اپنے نئے رذپ میں بظاہر مطمئن معلوم ہوتا تھا مگر اس کے دل میں خطرات کا بے پناہ سمندر موجزن تھا۔ وہ تمام عمر برہمنوں کی ہمسائیگی میں رہ کر اور ان کے جوتے بلا اجرت مرمت کر کے بھی ان کی ڈیوڑھی کے اندر قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکا تھا اور آج وہ شاہی برہمن کے ہاں بطور سدھی کے جا رہا تھا۔ بھگوان اس کی اس جرأت کی کیا سزا دیں گے آئندہ جنم میں اسے کون سی جون نصیب ہوگی اور اگر بھید کھل گیا تو اسی جنم میں جو سلوک اس کے ساتھ ہوگا وہ آئندہ جنم میں کتے کا روپ اختیار کرنے سے بھی کم نہ ہوگا۔ اس نے چاہا کہ وہ چاند سے معذرت کرے بلکہ اسے بھی ان خطرات سے نکال کر

اپنے ساتھ لے جائے۔
میں تھے مگر سہمی اس قدر جلد انہیں اجازت دینے پر تیار نہ تھے۔

ایک دن جبکہ چاند کسی ضروری کام سے باہر گیا وہ تھا، اس کی بیوی جو خود اپنے ہاتھ سے سر کو کھانا پکا کر پیش کرنے میں اپنی سعادت سمجھتی تھی اپنے بیاہ کا سنہرا جوتا جس کی زہ سے تھوڑا سا حصہ پینا ہوا تھا اس کے کمرے میں بھول آئی اور پھر اپنے گھریلو کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ گنگا دین نے دیکھا کہ کتنا قیمتی جوتا معمولی سی لاپرواہی سے خراب ہو رہا ہے اس نے باہر اُدھر دیکھ کر یقین کر لیا کہ کوئی آدمی اس کی طرف متوجہ نہیں پھر آہستگی سے جوتا اٹھایا اپنی پگڑی میں سے کنڈی اور دھاگہ نکالا اور اسے مرمت کرنا شروع کر دیا۔

بہو کو کام کے دوران میں جوتے کا خیال آیا اور وہ دوڑی ہوئی اس کے کمرے میں آئی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ بیارے کے سواری جی نہایت اطمینان اور بے خیالی سے مرمت میں مصروف ہیں۔ کیا اس کی شادی ایک چھارے سے ہوئی ہے؟ یہ خیال ایک بجلی بن کر اس پر گرا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

چیخ سن کر گنگا دین اس کی طرف متوجہ ہوا اور کنڈی دھاگہ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑے۔ دوسری طرف لڑکی کے والدین دوڑے دوڑے اسے دیکھنے کے لئے آگئے کہ اس پر کیا آفت آئی ہے اور صورت حال سے آگاہ ہو کر اسے علیحدہ لے گئے۔ اتنے میں چاند بھی آ گیا۔ اسے بھی صورت حال سے آگاہ کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ یہ راز افشا ہونے پر نہ صرف چاند اور اس کے والد کو عبرت ناک عذاب میں مبتلا کر کے قتل کیا جائے گا بلکہ باقی خاندان کے افراد بھی محفوظ نہ رہیں گے کیونکہ چاند کی وجہ سے شاہی مندر اور درباری رسوم گاہ بھر شٹ ہو چکے ہیں۔

اس دردناک عذاب سے بچنے کے لئے صرف یہی

وہ ابھی اسی وقتی منکشف میں تھا کہ چاند کے چند دوست راستے میں مل گئے اس نے کہا۔ "پتا لگی میرے دوستوں کو آشیر باد دیجئے۔" اور گنگا دین نے طوطے کی طرح آشیر باد کا جملہ دہراتے ہوئے سب کے سر پر باری باری ہاتھ پھیر کر چپ ہو گیا۔ چاند نے جلدی سے کہا کہ پتا جی ایک عرصہ سے خاموش گیان دھیان میں مصروف رہتے ہیں اس لئے گفتگو سے انہیں پریشان نہ کیا جائے۔ گنگا دین دل میں سوچ رہا تھا کہ اس پر کلمہ آفت چھو کرے کی وجہ سے عجب مصیبت میں مبتلا ہوا اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ کیمت یہاں برہمن کے روپ میں ہے تو اسے پہچان کر بھی نظر انداز کر دیتا۔

چند گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ شاہی برہمن کے محل میں داخل ہو گئے جو شاہی محلات کی مسابگت میں تھا۔ چاند نے اپنے پتا جی کی آمد کا اعلان کیا تو سب سے پہلے اس کی بہو نے دوڑ کر اپنے سر کے قدموں پر پرنام کیا۔ گنگا دین نے رٹے ہوئے جملے کو ڈھرایا اور پھر خاندان کے دیگر افراد سے ملا۔ چاند نے پتا جی کے گیان اور دھیان کا ذکر فلسفیانہ انداز میں کیا اور اس طرح گنگا دین کو مزید گفتگو کی زحمت سے بچالیا۔ اپنی مالاؤں میں سے ایک مالا اس کے حوالے کرتے ہوئے چاند نے اسے ایک علیحدہ کمرہ میں بٹھا دیا جہاں وہ مالا سمرن کے ساتھ اپنے ہونٹ اپنے قدیم ہمسائے برہمن کی طرح ہلاتا رہتا۔

دن گزرتے گئے تھے بیارے برہمن کے درشن کے لئے شہر کے عقیدہ مندوں کا ہجوم روزانہ جمع ہو جاتا بعض صرف درشن پر نل جاتے۔ بعض مرادیں مانگتے اور نذرانے پیش کرتے۔ سواری جی مہاراج کی خاموشی اور چپ کے برت نے سب کو متاثر اور خود سواری جی کو سخت پریشان کر رکھا تھا اور وہ وہاں سے جان بچا کر واپسی کی فکر

صورت تھی کہ رات کی تاریکی کا سہارا لے کر سارا کنبہ شہر سے نکل جائے کیونکہ یہ راز زیادہ عرصہ تک پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی وجہ سے ضرور افشا ہوگا۔ بہتر ہے کہ اس شہر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا جائے اور اس ریاست سے دور کسی دوسری ریاست میں جا کر تجارت کو ذریعہ معاش بنایا جائے اس کے سوا دوسری صورت ممکن نہ تھی۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ رات کی سیاہی میں گھر کے سب افراد مع چاند اور گنگا دین کے بھرا ہوا گھر چھوڑ کر صرف نقدی اور زیورات وغیرہ لے کر شہر سے باہر نکل گئے۔

دوسرے دن جب برہمن پوجا پاٹ کی شاہی رسوم سے فیر حاضر رہا تو اس کا پتہ کر دیا گیا معلوم ہوا کہ رات سے مکان کھلا پڑا ہے اور گھر کے سب افراد غائب ہیں۔ مہاراجہ نے یہ سمجھ کر کہا کہ انہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے احکام جاری کر دیئے کہ برہمن اور اس کے کنبہ کو تلاش کر کے دربار میں حاضر کیا جائے کیونکہ مہاراجہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا قدیم درباری برہمن اس سے ناراض ہو کر کسی اور ریاست میں چلا جائے۔

شاہی سوار ہر سمت روانہ ہوئے اور تیسرے دن برہمن کو مہاراجہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

مہاراجہ نے برہمن سے بھاگ جانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے علیحدگی میں عرض حال کی منظوری چاہی درخواست منظور ہوئی اور مہاراجہ دربار برخواست کر کے برہمن کو ہمراہ لے کر محل میں چلا گیا۔

تنہائی پا کر برہمن نے عرض کیا کہ حضور! اگر جان کی امان پاؤں تو اپنے گناہ کا کچا چٹھا کھول کر سناؤں۔ میری خطا اس قابل نہیں کہ حضور معاف فرمائیں مگر قدیم نمک خواری کی بنا پر رحم و کرم کا منتھی ہوں۔

مہاراجہ کے دل میں برہمن کا بے حد احترام تھا اس

نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ مشرعی آپ اس دربار کے قدیم نمک خوار اور مذہبی برہمن ہیں۔ وہ کون سی ایسی خطا آپ سے سرزد ہو گئی ہے کہ آپ جان کی امان مانگتے ہیں۔ آپ یقین رکھئے کہ آپ کی خطا خواہ کتنی ہی بڑی ہوگی آپ کو معاف کر دیا جائے گا۔ آپ خواہ مخواہ شرمندہ نہ کریں اور ان وجوہات سے آگاہ کریں جس کی بنا پر اس دربار سے تعلقات منقطع کرنے پر مجبور ہوئے۔

برہمن نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے عرض کیا کہ حضور میں برہمن نہیں ہوں بلکہ میرا تعلق سالی نام کے ایک خانہ بدوش قبیلہ سے ہے۔ میں چھوٹی عمر میں اپنے قبیلہ سے جدا ہو کر ایک برہمن کے ہاتھ آ گیا تھا۔ جس نے میری داستان مصیبت سن کر مجھے نہ صرف اپنے گھر میں پناہ دی بلکہ اپنے بچوں کے ساتھ مجھے تعلیم سے بھی بہرہ ور کیا۔ میں جب جوان ہوا تو آپ کے دربار میں حاضر ہو کر ملازمت سے بہرہ یاب ہوا۔ میرا یہ فریب آپ تک منکشف نہ ہوا اور میں نہایت فراغت سے اپنا وقت کاٹتا رہا لیکن پاپ کو ایک دن ضرور ظاہر ہونا تھا اور اس کا ذریعہ میرا داماد ہوا جسے میں نے برہمن سمجھ کر اپنا پلا مگر حقیقت میں چمار نکلا۔ میرا گناہ معمولی نہیں لیکن اگر حسب وعدہ حضور میری اور میرے بال بچوں کی جان بخش فرمائیں تو میں ان کو لے کر اس ریاست سے باہر نکل جاؤں گا اور کوئی مزدوری یا تجارت کر کے اپنا پیٹ پال لوں گا۔

برہمن کی داستان سن کر مہاراجہ نے غضب میں آنے کی بجائے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا کہ اے بے وقوف میں ذات کا چرنگ ہوں۔ ایثار نے حکومت دی ہے تو بھامتے کیوں ہو اطمینان اور فراغت سے زندگی بسر کئے جاؤ بھگوان جسے جیسا چاہتے ہیں بتا دیتے ہیں۔ ان کی لیلیا اپرم اپار ہے۔



بھارتی وزیراعظم مودی کا دورہ کشمیر

☆ 0345-8599944, 0301-3005908 گزرا اختر کاشمیری

بھارت اس وقت دنیا میں اسلئے کا سب سے بڑا خریدار ہے اور حال ہی میں مودی نے اسلحہ بنانے کے لئے غیر ملکی کمپنیوں کو مالکانہ حقوق پر سرمایہ کاری کی پیکش کی ہے۔ تازہ اطلاعات کے مطابق بھارت امریکہ سے بحری جہاز شکن ہارپون میزائل خرید رہا ہے۔ بھارت کے ان اقدامات کی وجہ سے چین ایران اور پاکستان کو بھی اپنے دفاعی اخراجات میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ بھارت اس وقت جنگی جنون میں مبتلا ہے جو پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔

نریندر مودی نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز بھی جموں سے کیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے جموں کے قریب کڑہ کے مقام پر ٹرین سروں کے افتتاح اور مظفر آباد سری نگر شاہراہ پر جنگ بندی لائن کے قریب اوڑی بجلی پروجیکٹ کے دوسرے فیز کے افتتاح سے ترقیاتی مہم شروع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کڑہ کی اہمیت اس لئے ہے یہاں ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے۔ "ماتا دشنودپوی" کی پوجا کے لئے تقریباً سالانہ ایک کروڑ ہندو یہاں آتے ہیں۔ یہ سب بھارت میں جن سنگتیوں کو مطمئن کرنے کے لئے ہے۔ اوڑی بجلی پروجیکٹ بھارت نے دریائے

وزیراعظم نریندر مودی نے مورچہ 4 جولائی 2014ء کو مقبوضہ جموں و کشمیر کا دورہ کیا۔ کشمیر کے دونوں اطراف اس دن کشمیریوں نے ہڑتال کر کے اپنی نظرت کا اظہار کیا اور اس دن کو یوم سیاہ کے طور پر منایا۔ کشمیریوں کی جانب سے اس طرح کے اقدامات کا مقصد نریندر مودی کو حق خود ارادیت کا حق ہاور کرنا تھا اور کشمیریوں پر ظلم و ستم کے واقعات کو روکنا ہے۔ کشمیری عوام نے مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر دونوں اطراف بھارتی وزیراعظم کی آمد پر جو کیا یہ ان کا جمہوری حق تھا۔ نریندر مودی کو ان کی صدا پر کان دھنا فرق ہے لیکن بی جے پی کے عزائم سب پر عیاں ہیں۔ مودی کشمیر کو ہندو مسلم میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ وہ کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ بھی چاہتے ہیں۔ وہ یہاں کے وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ان سے کسی خیر کی توقع نہیں۔ کیا نریندر مودی برسر اقتدار ہونے کے بعد اپنے آپ پر گئے انتہا پسندی کے داغ دھو سکیں گے؟ لیکن یہ تصور غلط ثابت ہو رہا ہے۔ نریندر مودی ہر طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ وہ ہر محاذ پر جارحیت دکھا رہا ہے۔ چاہے وہ کشمیر کا محاذ ہو یا لائن آف کنٹرول کا اسلحہ خریدنے کا اور۔

یہ لوگ بھارت میں تحریک آزادی کے خلاف استعمال ہوئے۔ دنیا بھر کے سفارت خانوں میں انہیں بھیجا گیا تاکہ یہ کشمیر میں مسلح جدوجہد اور پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کر سکیں۔ یہاں تک کہ اسلام آباد میں بھی یہ قیامت رہے ہیں۔ نریندر مودی کشمیر کو ہندو مسلم میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ یکساں سول کوڈ کا نفاذ ان کا مقصد ہے جبکہ ان کے سیاسی عزائم بھی ایسے ہیں کہ ان کی وجہ سے ہی بی جے پی اقتدار میں آ سکی ہے۔

نریندر مودی نے گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور پارٹی میں جگہ بنائی۔ ایل کے ایڈوانی اور مرلی منوہر جوگی جیسے کڑا انتہا پسندوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اس لئے وہ کشمیر میں بھی نیا کھیل کھیل سکتے ہیں۔ ہندو اور مسلم کمیونٹی کو تقسیم کرنے اور لڑانے کا کھیل ان کا پسندیدہ شغل ہے۔ بھارتی وزیراعظم کا دورہ کشمیر کے وسائل کے لوٹنے کی بھی ایک کڑی ہے۔ کشمیر اندھیرے میں ہے اور یہاں پیدا ہونے والی بجلی بھارتی ریاستوں کو سپلائی کی جاتی ہے۔ ریلوے لنک کے لئے بھی مقاصد ہیں، ریلوے کے ذریعے ہندوؤں کو "ویشنو دیوی" کی پوجا کے لئے آنے والے ہندوؤں کو سہولت دینے کے لئے بچھائی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ جموں کو انگریز ریاست بنادینے کا اور لداخ کو براہ راست دہلی کے انتظام میں دینے کے لئے یہ سارا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے لئے بھارت نواز کشمیری عمر عبداللہ، محبوب مفتی جیسے لوگ بھی استعمال ہوں گے۔

کشمیر میں آزادی پسندوں کی

جائیدادوں کی ضبطگی

پرانے دور میں بادشاہ اپنے مخالفین کے عزیز و

جہلم پر جاری کیا ہے۔ یہاں سے بجلی پیدا کرنے کے لئے بھارت کے ناردرن گریڈ میں شامل کی جاتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پروجیکٹ کی سوڈیش کمپنی سکسکا اور ایک برطانوی کمپنی 1984ء میں تعمیر کا آغاز کیا جبکہ اسی دوران سوڈیش کمپنی سکسکا نے آزاد کشمیر کی دہلی میں جاگراں بجلی گھر بھی تعمیر کیا جو جگہ بندی لائن کے بالکل قریب ہے۔ اوڑی پروجیکٹ کو مکمل کرنے کے بعد اس کا دوسرا فیز شروع کیا گیا جو 16 سال میں مکمل ہوا ہے۔ وزیراعظم نریندر مودی نے اسی کا افتتاح کیا ہے۔ اس کی بجلی کشمیر کو نہیں بلکہ بھارت کو وقف کی ہے۔ مقبوضہ اور آزاد کشمیر میں دو مختلف بجلی گھر برپ کی ایک ہی کمپنی کی جانب سے تعمیر ہوئے ہیں۔ نریندر مودی نے اس حالت میں کشمیر کا دورہ کیا ہے جب جگہ بندی لائن پر بھارتی فوج فائرنگ کر رہی تھی۔ اس سے آزاد کشمیر کے شہری زخمی ہو رہے تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں پوری ریاست میں ہڑتال رہی مگر جموں میں ہندوؤں نے زبردست استقبال کیا۔

وادی کشمیر اور آزاد کشمیر میں یوم سیاہ منایا گیا۔ کشمیری بی جے پی کے عزائم سے خوب واقف ہیں یہ ہندو انتہا پسندی کا مرکز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بی جے پی کشمیر میں چنڈتوں کے لئے الگ شہر بنا رہی ہے۔ یہ چنڈت 1988ء میں مسلح جدوجہد کے آغاز میں اس وقت کے انتہا پسند گورنر جگ موہن کی ہدایت پر کشمیر سے بھاگ کر بھارتی ریاستوں میں چلے گئے تھے۔ جگ موہن کا ارادہ ایک بڑے آپریشن کا تھا جس طرح شمالی وزیرستان سے آپریشن سے قبل لوگوں کو نکالا گیا ہے اسی طرح مقبوضہ کشمیر میں کسی بڑے آپریشن سے قبل صرف ہندو آبادی کو نکالا گیا تھا۔ راتوں رات انہیں لڑکوں پر لاد کر جموں پہنچایا گیا۔

انہوں نے اپنے مسلم پڑوسیوں کو بھی آگاہ نہ کیا۔

تھا۔ ان کو حزب المجاہدین سے وابستہ مجاہدین کو پناہ دینے کے احرام میں گرفتار کیا گیا۔ عوام کے بھرپور احتجاج پر اس وقت کے وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ کو یہ مکان مالکان کو واپس گزارد کرنا پڑا۔ فاروق عبداللہ کو عوامی ردعمل سے بچنے کے لئے اس کارروائی کو پولیس کے کھاتے میں ڈالنا پڑا اور تحقیقات کا حکم دیا جو آج چودہ سال گزرنے پر بھی مکمل نہ ہو سکی۔

جون 2012ء کو ہی پولیس نے سوپور کے واقعہ علاقہ میں حزب المجاہدین سے تعلق کے احرام میں عبدالرزاق اور ان کے بیٹے عبدالحمید لون سمیت آزادی پسند لوگوں کے باغات اور چند رہائشی اراضی پر قبضہ کر لیا جبکہ عبدالرزاق کی کار بھی ضبط کر لی۔ اس کے خلاف عمر عبداللہ کی حکومت کے خلاف شدید احتجاج ہوا۔ اس ردعمل کی وجہ سے کشمیر میں عمر عبداللہ کی حکومت نے وقتی طور پر آزادی پسندوں، مجاہدین اور ان کے رشتہ داروں کے مکان باغات اور زمینیں ضبط کرنی ترک کر دیں۔ یہ زمینیں پوٹا جیسے کالے قانون کی زد سے ضبط کی گئیں۔ یہ غیر قانونی سرگرمیوں سے بچاؤ کا ایکٹ ہے۔ اس کے تحت وقت کی حکومت اور فوج کو مخالفین کو جھکنے پر مجبور کرنا تھا۔

2001ء میں پوٹا قانون نافذ ہوا تھا لیکن آج یہ سلا موقع ہے مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے بھارت کی نیشنل انٹیلی جنس ایجنسی (NIC) کے حکم پر حکومت نے ایک مجاہد تنظیم سے وابستہ ایک مجاہد کے اہل خانہ کے نام پر رزرو خیر زمین کو ضبط کر لیا ہے۔ (NIC) نام نہاد بھٹی حملے کے بعد تشکیل دی گئی تھی۔ اس نے مقبوضہ کشمیر کے علاقہ پہلگام کے غلام نبی خان عرف سیف اللہ خالد اور عامر خان ولد غلام رسول خان کو مطلوبہ افراد کی فہرست میں شامل کیا۔ اس بھارتی خفیہ ایجنسی نے نام نہاد عدالتیں بھی قائم کیں۔

اقارب کو انتقام کا نشانہ بناتے ہوئے انہیں گرفتار کرتے تھے۔ کبھی قتل کروادیتے تھے، ان کی جائیدادیں ضبط کر لی جاتی تھیں، ان کی فصلیں جلا دی جاتی تھیں اور ان جائیدادوں پر قبضہ کر لیا جاتا تھا۔ یہ جنگل کا قانون مقبوضہ کشمیر میں آج بھر نافذ کر دیا گیا ہے۔ آزادی کی جدوجہد کرنے والے مجاہدین کے رشتہ داروں کی زمینیں اور ان کے مکان بحق سرکار ضبط ہو رہے ہیں۔ سب سے پہلے حریت کانفرنس (گیلانی) کے رہنما اور ممبر لیگ کے سربراہ غلام محمد خان سوپوری کا مکان سر بمبر کر دیا گیا۔ (D.G.P) کلدھپ کھودا کے حکم پر یہ کارروائی کشمیر پولیس نے کی۔

یہ 30 جون 2012ء کا واقعہ ہے سری نگر کے مائے کالونی نئی پورہ علاقے میں پولیس نے غلام محمد خان کے اہل خانہ کو زبردستی گھر سے باہر نکال کر اس کو سر بمبر کر دیا۔ پولیس نے پہلے نہ کوئی گھر خالی کرنے کا نوٹس دیا اور نہ مہلت دی۔ ان پر حرکت جہاد اسلامی کے ساتھ تعاون کرنے کا احرام لگایا۔ پولیس کے اس اقدام کو ظالمانہ قرار دیا گیا، اس کی مزاحمت کی گئی۔ یہ اصل میں ریاست کی حکومت کا حکم تھا۔ اگرچہ یہ عین مرلے کا مکان سوپوری صاحب کی اہلیہ کے نام پر تھا لیکن اسے ضبط کر لیا گیا یہ مکان 1997ء میں بنایا گیا تھا ان کا آبائی علاقہ سوپور ہے جہاں ان کا مکان اور دکانیں جلا دیئے گئے تھے۔ انہیں ہراساں کیا گیا ان کو جیلوں اور اذیت خالوں میں تاراج کیا گیا۔ اسی وجہ سے اس خاندان نے روز بروز کے چھاپوں اور گرفتاریوں سے بچنے کے لئے سوپور سے سکونت ترک کر کے عمر بھر کی پونجی سے یہ ایک منزلہ مکان بنایا تھا جو حکومت نے ضبط کر لیا۔

اسی طرح کا دوسرے واقعہ 2001ء میں سری نگر کے ڈاؤن ٹاؤن صفا کدل کے علاقے میں کالے قانون کے تحت ایک مکان کو سر بمبر کیا گیا۔ یہ غلام محمد ڈار کا مکان

مہلی پر تعجب کا اظہار کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ بکن میں استعمال ہونے والے چھری کاٹنے تھے۔

کانگریس کے دور میں مراد آباد ڈیڑھ، جبل پور اور جمشید پور میں مسلم کش فسادات ہوئے، مسلمانوں کی ڈکانوں اور گھروں کو لوٹا گیا اور آگ لگائی گئی۔ جمشید پور کے فسادات نے تو کانگریس نواز عبدالغفار خان کو بھی مضطرب کر دیا تھا۔ جب بی جے پی کے کارکنان نے ہامدی مسجد پر حملہ کیا تھا۔ تب کانگریس کی حکومت تھی۔ نریماراؤ اگر چاہتا تو فوج بھیج کر مسجد کا انہدام روک سکتا تھا مگر وہ اس سے مس نہ ہوا۔ نریندر مودی نے 2002ء میں جب گجرات میں مسلم کش فسادات کرائے تب بھی بھارت میں کانگریس کی حکومت تھی اور اہم ترین بات یہ کہ مسئلہ کشمیر سمیت پاکستان کے خلاف تمام مسائل کانگریس نے پیدا کئے جس میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ساری منصوبہ بندی کانگریس کے دور میں ہوئی۔

1965ء میں پاک بھارت جنگ بھی کانگریس کے دور میں ہوئی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو سیکولر جماعت کہتے تھے۔ "حکایت" میں تحریک پاکستان کے دور کے ہزاروں واقعات لکھے گئے دیگر رسائل "اردو ڈائجسٹ"، "سیارہ ڈائجسٹ"، "قومی ڈائجسٹ" اور دیگر اخبارات اس وقت کے ہندو مظالم سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ سب کانگریس کے دور کے واقعات ہیں جو اپنے آپ کو سیکولر کہتے تھے۔ مگر بی جے پی کے نریندر مودی نے تو ہندوستان میں مسلم دشمنی سے شہرت پائی ہے۔ ہندو قوم پرستی اور ہندو مذہبی تشخص رکھنے والے نریندر مودی کے حوالے سے اگر بعض لوگوں میں تشویش انگیز خدشات جنم لیں تو یہ غیر فطری بات نہیں ہے۔ نریندر مودی کے شدت پسندانہ رجحانات اور ہندو تعصب خطے میں عدم استحکام اور جنوبی ایشیا میں امن کے لئے شدید خطرات کو جنم دے سکتے ہیں۔

غنیہ انجینی کے حکم پر ہی عامر خان کی اہلیہ کے نام پر 9 کنال اراضی مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے سرکاری تحویل میں لے لی جبکہ پہلے کام میں امرتا تھ پاترہ پر بھارتی حکومت کی طرف سے بھارتی شہریوں کو لیز پر زمینیں الاٹ کی جارہی ہیں۔ یہ اس علاقہ سے مقامی آبادی کو زبردستی بے دخل کرنے کا آغاز ہے۔ عامر خان کو اس علاقہ میں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ عامر خان کے کم سن تیرہ سالہ بیٹے کو بھارتی فورسز نے گرفتار کر کے انٹرویویشن سینٹر میں تشویش کے دوران شہید کر دیا تھا لیکن عامر خان نے سرگرد نہ کیا۔

بھارتی حکومت اور اس کی کٹھ پتلی ریاستی انتظامیہ نے بھائی کے بدلے بھائی اور باپ کے بدلے بیٹے کو گرفتار کیا۔ بچوں اور عزت مآب خواتین کو بھی نہ بخشا گیا لیکن اس سارے دباؤ کے بعد بھی کسی نے سرگرد نہ کیا تو حکومت نے ایک بار پھر جائیدادیں ضبط کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ فاروق عبداللہ کی حکومت بھارتی قوانین کو کشمیر میں نافذ کر کے دفعہ 370 کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔

نریندر مودی ایک انتہا پسند لیڈر

یوں تو پاکستان کی مخالفت میں کانگریس بھی کم نہیں رہی، مسئلہ کشمیر جو اہل عمل نہرو نے پیدا کیا۔ مہاراجہ کو قبائلیوں سے ڈرا کر کشمیر کے عارضی الحاق کی دستاویز پر نہرو نے ہی دستخط کرائے تھے۔ 1947ء میں ہی اس وقت کے وزیر داخلہ سردار ولہ بھائی پٹیل اور وزیر دفاع نے دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام کرایا۔ وزیراعظم پنڈت نہرو نے بے بسی کا ڈرامہ رچایا۔ مسلمانوں پر فساد کے لئے اسلحہ جمع کرنے کا الزام لگایا اور جو اسلحہ برآمد کیا گیا اس پر خود وائسرائے لاڈل ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ اگر مسلمان اس اسلحہ سے لڑنا چاہتے ہیں تو ان کی جنگی حکمت

نہیں چاہتا کہ مودی اقتدار میں آئے۔ عالمی برادری بھی مودی کو ہندوستان میں مسلمانوں کے قاتل کی حیثیت سے جانتی ہے۔

543 رکنی بھارتی لوک سبھا میں 34 فیصد ممبران سنگین جرائم میں ملوث ہیں۔ بی جے پی کے کل ممبران کی ایک تہائی تعداد فوجداری مقدمات میں ملوث ہے۔ اس طرح کابینہ میں بھی اکثریت جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ اس واقعہ لوک سبھا میں کوئی اپوزیشن جماعت نہیں ہے۔ بھارتی آئین کے مطابق اپوزیشن جماعت کے لئے دس فیصد نشستیں جتنی ضروری ہیں اور کانگریس صرف 42 سیٹیں جیت سکی ہے۔ لوک سبھا کے 34 فیصد ارکان پر قتل اقدام قتل فرقہ وارانہ فسادات اور نسلی فسادات میں ملوث ہونے کے مقدمات ہیں۔ صوبہ اتر پردیش سے بی جے پی کے 80 ممبر منتخب ہوئے، ان میں سے 28 ارکان مقدمات میں ملوث ہیں 22 پر اغوا قتل اور اقدام قتل جیسے سنگین جرائم ہیں۔

بی جے پی کے 282 نو منتخب ارکان میں سے ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ کیا ایسی متعصب اور بدکردار لوگوں سے بھری پارلیمنٹ سے امن کی توقع رکھی جاسکتی ہے؟ بڑے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایسے کردار کا وزیراعظم جس کی اٹھان ہی پاکستان کی مخالفت پر ہوئی ہے ہمارے امن کی آشار رکھنے والے میڈیا والے بھی اپنے بھارتی آقاؤں اور مغربی آقاؤں سے مل کر پاکستانی افواج اور آئی ایس آئی کو بدنام کر کے خوشی محسوس کر رہے ہیں۔

بھارتی میڈیا نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے پاکستان کو دہشت گردی کا اڈا ثابت کرنے میں پورا زور لگا رکھا ہے۔ کرل مہتا، کرل آرائس سنگھ، جی ڈی جنش، جنرل اجیت سنگھ اور راجیو دگرہ نے ہندوستانی ٹی وی چینل پر حامد میر اور جیو چینل کے خلاف کارروائی کو براہ راست افواج پاکستان اور آئی ایس آئی سے جوڑ

نہ پندر مودی نے الیکشن جیتنے کے لئے پاکستان مخالف بوئیکیں ماریں۔ انہوں نے کہا تھا کہ بھارت کو مطلوب داؤد ابراہیم کو اسامہ بن لادن کو اٹھانے کی طرز کا آپکشن کر کے بھارت لے آؤں گا۔ شیو سینا، بجرنگ دل اور راشٹریہ سیک سنگھ جیسی انتہا پسند تنظیمیں اتحادی جماعتوں کی حیثیت سے بھارت میں مسلمانوں کی تصویر کے مطالبات نہیں کریں گی؟ اس نے جو کچھ گہرات میں کیا تھا۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حکومت میں وہ سرحد پار ”دہشت گردی“ کے نام پر اپنی خارجہ پالیسی مرتب کرے گا۔ وہ کسی بھی وقت آزاد کشمیر پر محدود حملے شروع کر داسکتا ہے۔ گہرات کے متعصب اور خوفناک مودی نے لکاکر کہا تھا۔ ”ہم نے چڑیاں نہیں بہن رکھی ہیں“۔ اس کے بعد گہرات میں ایسے خونی فسادات پھوٹ پڑے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

گہرات کی حکومت کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 790 مسلمانوں کو ذبح کر کے گردن الگ کر دی گئی تھی، 2500 کو شدید زخمی کیا گیا۔ ایک لاکھ مسلمان اپنے بھرے گھر چھوڑ کے جانے پر مجبور ہوئے۔ بی جے پی کے جتوں کو کھلی چھوٹ دے دی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کے گھروں، دکانوں اور جائیداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ گہرات جیمبر آف کامرس کے مطابق گہرات کے مسلمانوں کے 110 ارب روپے کے کاروبار کو بے گناہ ڈھیر بنا دیا گیا تھا۔ اس دوران پولیس مسلمانوں کو تحفظ دینے کے بجائے بلوائیوں کی مدد کرتی رہی۔ بہار میں بی جے پی کے ایک امیدوار راج سنگھ نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بھارت میں جو بھی دہشت گرد گرفتار ہوتا ہے وہ مسلمان ہی ہوتا ہے۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا۔ جو مودی کو ووٹ نہیں دے گا اس کو پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ اس نے کہا کہ پاکستان

ہم مطمئن نہیں ہیں۔ ان منصوبہ سازوں کے خلاف کارروائی کی یقین دہانی کرائی جائے۔
(3) ان کے ماحرہ لوگوں کی واپس سہیل یعنی ان کی آواز کے نمونے مہیا کئے جائیں۔

کاش میاں صاحب ان کو بھارت کی اعلیٰ عدلیہ میں ان کی سیکرٹ سروس کے ایڈیشنل سیکرٹری کا حلف نامہ دکھاتے جس میں اس نے اپنی تحقیقی رپورٹ میں خود سیکرٹ سروس کو گواہ اور بمبئی کے واقعات کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ کاش ہندوستان سے بھجوتہ ایکسپریس کو تباہ کرنے والے کرل پروبت جس نے Cr4 مقبوضہ کشمیر سے چوری کر کے ٹرین کو تباہ کیا تھا جس میں 50 پاکستانی مارے گئے تھے۔ اس پر بات کی ہوتی یا کشمیر کے لاکھوں مسلمانوں کو بے گناہ شہید کرنے پر بات کی ہوتی۔ کاش کشمیر قیادت سے چند منٹ ہی بات کر لی ہوتی جو صرف ان کی ملاقات کے لئے کشمیر سے پاکستانی ہائی کمیشن میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ نواز شریف صاحب نے نہ تو کشمیر پر بات کی اور نہ ہی بلوچستان میں بھارتی مداخلت پر بات کی۔ ان حقائق کی روشنی میں کوئی غلط فہمی میں نہ رہے کہ ہندوستان میں نریندر مودی جیسے مسلم دشمن کی حکومت کے دور میں دوستی ہوگی یا امن کی آشا چلے گی یا امن قائم رہے گا۔

حکومت پاکستان کو فوری طور پر ہنگامی بنیادوں پر کام کر کے آزاد کشمیر پر ممکنہ حملے یا کسی بڑی کارروائی کو روکنے کی منصوبہ بندی کرنی چاہئے۔

مجاہدین کشمیر جن کو نریندر مودی پاکستان کی ریزرو فورس قرار دیتا ہے، ان کی امداد کرنی چاہئے اور ان کے ہاتھ پیر کھول دیئے جائیں تاکہ وہ ثابت کر دیں کہ وہ واقعی پاکستان کی ریزرو فورس ہیں۔



دیا۔ انہوں نے حوالہ دیا کہ جیو نے خود کہا ہے کہ یہ ساری کارروائی جنرل قسیر السلام نے کروائی ہے۔ بھارتی میڈیا نے نواز شریف کو امن کا دای اور پاک فوج کو امن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگ اور جیو گروپ اس لئے ان کا نشانہ بنے ہیں کیوں کہ وہ امن کی آشا کی بات کرتے ہیں اور افواج پاکستان کے ظلم اور زیادتیوں کی بات کرتے ہیں۔

کیا پاکستانی میڈیا بھارتی کردار کو واضح کرنے کے لئے مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بھارت کے کردار پر بات نہیں کر سکتا؟

بلوچستان اور کراچی کے حالات میں بھارتی مداخلت بھارتی اسلحہ اور سامان سیاسی جماعتوں کے دفاتر سے پکڑا جاتا ہے اس کو ہمارا میڈیا بھارتی اسلحہ کی بجائے غیر ملکی اسلحہ کہتے ہیں۔ افغانستان میں بھارتی تو نصیلت کے کردار کو ہمارا میڈیا کیوں اجاگر نہیں کرتا؟ ہم ماضی کو دفن کرنے اور مودی کے کردار کو زعمہ کرنے اور احکامات دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ بھارتی میڈیا جمہوریت کے مقابلے میں افواج پاکستان کو من مانی کرنے والی قوت قرار دینے میں پورا زور لگا رہا ہے جبکہ ہندوستان نے آج کشمیر کا خصوصی درجہ ختم کرنے پر کام شروع کر رکھا ہے۔ ہم لوگ اس پر حیران ہیں کہ وزیراعظم نواز شریف ہندوستان سے اتنے دبے ہوئے کیوں ہیں۔ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ وزیراعظم نواز شریف ہندوستان سے جنگ کی باتیں کریں مگر ایک ایسی ملک کا وزیراعظم بھارت جا کر فقط چارج شیٹ حاصل کرتا ہے جس کے تین نکات درج ذیل تھے:

(1) کراس بارڈر دہشت گردی روکیں اور جس طرح اندر کمال گجراں سے تعاون کیا تھا اسی طرح کا تعاون کریں۔ کشمیری مجاہدین کی حمایت سے باز رہیں۔

(2) بمبئی حملے میں ملوث افراد کی پیش رفت سے



دھڑپ کے پچھلے تنک

اُس سر پھرے کی کہانی جو اندھیر گہری میں اُجالا کرنے نکلا تھا۔

امجد جاوید



قسط: 8



سوہنے نے خوشگوار انداز میں اپنی رائے دی۔
 ”او چا چا کوئی خدا کا خوف کرو۔ اتنے برس ہو گئے
 چوہدریوں نے یہ سکول نہیں کھلنے دیا۔ اب گاؤں میں ایک
 نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ یہ گھنٹی تو کسی نئے فساد کی
 آواز ہے۔“ حنیف دوکاندار نے خوف زدہ ہوتے ہوئے
 کہا تو چا چا سوہنا بولا۔

”نہیں، بالکل نہیں، یہ شرکی نہیں، خیر کی آواز
 ہے۔ تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق ہے۔ چوہدری کون ہوتے
 ہیں، ان معصوم بچوں کو ان کے حق سے محروم کرنے
 والے۔“

”یہ بھی فہد کی نئی شرارت ہے۔ دیکھنا اب خون
 خرابہ ہوگا۔ یہ بندہ کسی کو چین سے نہیں بیٹھنے نہیں دے
 رہا۔ جب سے یہ گاؤں میں آیا ہے۔ کوئی نہ کوئی فساد ہی
 پڑا رہتا ہے۔“ حنیف دوکاندار نے کہا۔

”وہ تم جیسے بے ضمیروں کو ہنجومز رہا ہے کہ نیند سے
 اٹھو اور اپنا حق پیچانو۔ وہ خالوں کو لٹکا رہا ہے مگر ظالم
 بجائے اس کا سامنا کرنے کے کمزوروں پر ہاتھ اٹھا رہے
 ہیں اور کمزور خواہ مخواہ خوف سے دبے جا رہے ہیں۔ یہ
 تہدیلی ہے۔ اب وقت نہ بدلا تو کبھی نہیں بدلے گا۔“
 چاچے سوہنے نے اسے حقارت سے کہا

”یہ تیرے جیسے چند بے عقل اُسے ہبہ دے رہے
 ہیں۔ اس وقت تمہارا پتہ بھی نہیں چنا جب چوہدری اپنی
 آئی پر آگئے۔“ حنیف دوکاندار نے ڈرایا تو چاچا سوہنا
 بولا۔

”تو آجائیں نا اپنی آئی پر، بس نے روکا ہے، فہد کا
 ماننا کرتے ہوئے کیوں اُترتے ہیں۔ سکول چل گیا
 ہے۔ اب اس میں بچے پڑھیں گے۔ اب چوہدری جو
 مرضی کر لیں یہ بند نہیں ہوگا۔“

”دیکھو کیا ہوتا ہے، سکول بند ہوتا ہے یا اس کے
 کھولنے والے۔“ حنیف دوکاندار کہتے ہوئے خاموش

والوں سے ملنے کے بعد فہد اپنی کار میں سلسی کے
 ٹاور مگر پہنچا اور اسے اپنے ساتھ لے کر سکول کے
 سامنے جا پہنچا۔ جہاں کبھی وہ پڑھا تھا۔ ایک لمحے کے
 لئے اس کے دل میں نہیں اُٹھی۔ ماضی اسے اپنی لپیٹ
 میں لے لینا چاہتا تھا۔ مگر فراق اس نے خود پر قابو پالیا۔
 اس نے دیکھا سکول کی عمارت پر زنگ آلود تالا پڑا ہوا
 تھا۔ فہد کی گاڑی وہاں آ کر رکی اور اس میں سے فہد اور
 سلسی باہر آ گئے۔ انہی لمحات میں اطراف میں سے سراج
 اور چھکا کا ٹکڑے۔ سراج کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس کے
 ساتھ کافی سارے اسلحہ بردار لوگ تھے۔ سلسی بہت جذباتی
 ہو رہی تھی۔ اس کے گالوں پر آنسو رواں تھے۔ فہد نے کار
 میں سے ہتھوڑا نکالا۔ وہ ہاتھ میں ہتھوڑا لئے آگے بڑھا
 اور تالے پر ضرب لگانے لگا۔ تالا ٹوٹ گیا تو فہد نے سلسی
 کو ساتھ لیا اور سکول میں داخل ہو گیا۔ چھکا کا اور سراج ان
 کے ساتھ تھے۔ اندر جا کر انہوں نے گھنٹی لی اور سلسی کے
 ہاتھ میں دے دی۔ سلسی اس گھنٹی کو اپنے ہاتھ میں لئے چند
 لمحے دیکھتی رہی۔ پھر بڑے جذباتی انداز میں گھنٹی بجانے
 لگی۔ ایک ضرب، دوسری ضرب تیسری ضرب۔

گھنٹی کی آواز پورے قسمت نگر میں پھیل گئی۔ لوگ
 چونک اٹھے۔ سکول بیل بج رہی تھی۔ گھر، بازار، گلی،
 کھیت، راستے سب جگہ آواز سنائی جا رہی تھی۔ لوگ حیران
 ہو کر رہے تھے۔ ماسٹر دین محمد وہ آواز دھیمی مسکراہٹ
 سے بولیں رہا تھا جیسے کوئی نغمہ ہو۔ چوراہے میں بھی
 سکول کی گھنٹی سنائی دے رہی تھی۔ حنیف دوکاندار اور چاچا
 سوہنا بھی سن رہے تھے۔

حنیف دوکاندار نے حیران کن انداز میں پوچھا۔
 ”یہ ہمارے گاؤں کے سکول کی گھنٹی بج رہی ہے
 نا؟“

”حقیقت تو یہی ہے حنیف، ملتا ہے قسمت مقرر
 بدلتی ہوئی قسمت کو اب کوئی نہیں روک سکتا۔“ چاچے

”ہم اس کا سہارا ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جتنا مرضی وہ اس پر دباؤ ڈالیں۔ صنفیہ نہیں مانے گی۔ وہ ان کے لالچ میں بھی نہیں آئے گی۔“

”کسی کا کیا اعتبار! فرض کیا وہ لالچ یا دباؤ میں آ جاتی ہے تو ہم اس کا کیا کر سکتے ہیں؟ جبکہ چوہدری تو ہر ممکن کوشش کریں گے معاملہ اس کے بیٹے کا ہے۔ اب معاملہ صنفیہ پر ہے۔ اس کا کوئی بھی فیصلہ حالات کا رخ موڑ سکتا ہے۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو فہد بولا

”آپ ٹھیک کہتے ہیں استاد جی، میں مان لیتا ہوں کہ وہ لالچ یا دباؤ میں آ کر اپنا فیصلہ تبدیل کرے گی۔ تو پھر کیا ہوا۔ چوہدری کے ساتھ ہمارے حالات تو ویسے ہی رہیں گے۔ اور اگر دشمنی بڑھتی ہے تو پھر بڑھ جائے۔“

”لہاجی! آپ گھبرائیں مت۔ میں ابھی اس سے ملتی ہوں۔ اسے حوصلہ دوں گی۔ جس طرح کا سہارا چاہے گی میں اسے دوں گی۔“ سلمیٰ نے کہا تو ماسٹر دین محمد پوچھا۔

”کیا سہارا دوں گی۔ کیا دے سکتی ہوں۔ چوہدری تو اسے روپے پیسے اور زمین کا لالچ دے رہے ہیں۔ تم کیا دے سکتی ہو۔ کیا ہے تمہارے پاس؟“

”کیا نہیں ہے سلمیٰ کے پاس استاد جی۔ گھر، روپیہ پیسہ، زمین سب کچھ ہے سلمیٰ کے پاس۔“

اس کے یوں کہنے پر ماسٹر دین محمد چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”میں تو اپنی رائے دے رہا تھا۔ باقی تم لوگ جانو کہ کیا فیصلہ کرتے ہو۔“

”آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری ساری کوششوں کا محور فقط صنفیہ نہیں ہے اور بہت کچھ ہے۔“ فہد نے کہا تو ماسٹر دین محمد بولا۔

”تم جو بہتر سمجھتے ہو کرو۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”آپ ناراض ہیں؟“ فہد نے اچانک پوچھا تو

ہو گیا اور ہیٹ کراہی دوکان کی طرف چلا گیا۔

سکول کی گھنٹی بج رہی تھی اور اس وقت تک بجتی رہی جب تک سارے قسمت مگر نے نہ سن لیا۔

فہد اور ماسٹر کھانا کھا چکے تو سلمیٰ چائے کا گلاسے کر آئی اور پھر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ بھی ماسٹر دین محمد نے کہا

”سکول کا تالا تو توڑ دیا ہے تم لوگوں نے، ایک خواب تھا وہ پورا ہو گیا، لیکن یہ چوہدری اسے برداشت نہیں کر پائیں گے۔ وہ ضرور۔۔۔“

”سکول کا تالا توڑنے سے پہلے میں نے سب سوچ لیا تھا اور اس کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ آپ کوئی فکر نہ کریں میں نے محکمہ تعلیم کے آفیسرز سے بھی بات کر لی ہے۔ بلکہ آج کل میں آپ کے نشن کیس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ آپ بس دیکھیں، ان چوہدریوں کی بے بسی۔ اب آپ بالکل فکر نہ کریں۔“ فہد نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو ماسٹر دین محمد بولا

”فہد بچہ! اب تشویش والی بات یہ ہے اگر صنفیہ مگر مگنی تو اب تک جو تمہاری کوششیں ہیں۔ وہ سب مایاں جائیں گی۔ دشمنی بھی بڑھ جائے گی۔ یہ تم لوگوں کو پہلے سوچنا چاہئے تھا نا کہ اس کا اثر و سوراخ بہت زیادہ ہے۔“

”بات اثر و سوراخ کی نہیں اور نہ ہی دشمنی کی ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر صنفیہ دباؤ میں آ کر ان کی بات مان لیتی ہے تو پھر چوہدری کے جبر کا جال توڑنا مشکل ہو جائے گا لیکن یہ ناممکن تو پھر بھی نہیں ہے۔“ فہد نے سمجیدگی سے کہا

”میں تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں فہد! اس قدر مشکل حالات میں بھی تم حوصلہ نہیں ہارے ہو۔ جبکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے جتنا کہ بندہ اپنی لڑائی توڑ سکتا ہے۔ کسی کی لڑائی کیا لڑے۔ اب صنفیہ جیسی کمزور عورت ان کا دباؤ کب تک برداشت کرے گی۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو سلمیٰ بولی۔

ماسٹر دین محمد نے جلدی سے کہا۔
"اوپر نہیں پڑا میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔ میں آئندہ آنے والے حالات کی سختی سے آگاہ کر رہا تھا۔"

اس پر فہد نے اپنے استاد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حوصلہ مند لہجے میں کہا

"آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔"

ماسٹر دین محمد نے اپنا سر ہلایا تو فہد اٹھ کر چل دیا۔ جہاں ملک نعیم اس کے انتظار میں تھا۔

فہد اور ملک نعیم دونوں کمرے میں خوشگوار موڈ میں بہت دیر تک علاقے اور اس کی صورت حال پر باتیں کرتے رہے۔ تبھی ملک نعیم نے کہا۔

"آپ سے اتنی ڈھیر سے ساری باتیں کر کے مجھے بڑا حوصلہ ملا ہے۔ خیر! باتیں اور ملاقاتیں تو اب ہوتی رہیں گی۔"

"کیوں نہیں ملک صاحب! آئیے جیسا سیاسی بندہ سیاست کے بغیر بھلا کہاں رہ سکتا ہے اور پھر جدوجہد تو اس جاگیردار کے خلاف ہے جس نے جبر سے علاقے پر حکمرانی کر رکھی ہے۔ میرا مقصد تو اس جبر کے خلاف لڑنا ہے۔" فہد نے گہری سنجیدگی سے کہا تو ملک نعیم صاف انداز میں بولا۔

"سیاست یا انکیشن جیتنا ہی میرا مقصد نہیں ہے مجھ سے یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا۔ میں نے پہلے بھی اپنی بساط مطابق کوشش کی تھی، اب بھی کر رہا ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔" فہد نے زوردار لہجے میں کہا تو ملک نعیم حتیٰ لہجے میں بولا۔

"تو پھر یہ طے ہوا کہ نذیر کا خون مایاں نہیں جائے گا۔ ہم اس مظلوم عورت کی ہر ممکن مدد کریں

گے۔ اور اس کے لئے جا ہے جو بھی کرنا پڑے۔ ظاہر ہے اسے سیاسی ایٹھنا نہیں گئے تو ہی اس مظلوم عورت کی فریاد سنی جائے گی۔"

"اسے قانونی مدد بھی تو فراہم کرنی ہے۔" فہد نے یاد دلایا تو ملک نعیم نے کہا۔

"میں ہوں نا۔ اس میں جو خرچ وغیرہ ہوگا، وہ میں کروں گا۔ آپ کو اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہترین وکیلوں کی مدد لیں گے۔"

"چلیں یہ تو طے ہو گیا۔ اس کے علاوہ جو آپ کہیں میں حاضر ہوں۔" فہد نے خوش ہوتے ہوئے کہا

"میں تو یہاں تک سوچ رہا ہوں کہ یہاں لوگوں کو روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع دوں تاکہ وہ ساری زندگی کی کمین نہ رہیں اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو جائیں۔" ملک نعیم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"میں بھی اس سوچ پر سوچ رہا ہوں دیکھیں، جاگیر دار ہونا سرمایہ دار دونوں کو اپنے منافع سے غرض ہے۔ لیکن مزدور کو وہ فائدہ کہاں ہے، روزگار کے مواقع کون پیدا کرتا ہے؟" فہد نے بھی اپنا خیال بتایا تو ملک نعیم بولا۔ "میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات، فہد آپ طے ہونا تو مجھے نئی توانائی مل گئی ہے۔ اس علاقے کا سیاسی سینٹ اپ بھی نئے سرے سے دیکھیں گے۔ ظاہر ہے، کچھ وقت بعد ہم نے انکیشن میں تو جانا ہی ہے۔ اس وقت تک ہمیں سیاسی طور پر مضبوط ہونا ہے۔"

"عوام اب ہاشور ہے ملک صاحب! عوامی فائدے کی بات تو بہت ہوتی ہے لیکن عملی طور پر کچھ نہیں ہوتا عوام اب تنگ آ گئے ہیں ان خالی خولی وعدوں سے اب وقت آ گیا ہے کہ ان کے لئے کچھ کرنا ہوگا ورنہ آپ اور ہم انقلاب کی چاب تو سن رہے ہیں۔" فہد نے اسے آنے والے وقت کا احساس دلایا۔

"بالکل! حب پتہ نہیں۔ اس انقلاب کے بعد جو

ایک معمولی عورت ہمارے سامنے آکھڑی ہوگی۔ اور وہ ہماری مجبوری بن جائے گی۔" چوہدری جلال نے کہا۔
 "میں نے وکیل کی ساری باتیں سن لی تھیں۔
 چوہدری صاحب! اس سے پہلے کہ حالات مزید ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں۔ ہمیں انہیں سنبھالنا ہوگا۔ منیہ اگر مان جاتی ہے تو پھر معاملہ ختم ہو سکتا ہے نا؟" بشری بیگم

بیٹا اب بے گاہ۔ اس میں ہم کہاں ہوں گے۔ یہ شاید ہم ابھی سوچ نہیں رہے ہیں۔ خیرانی الحال مجھے اجازت دیں، گاؤں تک پہنچنے کا کافی وقت ہو جائے گا۔ اب ملاقات تو ہوتی رہے گی۔ ملک نعیم نے اجازت چاہی تو نہد خوش دلی سے بولا۔
 "کیوں نہیں، ضرور ہوگی ملاقات۔"

بولی
 "مشکل تو یہی ہے۔ وہ ہمارے مخالفین کے ہاتھوں میں ہے۔ معاملہ اگر اپنے ہی علاقے میں رہتا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن مخالفین اسے بہت دور تک لے جانا چاہتے ہیں۔ اس کے اثرات ٹھیک نہیں ہوں گے۔"
 چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا
 "کیا فہد اس قدر مضبوط ہو گیا ہے کہ آپ اسے نہیں روک پارہے ہیں؟" اس نے تشویش سے پوچھا
 تو چوہدری جلال نے نخوت سے کہا۔

کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے ہاتھ ملایا، پھر ملک نعیم دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ جاتے ہوئے اس کے چہرے پر خاصی خوشی تھی۔

☆.....☆.....☆

"فہد! اُسے تو میں ابھی ایک چوٹی کی طرح مسل دوں لیکن اس وقت وہ ایسی عورت کے پیچھے کھڑا ہوا ہے۔ جیسے وہ مظلوم بنانے پر تلا ہوا ہے۔ اگر اس وقت اسے کچھ کہتے ہیں تو وہ بھی مظلوم بن جائے گا۔"

حولی کے ڈرائنگ روم میں بشری بیگم گہری سوچوں میں گم بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے مالی اسے چائے دے گئی تھی جو اب تک ویسے پڑی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ رات کی باتیں اسے بھول نہیں رہی تھیں۔ پہلی بار اس نے چوہدری جلال کو بدلا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ لان میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔

"لے دے کر بات منیہ پر ہی آن گئی ہے نا چوہدری صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ میں چلی جاتی ہوں اس کے پاس۔" بشری بیگم نے مان سے کہا تو چوہدری جلال نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

رات چوہدری جلال خواب گاہ میں تھا۔ بشری بیگم نے اس کی محویت دیکھ کر پوچھا۔
 "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"نہیں، ابھی ہم پر ایسا وقت نہیں آیا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ کیا میں اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ اپنے معاملات کے لئے تمہیں کسی کے پاس بھیجوں۔ نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

"سوچنا کیا بیگم! دنیا داری کے مسائل تھوڑے ہیں۔ ایک کو حل کرو تو دوسرا سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ ارد گرد پھیلے ہوئے تھوڑے جھنجٹ ہیں۔ ان کے لئے سوچنا تو پڑتا ہے۔" چوہدری جلال نے عجیب سے لہجے میں کہا تو بشری بیگم نے اس کے لہجے پر غور کرتے ہوئے بولی۔

"چوہدری صاحب! یہ معاملہ میرے بیٹے کا بھی ہے۔ میں اگر آپ کی بیوی ہوں تو ایک بیٹے کی ماں بھی

"آپ پہلے کبھی اسے فکر مند دکھائی نہیں دیے، آپ مجھے مال رہے ہیں؟"
 "بیگم! تمہیں معلوم ہی ہے کہ معاملہ کیا چل رہا ہے۔ میں نے کبیر کو بہت سمجھایا کہ حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے ہیں۔ مگر وہ مانا ہی نہیں۔ یہ وقت بھی آنا تھا کہ

ہوں کیا میں اپنے بیٹے کے لئے اتنا بھی حق نہیں رکھتی ہوں کہ اس کے لئے کچھ کر سکوں۔" وہ جذباتی انداز میں بولی تو چوہدری جلال نے کہا۔

"میں ہوں نا۔ اور اس معاملے کو دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔"

"نہیں چوہدری صاحب! مجھے اپنے بیٹے کے لئے ایک کوشش کر لینے دیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے بھی کوششیں کی ہیں لیکن وہ نہیں مانی میں ایک بار....." بشری بیگم نے کہا چاہا تو چوہدری جلال نے سختی سے کہا۔

"بیگم! تم مجھے مجبور کر رہی ہو۔ مجھے یہ احساس دلا رہی ہو کہ میں کچھ نہیں کر پاؤں گا۔ میں کوشش کر رہا ہوں نا۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات مان جائے گی۔" بشری بیگم نے بحث کرتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال نے چپے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ چاہے یقین بھی ہے لیکن میں نے جب کہہ دیا ہے تو بس کہہ دیا اب تم سو جاؤ۔" چوہدری یہ کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ بشری بیگم قم زدہ سی کمرٹ بدل کر لیٹ گئی۔ وہ تب سے سوچ رہی تھی۔ پھر اسے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ چوہدری جلال باہر لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے رانی کو بلایا اور اسے باہر لان میں چائے لانے کا کہہ کر چوہدری جلال کے پاس جانے کے لئے اٹھ گئی۔

چوہدری جلال اور بشری بیگم لان میں تھے اور رانی نہیں چائے سرو کر رہی تھی۔ بشری بیگم نے ادھر ادھر کی باتوں میں چوہدری جلال کا سوڈا بہتر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایسے میں چوہدری کبیر کی گاڑی پورچ میں آکر رکی۔ وہ گاڑی میں سے نکلا اور تیزی سے ان کی جانب آ گیا۔ اس کے چہرے پر انتہائی غصے کے آثار تھے۔ بشری

بیگم نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"آؤ کبیر، چائے پیو گے؟"

چوہدری کبیر نے ماں کی بات سن کر غصے میں کہا
"بابا! پہلے تو فہد ہی یہاں کے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکاتا پھر رہا تھا۔ لیکن اب ماسٹر دین محمد کی بیٹی سلسلی اور صفیہ دونوں مل کر واضح طور پر ہمارے خلاف اعلان جنگ کر رہی ہیں۔"

اس کے یوں کہنے پر چوہدری جلال اور بشری بیگم نے چونک کر اسے دیکھا۔ چوہدری جلال چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"ہوا کیا کبیر بیٹا۔ کچھ بتاؤ گے بھی؟"

"اتنے برس سے جو سکول ہم نے بند کروا دیا ہوا تھا۔ وہ آج سلسلی اور فہد نے جا کر کھول دیا ہے اور انہوں نے اعلان کیا کہ اب یہ سکول روزانہ کھلے گا۔ پولیس اب کیا کرنا چاہئے؟"

یہ خبر چوہدری جلال کے لئے کسی تازیانے سے کم نہیں تھی، یہ اس کی طاقت کے لئے بہت بڑا جھٹکا تھا۔ وہ خاموش ہی تھا کہ بشری بیگم نے کہا

"مگر اس میں اتنا غصے میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ غیرے باپادیکھ لیتے ہیں۔ تم ذرا صبر سے کام لو۔"

"نہیں بیگم! یہ صبر کرنے والا کام نہیں ہے، سکول کی کھنٹی، ہماری شکست کی صدا ہے۔ یہ برداشت نہیں ہوگی۔" چوہدری جلال نے دبے دبے غصے میں کہا تو چوہدری کبیر بولا۔

"اتنے برس سے جو ہمارا رعب و دبدبہ یہاں کے لوگوں پر طاری ہے، وہ انہوں نے چیلنج کر دیا ہے۔ کب تک انہیں نظر انداز کرتے رہے گے۔"

"سکول چلائے گا کون، ہماری مرضی کے بغیر یہاں عملہ نہیں آسکتا۔ پہلے کیا یہاں عملہ آیا ہے، سب اپنے گھروں میں بیٹھے تھے تو اب لے رہے ہیں۔ میرے

پتر جہاں تک پہنچ کرنے کی بات ہے، اس کی انہیں سزا جھکتنا پڑے گی۔

”لیکن بابا، انہیں روکنا تو ہوگا؟“ چوہدری کبیر نے فیسے میں کہا۔ پھر لمحہ بھر خاموشی کے بعد بولا۔ ”بابا آپ وقت حالات اور سیاست کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ میں آپ کو فقط یہ بتانے آیا ہوں، میں انہیں روکوں گا۔ ابھی اور اسی وقت.....“

”تم کچھ بھی نہیں کرو گے اور تمہیں کوئی ضرورت نہیں اس بارے میں سوچو بھی۔“ بشری بیگم نے حیزی سے کہا تو چوہدری کبیر نے سنی اُن سنی کرتے ہوئے کہا ”دن بدن ان کا حوصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ کی مصلحت حالات خراب کر رہی ہے، ایک دن سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میں یہ تمنا نہیں دیکھ سکتا۔“

”تم صرف تمنا نہ دیکھو، کہاں تمہیں کچھ نہیں کرنا۔“ بشری بیگم نے درشتی سے کہا تو چوہدری کبیر نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھا اور اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔ رانی نے کچھ برتن اٹھائے اور وہاں سے چل دی۔

☆.....☆.....☆

شام ڈھل کر رات میں بدل چکی تھی۔ صفیہ اپنے گھر کے اکلوتے کمرے میں زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کا دھیان نہ جانے کہاں تھا۔ اس کے قریب اس کے بچے چار پائی پر پڑے سو رہے تھے۔ وہ شام ہی سے رو رہی تھی۔ ایسا دکھ اس کے اندر سرایت کر گیا تھا کہ آلسو شک ہی نہیں ہو رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ سو جاتی، اس کا دکھ مزید بڑھ جاتا۔ جیسے اس کے اندر ساون برستے برستے رک ہی نہ رہا ہو، انتقام کی آگ ہی اتنی زیادہ تھی۔

ڈھلتی ہوئی شام کے وقت صفیہ چار پائی پر بیٹھی تھی۔ وہ سوئی سے کوئی کپڑا اسی رہی تھی۔ باہر سے بابا نعمت علی آیا تو وہ اسے دیکھ کر اٹھ گئی۔ بابا خاموشی سے آکر

بیٹھ گیا۔ بھی صفیہ نے دھیرے سے پوچھا۔

”خیر تو ہے بابا! سارا دن کہاں تھے۔ پلٹ کر گھر ہی نہیں آئے؟ کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے صبح سے۔“

”کھانا پینا کیا ہے بیٹی! جب ہر طرف خوف کا اندھیرا چھا جائے تو پھر کھانے پینے کا خیال کہاں رہتا ہے۔ بھوک پیاس تو جیسے اڑ گئی ہے۔ کچھ سوچ سمجھ ہی نہیں آئی۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں؟“ بابا نعمت علی نے بے بسی سے کہا تو صفیہ نے پوچھا۔

”کیا کرنا چاہتا ہے ٹو بابا؟“

”سو دلہہ تمہیں سمجھا رہا ہے بیٹی۔ ہم غریب لوگ چوہدریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اب تو ہم یہاں سے کہیں اور بھی نہیں جاسکتے کہ چلو اپنی جان بچا کر کسی طرف نکل جائیں۔“ بابا نعمت علی روہانسا ہوتے ہوئے بولا تو صفیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”لیکن کیا بات ہو گئی ہے بابا۔ ٹو ایسے کیوں سوچ رہا ہے۔“

”میں تو کچھ بھی نہیں سوچ رہا۔ میری اب سوچ کہاں رہی ہے۔ مجھے تو حکم کا پابند کر دیا گیا ہے۔“

بابا نعمت علی نے صاف انداز میں کہہ دیا

”کیسا حکم! ضرور انہوں نے تمہیں ڈرایا دھمکایا ہو گا۔ پر ٹو انہیں بتادے میں مر ٹو سکتی ہوں لیکن میں بدلہ ضرور لوں گی۔“ اس نے صاف کہہ دیا تو بابا نعمت علی نے فیسے سے کہا۔

”کیسے لے گی بدلہ، اتنی رقم ہے تیرے پاس جو ٹو خرچ کر سکے جن لوگوں کے سر پر ٹو بڑی بڑی ہاتھیں کر رہی ہے نا۔ وہ کل تیرے ساتھ نہ رہے ٹو کیا کرے گی۔ کون دے گا اتنی دیر تک تیرا ساتھ، تیرے ساتھ کون تھانے کچھریوں کے دھکے کھائے گا۔ کل کو جو تو تھک ہار کر چوہدریوں کے سامنے ہاتھ جوڑے گی، اچھا نہیں ہے کہ ٹو آج ان کی بات مان لے۔“ بابا نعمت علی نے اسے

سمجھایا تو صنفیہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ان کی بات ماننے سے پہلے میں مرجانا قبول کر لوں گی۔“

”تو پھر مرنے کے لئے تیار ہو جا۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ اگر تو نہیں مانی تو پھر.....“ وہ بے بسی سے کہتے ہوئے خاموش ہو گیا تو صنفیہ نے کہا۔

”وہ یہ بھی کر کے دیکھ لیں۔ جیتے جی تو انہوں نے مجھے اور میرے بچوں کو مار ہی دیا ہے اب جان سے بھی مار دیں۔ میں نہیں ڈرتی ان سے۔“

”دیکھ تو سمجھ جا، وہ جو دے رہے ہیں۔ لے کر صبر شکر کر لے۔ ورنہ بہت پچھتا تا پڑے گا۔ کیوں عذاب کو دعوت دے رہی ہے۔ کون ہے تیرا جو تجھے سنبھال لے گا۔ اپنے مستقبل کا سوچ، اپنے بچوں کا سوچ۔“ ہانپت علی نے غصے میں کہا اور چارپائی سے اٹھ کر باہر کی طرف نکل گیا۔ صنفیہ ایک دم سے افسردہ ہو گئی۔ اسے کوئی بھی حوصلہ دینے والا نہیں تھا۔ کیا وہ اپنا حق بھی نہیں لے سکتی؟ جس نے جرم کیا، اسی کی طرف داری ہو رہی ہے۔ کیا نظام ہے۔ اس نے آسمان کی جانب دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر آنسو تجھے کہہ دینے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

رات ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ صنفیہ اپنے کمرے میں افسردہ بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کے بچے سو گئے ہوئے تھے اسنے میں دروازہ پر دستک ہوئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا، پھر دروازہ کھولنے کے لئے اٹھی۔ اس نے لائین اٹھائی اور صحن پار کر کے دروازہ کھولا تو سامنے بشری بیگم کو کھڑی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کے ساتھ حویلی کی ایک ملازمہ رانی تھی۔ صنفیہ کے منہ سے سرسراتے ہوئے لگا

”چوہدرانی جی۔ آپ؟“

چوہدرانی نے اس کی طرف دیکھا اور نرم لہجے

میں بولی۔

”اعدا آنے کے لئے نہیں کہوں گی صنفیہ؟“

”آں، آؤ آؤ چوہدرانی آؤ۔“ صنفیہ نے کہا اور دروازے میں سے ہٹ گئی۔ چوہدرانی بشری بیگم اندر آ گئی۔ بچے سوئے پڑے تھے۔ وہ دونوں آنسوئے سامنے تھیں اور رانی ایک جانب کھڑی تھی۔ بشری بیگم خاموش تھی

”کہو چوہدرانی جی، کیسے آنا ہوا اور وہ بھی اس وقت؟“ ہاؤ جود کو کشش کے صنفیہ کے لہجے میں طعنے درآ رہا تھا، اس پر بشری بیگم نے نرم لہجے میں کہا۔

”رات کے اندھیرے میں کسی کے دروازے پر یا تو کوئی چور جاتا ہے یا پھر بہت مجبور، تمہارے سامنے ایک مجبور ماں کھڑی ہے۔ تم چاہو تو اس کی جھولی بھر سکتی ہو۔“

”چوہدرانی۔ میرا اللہ تو کسی کے ساتھ ہے انصافی نہیں کرتا پھر یہ جھولیاں بھر داتے رہتا، تم لوگوں کا ہی مقدر کیوں ہے۔ ہے کوئی اس کا جواب؟“ صنفیہ نے غصے میں پوچھا تو بشری بیگم بولی

”میں مانتی ہوں کہ میرے بیٹے سے ظلم ہو گیا۔ اس کے لئے میں تمہارے دروازے پر اس لئے چل کر آئی ہوں کہ تم بھی ماں ہو۔ میرے دکھ کو سمجھو گی اور.....“

”میں بھی تو ماں ہوں۔ کیا میرے یہ بچے مٹی کے کھلونے ہیں یا ان میں جان ہی نہیں ہے۔ ان کے سر سے تمہارے بیٹے نے باپ کا سایہ چھین لیا تو میں ماں ہو کر ان کا دکھ محسوس نہیں کرتی، کیا ہم غریبوں کے جذبات نہیں ہوتے۔ ہم سانس نہیں لیتے، ہمیں دکھ نہیں ہوتا؟“ صنفیہ غصے کی شدت میں کہتی چلی گئی تو بشری بیگم نے اسی نرم لہجے میں کہا۔

”میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں لیکن جو ہوتا تھا وہ ہو گیا صنفیہ اب نڈیر واپس تو نہیں آئے گا، تم ان بچوں کے مستقبل کے لئے جو مانگو میں دینے کو تیار ہوں بس میرے

بیٹے کو معاف کر دو۔“

صبح کے وقت صفیہ چوہے کے پاس بیٹھی آگ
جھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ابھی بابا نعمت علی گھر میں آیا
اور آتے ہی پوچھا

”صفیہ! یہ میں کیا سن رہا ہوں رات چوہدرائیں آئی
اور ٹو نے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ تیرا دامخ تو نہیں خراب
ہو گیا۔ جانتی ہو وہ ہمارے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟“

”کیا کر سکتے ہیں۔ یہی ناکہ وہ ہمیں مار دیں
گے۔ تو مارویں۔ ایسی زندگی جی کر ہم کیا کریں گے۔ جس
میں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔“ اس نے نفرت سے
جواب دیا تو بابا نعمت بولا

”اصل میں تیرا دامخ خراب کیا ہے ماسٹر دین محمد
کی بیٹی نے وہ کچھ لینا وہ تیرا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ وہ
خود ساری زندگی چوہدری کے سامنے اونچی سانس نہیں
لے سکے۔ وہ تیرا کیا ساتھ دیں گے؟“

”جب خون کے رشتے ہی سفید ہو جائیں تو پھر کوئی
ساتھ دے یا نہ دے نہ پر تیرا بھی تو بیٹا تھا بابا۔ ٹو ان سے
بدلہ لینے کی بجائے مجھے خوف زدہ کر رہا ہے؟“ صفیہ نے
جناپا تو بابا نعمت نے سمجھایا۔

”بدلہ تو وہاں لیا جاتا ہے جہاں طاقت ہو۔ ہم بے
طاقت بے بس لوگ بھلا ان سے کیا بدلہ لے سکتے
ہیں۔ ہم لوگ تو سکون سے سانس لے لیں یہی قیمت
ہے۔“

”تو پھر ہمیں جینے کا بھی کوئی حق نہیں ہے بابا۔“
صفیہ طعنے میں بولی

”کو پہلے ایسی تو نہیں تھی۔ بات مان جایا کرتی
تھی۔ لیکن جب سے ماسٹر دین محمد کی بیٹی نے تیرا دامخ
خراب کیا ہے۔ ٹو آگ اگل رہی ہے۔ میری بات مان
جائیں اس بڑھاپے میں میری زندگی خراب کر رہی
ہے۔ مان جا۔ ورنہ۔۔۔۔۔“ وہ طعنے میں کہتا ہوا رک گیا۔

”ورنہ کیا بابا تو کہنا کیا چاہتا ہے۔“ وہ ایک دم

”نہیں اتم نہیں دے پاؤ گی اور نہ ہی تمہیں
ہمارے دکھ کا احساس ہے۔ اگر احساس ہوتا تو یوں
میرے زخموں پر نمک چھڑکنے نہ آ جاتی۔“ وہ انتہائی دکھ
سے بولی تو بشری بیگم نے مان سے پوچھا۔

”تم مانگ کر تو دیکھو صفیہ! میں دوں گی۔ بولو؟“
”کیا تم اپنا بیٹا مجھے دے سکتی ہو یا میرے بچوں کی
طرح اس کے باپ کا سایہ دے سکتی ہو اسے بھی جیم کر
سکتی ہو۔“ صفیہ نے طعنے میں کہا تو بشری بیگم بھی طعنے میں
بولی۔ ”یہ کیا بک رہی ہو؟“

”ابھی تو میں نے بات کی ہے اور چوہدرائی تم
اپنے آپ میں نہیں رہی۔ دکھ کبھی ہو میرا؟ تم لوگ کیوں
نہیں سمجھو کہ غریب بھی حق پر ہو سکتا ہے۔ تم میرے سر
کے سائیں کا خون خریدنے آئی ہو۔“ صفیہ نے نفرت
سے کہا تو بشری بیگم طعنے میں بولی۔

”ہوش کی دوا کر صفیہ! تم جس کی زبان بول رہی
ہو۔ وہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتی؟“

”کون کسی کو کچھ دے سکتا ہے، ابھی تم نے بھی
دعویٰ کیا تھا۔ سنو چوہدرائی! مجھے اس دنیا میں انصاف ملے
یا نہ ملے لیکن قیامت کے دن تم لوگوں کا گریبان میرے
ہاتھ میں ہو گا میں اپنے شوہر کے قاتل کو سزا دلوا کر رہوں
گی۔ اس دنیا میں کوشش کروں گی۔ اگلے جہان میرا رب
مجھے انصاف دے گا۔“ وہ طعنے بھرے لہجے میں حیرانہ انداز
میں بولی تو بشری بیگم نے حقارت سے کہا

”ابھی تم ہوش میں نہیں ہو۔ جب ہوش میں آؤ تو
میرے پاس آ جانا۔ میں تمہیں تمہارے قصور سے بھی
زیادہ دے دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے رانی کو چلنے
کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں باہر کی جانب چلی گئیں تو صفیہ
بے بس ہو کر رونے لگ گئی۔ پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ
لگ گئی۔

بزنک انھی تو وہ بھی غصے میں بولا۔

"میں یہی کہنا چاہتا ہوں ٹو اگر میری بات نہیں مانے گی۔ تو پھر تیرا ہمارا تعلق کیا رہ جائے گا۔ ٹو پھر جہاں جانا چاہئے چلی جا۔"

"بابا! ٹو کبھی اتنا کمزور تو نہیں تھا۔ میں ان بچوں کو لے کر چلی جاؤں گی۔ نہیں رہوں گی، چلی جاؤں گی۔" اس نے بھی کہا

"ہاں ہاں چلی جا ہماری جان تو عذاب میں نہیں رہے گی نا" بابا نعمت نے تنگ آتے ہوئے کہا تو وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔
"چلی جاؤں گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے ردی۔ بابا چند لمحے کھڑا رہا پھر باہر کی طرف نکل گیا۔ صفیہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

صفیہ اپنے گھر کے صحن میں دھری چار پائی پر بیٹھی رہ رہی تھی۔ ایسے میں سلسی اس کے گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے دور سے دیکھا اور پریشان ہو گئی۔ وہ اس کے قریب گئی تو صفیہ نے اس کی طرف دیکھا اور مزید شدت سے رونے لگی۔ تب سلسی نے تشویش سے کہا

"کیا ہوا صفیہ! کیوں ردی ہو۔ کیوں بکلا یا مجھے۔ خیریت تو ہے نا۔"

"بابا نے مجھے اس گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا ہے۔" صفیہ نے سسکتے ہوئے کہا اور شدت سے رو پڑی تو سلسی نے چوکتے ہوئے کہا۔ "اُدو! وہی ہونا جس کا ڈر تھا۔ پر تم گھبراتی کیوں ہو، کیوں حوصلہ ہار رہی ہو۔ میں ہوں نا۔"

"تم کب تک میرا اور میرے بچوں کا بوجھ اٹھا پاؤ گی۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پال لوں گی لیکن یوں میرے سر سے جھت چھین لی جائے گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کہاں جاؤں گی؟"

صفیہ نے روتے ہوئے کہا

"تو حوصلہ کر اور چل میرے ساتھ کہتے ہیں، ایک در بند سود کھلے۔ اپنا سامان اگر لینا چاہتی ہے تو لے لو اور سیدھی میرے پاس آ جا، اپنے بچوں کو لے کر۔ میں تمہارا سہارا ہوں گی۔" سلسی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

"تم کیسے؟" صفیہ نے حیرت سے پوچھا
"میں نے کہا نا، فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ رونا دھونا بند کرو اور چلو میرے ساتھ۔" سلسی نے کہا۔

"سلسی! کیا مجھے انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ بابا غصے میں کہہ کر تو گیا ہے۔ شاید اسے اپنے پوتوں کا خیال آ جائے۔ مجھے جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا تو سلسی بولی۔

"تم چاہو تو انتظار کر لو مگر ایک دن تجھے اس گھر سے جانا ہوگا۔ یہ چودہریوں کی ملکیت ہے۔ بہر حال تم جب چاہو اور جس وقت چاہو میرے پاس آ سکتی ہو۔ میں تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھوں گی۔"

"تو پھر میں دیکھ لوں بابا کو؟" صفیہ نے پوچھا۔
"ہاں دیکھ لو جیسے تمہارا دل چاہے۔" سلسی نے اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔ صفیہ نے حسرت بھری نگاہوں سے اس گھر کے درد یوار پر نگاہ ڈالی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سلسی اسے دلاسا دینے لگی۔

ماسٹر دین محمد اور فہد دالان میں بیٹھے ہوئے ہاتھیں کر رہے تھے۔ فہد نے کہا

"استاد جی۔ آپ ایک دو دن میں تیار رہیں۔ آپ کو میرے ساتھ نور پور جانا ہوگا۔ وہ آپ کا پٹن کس منظور ہو گیا ہے۔ وہاں سے چیک لینا ہوگا۔"

"اُد پتر۔ میں جانتا ہوں ان جگہ والوں کو۔ اتنی جلدی کہاں وہ چیک دینے والے ہیں۔ ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو لگ ہی جائے گا۔ یہ جگہ فرض شناسی سے کام کریں نا تو اس ملک کے آدمے مسائل خود بخود حل ہو

☆.....☆.....☆

چوہدری کی حویلی میں در آنے والی وہ صبح اتنی خوشگوار نہیں تھی۔ چوہدری جلال گہری سنجیدگی کے ساتھ دالان میں بیٹھا گہری سوچ میں گم تھا۔ چہرے پر غصے کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے میں بشری بیگم چائے لے کر دھیرے دھیرے قریب آئی اور میز پر چائے رکھ کر اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چوہدری جلال نے اس کی طرف دیکھا اور پھر سرد لہجے میں پوچھا۔

”تمہیں جب میں نے ہدکا تھا کہ اس بیچ ذات کی عورت کے پاس نہیں جانا تو پھر تم کیوں گئیں؟“

”چوہدری صاحب! میں نے پہلے بھی آپ سے کہا ہے کہ میں ماں ہوں۔ اور میں اپنے بیٹے کے لئے.....“

بشری بیگم نے کہنا چاہا مگر وہ اس کی بات ٹوک کر بولا۔

”مگر شوہر کی حکم عدولی کر چکی ہو۔ کیا میں سمجھ لوں کہ اب تمہیں شوہر سے زیادہ اپنا بیٹا عزیز ہو گیا ہے۔ جو کہ واقعی گناہ گار ہے۔“

”میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی سربراج کہ میں آپ کی حکم عدولی کروں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے دلوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ”مجھے معاف کر دیں۔ پہلی اور آخری بار معاف کر دیں۔“

”تم جانتی ہو بیگم، ان بیچ ذات کے لوگوں کے بارے میں۔ ان لوگوں سے نرم لہجے میں بھی بات کر لو تو یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے تمہاری بات نہیں مانی۔“ چوہدری جلال نرم پڑتے ہوئے بولا تو بشری بیگم نے اپنے دلوں ہاتھوں سے چائے کی پیالی اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

”اس کے دماغ میں تو بہت آگ بھری ہوئی ہے۔ وہ کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتی۔“

”وہ اس وقت پوری طرح دشمنوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اسے اتھار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں لیکن

ہیں۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا۔ اسی وقت سلسلی ہاہر گیٹ سے اندر آ گئی۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ قریب آ کر رک گئی تو ماسٹر دین محمد نے اس سے پوچھا۔ ”خیر تو تمہیں صوفیہ نے بڑی جلدی میں تمہیں بلایا تھا؟“

”وہ بالائیت علی نے اسے اپنے گھر سے گل جانے کو کہا ہے چوہدریوں کی بات نہ ماننے پر۔“ سلسلی نے افسردگی سے کہا۔

”تو پھر تم نے کیا کہا؟“ ماسٹر دین محمد نے پوچھا۔

”میں نے کہا۔ آ جاؤ۔ میرے گھر میں اس کی ذمہ داری لیتی ہوں۔ آپ کہیں.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے سوالیہ انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا تو فہم لے تیزی سے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک کہا تم نے۔ وہ جب بھی آئے تم اسے چاہے عمر حیات کے گھر ٹھہرا دو۔ اگر وہ وہاں خطرہ محسوس کرے تو یہاں۔ جیسا تم چاہو۔“

”اب اگر اس کی ذمہ داری لی ہے تو پوری طرح سے نبھانا۔ یاد رکھنا، اس کے آنے کے ساتھ تمہیں دکھ اور پریشانیاں بھی مل سکتی ہیں۔“ ماسٹر دین محمد نے سمجھایا۔

”مجھے احساس ہے لما جی، میں نے یہ ذمے دہی صرف ایک مظلوم کا ساتھ دینے کے لئے لی ہے۔“ سلسلی نے کہا تو ماسٹر دین محمد نے سکون سے حاصل دیا۔

”تو پھر ٹھہرانا نہیں، وہ اوپر والا تیرا ساتھ ضرور دے گا۔“

”آپ نے چائے وغیرہ پی، میں لاؤں؟“ سلسلی نے پوچھا تو فہم نے کہا۔

”نہیں! ضرورت نہیں۔ میں بھی ذرا سراج کی طرف جا رہا ہوں۔ تمہاری وجہ سے استاد جی نے مجھے بلوا لیا۔ اچھا، میں اب چلتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر چل دیا۔ سلسلی نے اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اندر چلی گئی۔

لئے فہد اور اس کے ساتھ بندے بھی موجود ہیں۔" ماکے نے بتایا تو چوہدری کبیر نے چوکتے ہوئے پوچھا۔ "کتنے بندے لئے بھرتے ہیں؟"

"تھوڑے سے ہیں۔" ماکے نے بتایا۔
"آخر ہے، جتنے بھی ہوں۔ تیاری کرو سکول تو بند ہونا ہی ہے۔ آج اس فہد کی زندگی کی کتاب بھی بند کر دیتے ہیں۔ دیکھتا ہوں کون سکول چلاتا ہے؟" چوہدری کبیر نے طے میں کہا تو ماکھا بولا۔
"جو حکم چوہدری صاحب۔"

چوہدری کبیر کا ریڈور سے نکلا، میز پر پڑے ہوئے سٹر سے ریو اور نکالا اور پھر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ چوہدری کبیر نے گاڑی سٹارٹ کر لی۔ اس دوران اس کے ملازمین بھی ایک دوسری جیب میں بیٹھنے لگے۔ ایسے میں ڈیرے کے پھاٹک میں گاڑی آ کر رک گئی۔ اس میں سے فٹنی نے نکل کر مودب انداز میں دروازہ کھولا۔ تو بشری بیگم باہر نکل آئی۔ چوہدری کبیر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ وہ حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے جلدی میں اپنی گاڑی میں سے باہر آ کر طے میں اپنی ماں سے بولا۔

"آج تک حویلی کی کوئی عورت ڈیرے پر نہیں آئی۔ یہ بات آپ جانتی ہو ماں، ایسا کیا ہو گیا ماں کہ....."

"کہاں جا رہا ہے تو؟" بشری بیگم نے پوچھا۔
"جن لوگوں نے سکول کھولا ہے نا انہیں سبق دینے جا رہا ہوں۔" چوہدری کبیر نے طنز یہ لہجے میں کہا تو بشری بیگم سکون سے بولی۔

"چل میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔"
"او کیا ہو گیا ہے ماں، میں کوئی کچ کی گولیاں کھینے نہیں جا رہا۔ میرا راستہ مت روک۔" چوہدری کبیر نے احتجاجاً کہا تو بشری بیگم ہنسی سکون سے بولی۔
"میں تیری گاڑی میں بیٹھ رہی ہوں۔ تو چاہے تو

نہیں جانتے۔ ان کا سامنا کس سے ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔" چوہدری جلال نے حکارت سے کہا اور پیالی پکڑ لی۔

"کہیں میرے بیٹے کبیر کو کچھ....." بشری بیگم نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میرا بھی وہ بیٹا ہے اگر اسے کچھ ہوتا ہے تو پھر ہماری سیاست کا کیا فائدہ؟ میں تو ان کی اچھل کود دیکھ رہا ہوں۔ کبیر محفوظ ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے چائے کی پیالی اٹھالی اور ہلکا سا لپکا۔ بشری بیگم حسرت و یاس سے اپنے شوہر کی جانب دیکھتی رہی، جو سوچ میں کھویا ہوا سہ لے رہا تھا۔
بشری نے چوکتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں ہے میرا کبیر وہ حویلی میں تو نہیں ہے۔"
"ڈیرے پر ہے بلوا لوائے، اگر بلا سکتی ہو تو، کیونکہ آج سکول کی کھٹی پھر بجے گی اور وہ لوگ یہ کھٹی پونہی نہیں بجا رہے ہیں۔ میں نے اسے بہت سمجھایا، وہ نہیں مان رہا۔" چوہدری نے بے بسی سے کہا۔

"مطلب، دشمن یہ چاہتے ہیں کہ تصادم ہو اور....." بشری بیگم نے کہا اور پریشانی کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی، چوہدری جلال نے پیالی واپس میز پر رکھ دی۔

چوہدری کبیر خطرناکی انداز میں ڈیرے کے کوریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور طے کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس نے ماکھا آگیا تو چوہدری کبیر نے پوچھا۔

"ہاں بول ماکے، کیا خبر ہے۔ آج بھی انہوں نے سکول کھولا ہے یا پھر بس تالا توڑنے ہی کا شوق تھا اور ایک دن ہی گھنٹیاں بجا کر قایم ہو گئے؟"

"نہیں چوہدری صاحب، سہمی کچھ بچوں کے ساتھ سکول کی طرف ہی جا رہی ہے اور اس کی حفاظت کے

جو اس کی جگہ اے ایس پی آیا ہے اس کا موڈ کوئی آپ کے حق میں نہیں لگتا۔ وہ سیدھے سیدھے فہد کی بات کرتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے چوہدری صاحب، کیا ملک نعیم، انتظامی طور پر اتنی اپروچ رکھتا ہے؟" وکیل نے سمجھا تو چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"لگتا نہیں ہے کہ وہ اتنی اپروچ رکھتا ہوگا۔"

"نہیں آپ یقین سے بات کریں۔" وکیل نے پوچھا۔

"نہیں، نہ اس کی اہمیت ہے اور نہ اس کے اس قدر تعلقات ہیں۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا تو وکیل بولا

"تو پھر سوچئے چوہدری صاحب، کہیں آپ سیاسی طور پر ناکام تو نہیں ہو رہے؟ آپ کا اثر و رسوخ کدھر گیا؟ یا پھر مان لیں کہ ملک نعیم اپروچ رکھتا ہے اور وہ سیاسی طور پر مضبوط ہو گیا ہے۔"

"میرا ذہن نہیں مانتا کہ وہ اتنا بڑا کھیل، کھیل سکتا ہے۔ جہاں دشمن کی کمزوریوں اور خامیوں پر نظر رکھی جاتی ہے، وہاں اس کی خوبیوں پر بھی نگاہ ہوتی ہے۔ وہ اتنی اہمیت نہیں کر سکتا۔" چوہدری جلال حتمی لہجے میں بولا۔

"کیا وہ اہمیت کر بھی نہیں سکتا؟" وکیل نے پوچھا۔

"اگر اس نے حوصلہ کر ہی لیا ہے تو اس کا راستہ روکنا بہت ضروری ہوگا۔" اس نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"کب راستہ روکیں گے آپ جب اس کے مہرے مضبوط ہو کر آپ کو شہ مات دینے کے لئے آپ کے سر پر آ پہنچیں گے؟" وکیل نے کہا تو چوہدری کبیر تڑپ کر بولا۔

"بابا، اجازت دیں ملک نعیم کا ہی پٹہ صاف کر دیتے ہیں سارے مہرے خود ہی پٹ جائیں گے۔"

"پٹہ صاف کر دینا بہت آسان ہوتا ہے کئے چوہدری جی۔ مگر پھر اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، یہ احساس ہوگا آپ کو۔ میں کبھی بھی یہ مشورہ نہیں دوں گا۔"

مجھے سکول لے جایا داپس حویلی۔ میں نے تیرے باپ سے وعدہ کیا ہے کہ اب تجھے کوئی خون نہیں کرنے دوں گی۔"

وہ اپنا آنچل سنبھالتے ہوئے چوہدری کبیر کی گاڑی میں جا بیٹھیں۔ وہ بے بسی میں چند لمحے سوچتا رہا پھر ملازمین کو واپس جانے کا اشارہ کر کے اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

حویلی کے ڈرائیونگ روم میں چوہدری جلال، وکیل اور چوہدری کبیر تینوں صوفوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

منشی کھڑا تھا۔ چوہدری کبیر غصے میں کہہ رہا تھا۔

"بابا میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ جو اچانک یہاں تماشے ہونا شروع ہو گئے ہیں، یہ کوئی فہد کا کمال نہیں بلکہ اس کے پیچھے ملک نعیم ہے۔ وہی سب کچھ کروا رہا ہے۔"

"کئے چوہدری جی آپ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟ یا فقط آپ کا اندازہ ہے؟" وکیل نے پوچھا۔

"دوسری بار الیکشن ہارنے کے بعد وہ اچانک خاموش ہو گیا اور ہم نے اس کی خاموشی کو نظر انداز کر دیا مگر وہ اندر ہی اندر ہمارے خلاف سازشیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ صفیہ کے لئے اس نے پریس کانفرنس کر دی تو وہ کھل کر سامنے آیا۔ اب وہ باقاعدہ فہد سے مل کر گیا ہے، یہاں اس گاؤں میں آکر، اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"یہ ثبوت نہیں ہیں کئے چوہدری صاحب۔" وکیل نے کہا تو چوہدری جلال بولا۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب۔"

"ڈرائیونگ کریں چوہدری صاحب، ریونیو آفیسر نے فہد کے حق میں فیصلہ دیا تو آپ نے اس کا تبادلہ کروا دیا۔ ڈی ایس پی کا تبادلہ کروا گیا، اس نے سیاسی دباؤ برداشت نہیں کیا۔ مطلب آپ کی بات نہیں مانی اور

دکیل نے کہا تو چوہدری کبیر انتہائی طنزیہ لہجے میں بولا۔
 ”تو پھر کیا کریں دکیل صاحب، اب ان کی منت تو کرنے سے رہے۔“

”کام، کیسا کام؟“ اس نے پوچھا۔
 ”کو ہے کہ نہ حویلی آیا ہے اور خدایہ سے چہ اور نہ ہی تو فون پر مٹا ہے۔ لگتا ہے نئے اے ایس پی نے جھ سے کوئی زیادہ ہی کام لینا شروع کر دیا ہے۔“ فشی نے طنزیہ لہجے میں کہا تو تھانیدار چڑھتے ہوئے بولا۔
 ”اوائے کام کیا فشی، اس اے ایس پی نے تو پڑھنے پادیا ہے۔ یہ پہلا افسر ہے جس کی ابھی تک مجھے سمجھ نہیں آئی۔ اور جس دن اس کی مجھے سمجھ آگئی اس کی ساری افسری تمہا کر کہ دوں گا۔ خیر، تو کام بول۔“
 ”کام یہ ہے کہ وہ جو چھکا کا ہے نا، اسے کچھ دن اس طرح اندر رکھنا ہے کہ وہ باہر نہ آ پائے۔ بس اتنا سا کام ہے، جو ٹوٹنے کرنا ہے۔“ فشی نے بتایا۔
 ”کچھ دن، مطلب؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہاں، اگر بات نہیں مانتا تو پھر اسے لٹا بیچ دے مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ فشی نے کہا۔
 ”اؤ بے مدعا کیا ڈالنا ہے اس پر؟ دیکھتے تھے پتہ ہے نئے افسر کا، جو کام بھی ہوتا ہے وہ پھر پکا ہی ہوتا ہے۔“ تھانیدار نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
 ”میں کون سا کہہ رہا ہوں کہ ٹوکا کام کر۔ کام تو پکا ہی ہوتا جانیے۔ وہ خود کو چشم دید گواہ بنائے پھرتا ہے نا نذیر کا۔“ فشی نے اسے سمجھایا تو تھانیدار نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”میں تو جانتا ہوں دکیل صاحب، لیکن کبیر کو کون سمجھائے۔ یہ جو چند لوگ یہاں کھیل تماشے کر رہے ہیں ان کی کوئی اوقات ہی نہیں ہے۔ بس اصل وجہ تک پہنچنا ہے۔ اس کی سمجھ آگئی تو یہ سب خود بخود ختم ہو جائے گا۔“ چوہدری جلال نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
 ”یہی بات اس وقت سمجھ آئے گی جب یہ نکلے چوہدری سیاست سیکھیں گے، تو پتہ چلے گا۔“ دکیل نے سمجھایا تو چوہدری جلال بولا۔
 ”وہ تو میں نے آپ سے کہا ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔ باقی میں سب دیکھ لوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فشی کی طرف دیکھ کے پوچھا۔
 ”دیکھو کھانا لگ گیا ہے؟“
 ”جی لگ گیا ہے، آپ آئیں۔“

اس نے کہا تو سبھی اٹھ گئے تو فشی فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے تھانے کے نمبر ڈائل کئے اور انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد تھانیدار نے فون اٹھالیا۔ اس نے فشی کو پہچانتے ہوئے پوچھا۔
 ”اوائے فشی جی کیا حال ہے تیرا؟ کیسے کیا فون؟“

”میں ٹھیک ہوں، سن اتیرے ذمے یہ کام لگا ہے۔“

”تو پھر اور کیا کروں میں۔ اس صفیہ کو منانے گئی تھی لیکن اس نے تو کوئی اُمید بھی نہیں چھوڑی۔“ بشری بیگم نے حسرت سے کہا۔ اس دوران چوہدری کبیر نے کمرے میں آتے ہوئے اپنی ماں کی بات سن لی۔ بھی اس نے وہ دے دے غصے میں کہا

”آپ نے وہاں جا کر اچھا نہیں کیا ماں! نہیں جانا چاہئے تھا وہاں۔“

”تم! میں تو اس کے پاس.....“ بشری بیگم نے چونک کر کہا تو چوہدری کبیر حقارت سے بولا۔

”یہ ہماری شان اور مرتبے کے خلاف ہے کہ آپ اس کی کمین عورت کے دروازے پر چل کر گئی ہو۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا پولیس پکڑ کر لے جاتی مجھے ہنرا ہو جاتی۔ میں مر جاتا۔“

”اللہ نہ کرے پتر! یہ تو کیسی باتیں منہ سے نکال رہا ہے۔ براہو دشمنوں کا تمہارے سر پر تو میں نے ابھی سہرے دیکھنے ہیں۔“ بشری بیگم نے تیز لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ یہ بات کی ہے نا آپ نے کام کی، میں یہی بات کرنے کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ اس نے کہا تو بشری بیگم نے چونک کر کہا۔

”یہی بات۔! کیا مطلب، تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔“

”آپ نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا نا کہ میری پسند کون ہے؟“ چوہدری کبیر نے کہا۔

”ہاں پوچھا تھا کون ہے وہ بتاؤ مجھے، میں اسے ہی تمہاری دلہن بناؤں گی۔ بتا پتر؟“ بشری بیگم نے خوش ہو کر کہا تو چوہدری کبیر بولا۔

”تو سنو ماں، میری پسند، ماسٹر دین محمد کی بیٹی سلٹی ہے، وہی میری دلہن بنے گی۔“

”یہ.....“ یہ کیا کہہ رہے ہو تم، سلٹی، وہ کیوں؟“ بشری بیگم نے شدید حیرت سے کہا تو چوہدری

کرتے ہوئے کہا

”وہ تو ٹھیک ہے بتا دوں گا۔ پر ہم جو چوہدریوں کی اتنی غلامی کر رہے ہیں ادھر ادھر جو دینا ہے وہ بھی ہم پلے سے ہی دیں۔“ تھانیدار نے کہا

”کتنا چاہئے ہوگا اس کام لے لئے؟“ منشی نے پوچھا۔

”کام دیکھ لو، رقم بھی خود طے کرلو تم نے کون سا رقم دینی ہے۔“ تجھے پتہ تو ہے کہ گاڑی بنا پیٹرول کے نہیں چلتی۔“ اس نے واضح انداز میں کہا تو منشی بولا۔

”ٹوہ عاڈال، رقم تجھے پہنچ جائے گی۔“

”بس تو کوئی کام کا بندہ تلاش کر کے رکھ باقی ٹکرنہ کر۔“ تھانیدار نے بھی یقین دہانی کروادی تو منشی بولا۔

”بندے بڑے، لب میں فون رکھتا ہوں۔“

منشی نے رسیور کر لیل پر رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

بشری بیگم انفرادی بیٹھی سوچ رہی تھی کہ رانی آ گئی۔ اس نے پاس بیٹھ کر ہولے سے پوچھا۔

”بیگم صاحبہ، آپ تو بہت زیادہ ہی پریشان ہو گئی ہیں۔“

”معاملہ میرے پتر کا ہے۔ کیا مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کوئی میرے بس کی بات ہے پتہ نہیں کیا ہو گا۔“ بشری بیگم نے حسرت سے کہا تو رانی قالین پر

صوفے کے ساتھ بیگم کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”بیگم صاحبہ! بھلا مجھے بتائیں۔ آپ اگر یونہی پریشان رہیں تو کیا یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔ نہیں نا“

”تم کہتی تو ٹھیک ہو لیکن یہ میرا دل جو ہے نا، بہت لڑ رہا ہے۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔“ بشری بیگم نے سوچتے ہوئے کہا تو رانی بولی۔

”آپ ماں بن کر سوچ رہی ہیں نا لیکن پریشانی سے کچھ نہیں ہوگا۔“

کیر مسکراتے ہوئے بولا۔

”اس کیوں کا جواب، میں اس وقت دوں گا، جب وہ میری دلہن بن گئی۔“

”جینا، کہاں وہ کہاں تم؟ یہ جوڑ بنائی نہیں ہے۔ تم خواہ خواہ ضد کر رہے ہو۔ ایسا مت سوچو تمہارا معاملہ جلدی ختم ہو جائے گا تو ہم تمہیں بہت اونچے گھرانے سے دلہن لا کر دیں گے۔ پھر ایسا نہیں سوچنا۔“ بشری بیگم نے انکار کرتے ہوئے کہا

”ماں! میں نے کہہ دیا اور بہت سوچ سمجھ کر یہ کہا ہے۔ وہ ہر حال میں میری دلہن بنے گی۔ اور بس۔“

چوہدری کیر نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بشری بیگم حیرت زدہ سی بیٹھی رہ گئی۔ رانی نے اس کی طرف دیکھا اور کھبرا کر پلٹ گئی۔

رات کا دوسرا پہرا بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ چوہدری جلال حلی کے دالان میں بیٹھا گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ بشری بیگم نے اسے یوں دیکھا تو دھیرے قدموں سے اس کے پاس آئی تو چوہدری نے اس کی طرف دیکھ کر ایک طویل سانس لیا۔

”آپ نے سونا نہیں۔ رات اتنی گہری ہو گئی ہے۔“ بشری بیگم نے پوچھا تو چوہدری جلال اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”بیگم! یہ جو تو نے کیر کی ضد بارے مجھے بتایا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ماسٹر دین محمد کو ساری زندگی ہم نے دبا کر رکھا ہے اس کی بیٹی سلٹی بارے کیر کی خواہش۔۔۔۔۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔“

”میں نے اپنے طور پر معلوم کیا چوہدری صاحب! اپنا کیر۔ اس سلٹی کے لئے اپنے دل میں محبت پال چکا ہے۔ جس کا اظہار وہ کرتا رہا ہے۔ ہم ہی غافل رہے ہیں۔“ بشری بیگم نے اس پر واضح کر دیا تو چوہدری جلال نے چومتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب! یہ محبت کیا ہوتی ہے۔ فضول ضد ہے کیر کی یہ۔ اسے یہیں ختم کرنا ہوگی یہ ضد۔ بتا دینا اسے میں ایسا سمجھی نہیں ہونے دوں گا۔“

”میں بھی نہیں چاہتی کہ کیر ایسی خواہش کرے لیکن اگر سختی سے روکیں گے تو ممکن ہے وہ ہماری بات نہ مانے اور۔۔۔۔۔“ بشری بیگم نے کہنا چاہا تو وہ بات کاٹ کر بولا۔

”وہ کچھ بھی کر لے۔ ایسا ممکن نہیں ہوگا۔“ پھر ایک دم سے خاموش ہو کر لمحہ بھر لکے لئے سوچا اور بولا

”بیگم! تم نے یہ معلوم نہیں کیا کہ اس لڑکی سلٹی نے ہی کیر پر ڈور بٹالے ہوں؟“

”وہ کیر سے نفرت کرتی ہے۔“ بشری بیگم نے ہولے سے کہا تو چوہدری جلال سمجھتے ہوئے بولا۔

”تو پھر وہ ایسا صرف اپنی ضد اور انا کے لئے کرنا چاہتا ہے۔ اسے سمجھا دو وہ ایسی فضولیات میں نہ پڑے۔ بلکہ اس جاگیر کو سنبھالنے کے لئے خود کو تیار کرے۔ اگر میں نہ رہا تو وہ کچھ نہیں کر پائے گا۔“

”اللہ نہ کرے، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یہی بتانا چاہ رہی کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اسے آہستہ آہستہ منالوں گی۔ اس کے ذہن سے سلٹی نکال دوں گی۔ آپ اس کے لئے جلدی دلہن دیکھ لیں۔ پھر وہ سب بھول جائے گا۔“ بشری بیگم نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”ایسا ہی کرنا ہوگا۔ بس یہ نذیر والے معاملے کی دھول کم ہو جائے۔ پھر اس کی شادی کر دیتے ہیں۔“

چوہدری جلال نے حتمی انداز میں کہا تو بشری بیگم بولی۔

”یہی بہتر رہے گا۔ آپ آئیں۔ آرام کریں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔“

”چلو۔“

چوہدری جلال اٹھ گیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے اپنے

منافقت

☆ انسان اپنی غلطی پر اچھا "ذکیل" بن جاتا ہے اور دوسروں کی غلطی پر سخت "جج" بن جاتا ہے۔
☆ اگر اپنے رزق اور مسائل کے فیصلے اللہ پر چھوڑے ہیں تو پریشان کیوں ہو؟ اور اگر لوگوں پر چھوڑے ہیں تو پھر حیران کیوں ہو؟
☆ دنیا سے ایسا تعلق رکھو جیسا کہ تم آگ سے رکھتے ہو۔ اس سے اپنے آپ کو بچاتے بھی ہو اور نفع بھی حاصل کرتے ہو۔ (حکیم محمود - سایہ وال)

چھاکے، ہم لوگوں کے کہنے پر نہ جا، اپنے اندر سچ بولنے کی اہمیت پیدا کر۔ وہی سچ کہنے کا حوصلہ کر جو اصل حقیقت ہے۔ چوہدری زیادہ سے زیادہ جان سے مرادے گا، اس سے آگے وہ کیا کر سکتا ہے، یہ سوچ لے۔ "یہ کہہ کر فہد چھاکے کے دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "یہ جو کہتا ہے وہ کر۔"

"نہیں فہد! میں نے فیصلہ کر لیا ہوا ہے۔ میں نے تو وہی کہا ہے جو حقیقت ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ میں آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔"

چھاکے نے صاف لہجے میں کہا تو سراج بولا۔
"تو پھر کیا غم ہے۔ یہ رونی صورت کو ختم کر۔"

"میں پریشان اس لئے نہیں ہوں کہ انہوں نے مجھے دھمکی دی یا وہ میرے کسی فیصلے پر اثر انداز ہوں گے۔ میں پریشان اس لئے ہوں کہ اگر میری وجہ سے نئے چوہدری کو سزا ہوتی ہوئی نظر آئی تو وہ مجھے مارنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس طرح صنیہ کو انصاف تو نہیں مل سکے گا۔" چھاکے نے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی تو فہد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب وہ وقت ختم ہو چکا ہے چھاکے۔ کبیر جس طرح پہلے اس علاقے میں بد معاشی کر رہا تھا اب ویسا

کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

صبح کی نماز کے بعد فہد اور سراج چہل قدمی کے بعد کمرے کے مگن میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ باتیں کر رہے تھے کہ چھاکا آگیا، اس نے آہستہ سے سلام کیا اور مگن کی طرف جانے لگا۔ سراج نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوشگوار مہوڑ میں پوچھا۔

"اوتے چھاکے! بڑا چپ چاپ ہے۔ خیر تو ہے بہتے نے تو نہیں مارا؟"

"کیا ہوا ہے تجھے، کیوں پریشان ہے؟" فہد نے بھی اس کا چہرہ دیکھ کر پوچھا تو چھاکا بولا۔
"پریشانی تو ہے، چوہدری کا فحش آیا تھا بہتے کے پاس دھمکی لگائے۔"

"کہیں وہ تیرے ساتھ والے کیس میں تو نہیں؟" سراج نے تیزی سے پوچھا

"ہاں اکہہ بھٹا تھا کہ میں اپنا بیان واپس لے لوں۔" چھاکے نے جواب دیا تو فہد نے کہا۔

"ہوں، یاد انہوں نے تو ایسا کرنا ہی ہے اب لگتا ہے چوہدری قانونی جنگ ہار کر بد معاشی پر اتر آئے ہیں۔"

"وہ پہلے کون سا قانونی جنگ لڑتے ہیں۔ ٹنڈہ گردی ہی تو کرتے ہیں، جس کی وجہ سے لوگ ان سے خوف زدہ ہیں اور اس ٹنڈہ گردی کے لئے انہوں نے بد معاشی پالے ہوئے ہیں۔ خیر چھاکے، وہ جو کچھ بھی کہیں ان کی چھوڑ انہوں نے تو کہا ہی ہے یہ بتاؤ اور تیرا کیا کہتے ہیں؟" فہد نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بہتے نے تو صرف مجھے بتایا ہے اور کوئی بات نہیں کی اور میں تو وہی کہوں گا نا جو آپ لوگ کہیں گے۔" چھاکے نے کہا تو فہد بولا۔

"کیوں، تم ہماری زبان کیوں بولو گے؟ نہیں،

اور دوسروں کو کچل کر اپنے مفادات حاصل کرنے ہی کو سیاست سمجھا جاتا ہے۔" فہد نے کہا۔

"ہمارا سیاسی کلچر ہی یہی بن چکا ہے کہ دولت لگاؤ اور دولت کماؤ حلال حرام، قومی مفاد اور عوام کی خدمت ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سیاست بھی ایک کاروبار کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ سرمایہ لگا کر ایم پی اے، ایم این اے بن جاؤ، خوب کرپشن کرو، لوٹ مار کرو اور دولت بناؤ۔ غریب آدمی تو انکیشن کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا۔" شیخ آفتاب نے تہرہ کرتے ہوئے کہا تو فہد سکون سے بولا۔

"لیکن، بات تو دوٹ پر آ کر ختم ہوتی ہے نا شیخ صاحب! غریب اگر اپنے جیسے کسی بندے کو ووٹ دے دیں تو وہ ایم این اے بن جائے گا۔"

"مگر، غریب کو ووٹ کی طاقت کا شعور نہیں۔ وہ بے چارہ ان سیاست دانوں کی غلامی میں پھنسا ہوا ہے۔" شیخ آفتاب نے حقیقت بتائی تو فہد حوصلہ افزا لہجے بولا۔

"اب غریب نکلے گا، کم از کم اس علاقے سے تو نکلے گا۔ خیر، ہم اپنی بات کریں۔"

"میرے پاس یہاں زمین نہیں تھی۔ ورنہ میں چوہدری کی پیدا کردہ رکاوٹیں ختم کر دیتا۔ خیر، اُسے چھوڑیں، آپ بتائیں یہ سارے معاملات طے کرنے کے لئے آپ کب آرہے ہیں ہمارے پاس؟" شیخ آفتاب نے پوچھا تو فہد نے کہا۔

"آپ جب چاہیں۔ ویسے تو ملک نعیم صاحب نے آپ سے بات کر لی ہوگی۔" فہد نے اپنا عندیہ دیا تو اس نے لمحہ بھر سوچا اور بولا۔

"میں تو کہتا ہوں آج ہی ملاقات ہو جائے، کچھ مضر ٹکمرے تو باقی باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

"چلیں آج ہی سہی، آپ ملک صاحب کے ہاں

نہیں کر سکے گا۔ اسے اب ہم سے چسپ کر ہی رہنا ہوگا۔" "تو حوصلہ کر چھاکے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کیا ہم نہیں ہیں۔ اور پھر تجھے کیا، تیری تو پورے علاقے میں دس بچھ ہو گئی ہے۔" سراج نے خوشگوار انداز میں ہنستے ہوئے کہا تو وہ تینوں ہنس دیئے۔ بھی فہد نے کہا۔

"چل اب جلدی چائے ہی پلا دے۔ تیرے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تیرے ہاتھ کی چائے کا تو چسکا ہی لگ گیا ہے۔"

"سید صاحب! یہی بنا میری جان، وہ تیرا شیخ آفتاب بھی تو آتا ہوگا۔" سراج نے یاد دلایا تو فہد نے کہا۔

"اوہاں یار، کچھ کھانے کو دے دے۔ اس کے ساتھ پتہ نہیں کتنا وقت لگتا ہے۔"

"ابھی تو۔" چھاکے نے کہا اور بگن میں گھس گیا۔ فہد، سراج اور شیخ آفتاب کھیتوں کے درمیان

پھرتے ہوئے زمین دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز سے بھی ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ زمین کا سروے کر رہے ہوں۔

وہ چلتے ہوئے سڑک کنارے آگئے، جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان کے پاس شیخ آفتاب کا ڈرائیور اور گن مین کمرے تھے۔ شیخ آفتاب نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"زمین تو میں نے دیکھ لی فہد صاحب! یہ فیکٹریوں کے لئے انتہائی مناسب جگہ ہے۔ میں ایسی ہی جگہ چاہتا تھا اور چوہدری جلال میری راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔"

"یہ چاہے عمر حیات کی زمین تھی جو میں نے خریدی ہے۔ چوہدری جلال میری بھی راہ میں آیا تھا۔ مگر

اب نہیں، اب آپ یقین رکھیں۔ وہ کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرے گا۔" فہد نے اسے یقین دلایا تو شیخ آفتاب بولا۔

"فہد صاحب، ان سیاست دانوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے، ہمارے ہاں سیاست کسے کہتے ہیں؟"

"جانتا ہوں شیخ صاحب! دھوکا دینا، جھوٹ بولنا

کر علاقے پر بہت احسان کیا ہے۔ اب یہ بند نہیں ہونے دیں گے۔ میں نے خود محکمے والوں سے بات کی ہے۔ ملک نعیم نے کہا۔

”تو پھر ملے ہو گیا۔ آپ جیسے چاہیں پیپرز بنوائیں۔ مجھے منظور ہوگا۔“ یہ کہتے ہوئے شیخ آفتاب نے فہد کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ فہد نے ہاتھ ملایا تو ملک نعیم اور سراج کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

صفیہ اپنے گھر میں چار پائی پریشی والی رختی تھی کہ نعمت علی گھر میں آگیا۔ وہ اسے گھر میں دیکھ کر مسکرا دیا۔ صفیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ قریب پڑی چار پائی پریشی ہوئے بولا

”مجھے معلوم تھا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ تیرا ہمارے سوا ہے کون؟ اچھا کیا ٹو نے میری بات مان لی۔ اب تو چاہے تو یہ گھر اپنے نام کھولیں۔ چوہدری ہمیں یہ گھر دے دیں گے۔“

”بابا! یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تمہارے سوا ہمارا ہے کون گھر میں یہاں اس لئے نہیں ہوں کہ میں نے اپنے شوہر کے قاتلوں کو معاف کر دیا ہے۔“ صفیہ نے واضح انداز میں کہا تو بابا نعمت علی کی تیوریوں پر مل پڑ گئے۔ وہ غصے میں بولا۔

”تو پھر تو یہاں کیوں ہے۔ میں نے تمہیں یہاں سے چلے جانے کو کہا تھا۔“

”چلی جاؤں گی اور اگر چلی مٹی تو پلٹ کر بھی واپس نہیں آؤں گی۔“ صفیہ نے کہا۔

”دیکھو صفیہ! تمہارے پاس دو ہی راستے ہیں یا تو چوہدریوں کی بات مان لے اور یہاں پر سکون زندگی گزارنا یا پھر در بدر کی محو کریں کھانے کے لئے چلی جا۔ میں بھی مجبور ہو گیا ہوں۔ میں چوہدریوں کے سامنے بھانے بنانا کر تھک چکا ہوں۔“ بابا نعمت علی نے ہار مانتے

پہنچیں، میں بھی وہیں آ جاتا ہوں۔“

”میں دو گھنٹے بعد آپ کا وہیں انتظار کروں گا۔“ یہ کہہ کر شیخ آفتاب نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو دونوں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا۔ وہ بھی، مگر میں بھی اور ہاتھ ملاتے چلے گئے۔ فہد اور سراج نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔

ملک نعیم کے گھر میں فہد، شیخ آفتاب، ملک نعیم اور سراج بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ شیخ آفتاب کہہ رہا تھا۔ ”یہ تو ملے ہے ملک صاحب کہ اس علاقے میں فیکٹریاں لگانی ہیں۔ چوہدری جلال نے ہمیشہ مخالفت کی ورنہ میں تو سرمایہ لگانے کو بالکل تیار بیٹھا ہوں۔“

”شیخ صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ آپ سرمایہ اپنے منافع کے لئے لگا رہے ہیں۔ لیکن یہ اس علاقے کے لئے ضروری بھی ہے۔ کیونکہ یہاں غربت ہے، بے روزگاری ہے، ہسپتال نہیں، کوئی بڑا سکول نہیں۔ فیکٹریاں لگانے کے ساتھ آپ کو یہ سہولیات دینا ہوں گی۔“ فہد نے کہا تو ملک نعیم بولا۔

”بے شک۔! یہی تو پہلی ترجیح ہے۔ سرمایہ دار کا منافع عوام میں سے ہو کر آتا ہے۔“

”میں نے سوچا ہے کہ میں نے وہاں سے کئی برس تک منافع نہیں کمانا سیدھی بات ہے میں نے اپنی ضد پوری کرنی ہے۔ میری زندگی میں صرف چوہدری جلال ہی ایسا شخص آیا ہے جس نے میری راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ خیر! آپ جو بھی اور جیسی بھی شرائط رکھیں جو ملے کرنا چاہیں کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ شیخ آفتاب نے واضح انداز میں کہہ دیا تو فہد بولا۔

”میری صرف ایک شرط ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کی خوشحالی، اور بس۔“

”ہم بھی تو یہی چاہتے ہیں۔ آپ نے سکول کھول

دیا ہے۔ وہ رزق دینے والا ہے، وہی دے گا۔ تو بیٹہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

”میرے لئے چھت کا بندوبست؟“ صفیہ نے حیرت سے پوچھا تو سلسلی نے بتایا۔

”ہاں، وہ چاہے عمر حیات والا گھر خالی ہے نا، تو اپنا سامان ادھر ہی رکھ لیںا۔ ادھر رہتا چاہو تو بھی ہمیں پریشانی نہیں۔ بس اب تم نے ان ہاتوں کو نہیں سوچنا۔ تو بیٹھ میں ان بچوں کے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔“

صفیہ نے تشکر بھرے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا اور وہیں ایک چار پائی پر بچوں کو لے کر بیٹھ گئی۔

اس وقت سلسلی ولان میں میز پر کافی سارے کاغذ پھیلانے بیٹھی تھی۔ صفیہ اس کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ جب فہد گھر میں آیا۔ اس نے بڑے غور سے اسے دیکھا اور خوشگوار موز میں پوچھا ”کیا ہو رہا ہے۔ یہ اتنا بڑا دفتر کیوں لگایا ہوا ہے۔“

”آپ بیٹھیں تو میں آپ کو بتاؤں۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ فہد قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کے بولا۔

”بیٹھ گیا اب بولا۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ صفیہ اپنا گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اپنے پاس آ گئی ہے۔ میں نے اسے سب سمجھا دیا۔ جدھر چاہے رہے۔“

”ٹھیک ہے اور دوسری بات؟“ فہد نے پوچھا۔

”میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ پہلے میں گاؤں کے ان غریب لوگوں کی لسٹ بنا رہی ہوں جو کسی نہ کسی حوالے سے مدد کے مستحق ہیں۔ بعد میں یہ فیصلہ کریں گے کہ انہیں اپنے ہاؤس پر کیسے کھڑا کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ اپنی کمائیں اور خود کھائیں۔“ سلسلی نے بتایا تو فہد

ہوئے کہا تو صفیہ بولی۔

”تو مجبور نہ ہو بابا! میں چلی جاتی ہوں۔“

”تو پھر چلی کیوں نہیں جاتی ہو، یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ تم اب میری ذمہ داری نہیں ہو۔“ بابا نصحت علی نے چیخ کر کہا۔ آخری لفظ کہتے ہوئے بابا کا گھار بندھ گیا۔ صفیہ نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اٹھ کر باہر کی جانب چلا گیا۔ صفیہ نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا پھر دکھ اور حسرت سے بولی۔

”چلو بیٹا! اب ہم یہاں سے چلیں۔ اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔“

اس نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کئے اور اپنے بچوں کو لے کر باہر نکل گئی۔ وہ سیدھی سلسلی کے گھر جا پہنچی۔ اس وقت ماسٹر دین محمد محسن میں بیٹھا ہوا تھا جب دروازے میں صفیہ آن کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ بچے تھے۔ ماسٹر دین محمد کی نگاہ اس کی طرف اٹھی تو بولا۔

”آ جاؤ بیٹی، آؤ۔ آ جاؤ، وہاں کیوں کھڑی ہو۔“ یہ کہا پھر سلسلی کو آواز دی، ”سلسلی آؤ پتر سلسلی۔“

دروازے کی طرف سے صفیہ آ گئی تو اندر کی جانب سے سلسلی وہاں آ گئی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے صفیہ نے کہا۔

”میں آ گئی ہوں سلسلی۔ ہمیشہ کے لئے وہ گھر چھوڑ کر آ گئی ہوں۔“

”میں یہ تو نہیں کہتی کہ تم نے اچھا کیا یا برا لیکن یہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آؤ بیٹھو۔“ سلسلی نے کہا

”میں محنت مزدوری کروں گی۔ اپنے بچوں کا پیٹ پال لوں میں کوشش کروں گی کہ جلدی.....“ اس نے کہا چاہا تو ماسٹر دین محمد نے قفل سے کہا۔

”آؤ بیٹی! تو بیٹھ کچھ کھاپی لے، پھر یہ باتیں سوچتی رہنا۔ اللہ نے تیرے لئے چھت کا بندوبست بھی کر

ساتھ مقامی لوگ ہوں گے تو میری ہی قوت میں اضافہ ہو گا۔ صبح سے اسی کے ساتھ تھا۔ اب بات آئی سمجھ میں۔
"میں سمجھ گئی۔" سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تو فہد لٹ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

☆.....☆.....☆

جوبلی کے ڈرائنگ روم میں بشری بیگم بیٹھی ہوئی تھی۔ رانی اس کے لئے چائے کاگ لا آئی تو رانی نے وہ گلاسے چھانے ہوئے کہا۔
"یہ لیں بیگم صاحبہ!"

"کیسے کہاں ہے؟ ابھی تیار نہیں ہوا؟" بشری بیگم نے گلاسے پکڑتے ہوئے پوچھا تو رانی بولی۔
"وہ جی، تیار ہو کر ادھر ہی آرہے ہیں۔"

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ چوہدری کبیر اندر سے وہیں آ گیا۔ بشری بیگم نے چائے کاسپ لے کر گھر دیا اور کبیر کی طرف دیکھ کر بولی، "کدھر جا رہے ہو؟"
"ڈیوے پر۔" اس نے کہا اور پھر اپنی ماں کی طرف دیکھ کر بولا، "کیوں خیر ہے ماں، جو آپ ایسے پوچھ رہی ہیں آج؟"

"میں نے تم سے بات کرنی ہے۔ بیٹھو۔"
"کہیں؟" یہ کہہ کر وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تو بشری بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"خیرے بابا سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ تمہاری اس سلمیٰ کا نام بھی نہیں سننا چاہتے۔ وہ جانتے ہیں کہ تم صرف ضد میں آ کر اسے اپنی دلہن بنانا چاہتے ہو۔ اس لئے....." بشری بیگم نے کہنا چاہا تو چوہدری کبیر مسکراتے ہوئے ہولے سے بولا۔

"ماں! میں نے ضد کی ہے یا خواہش، میری دلہن سلمیٰ ہی بنے گی، کوئی دوسری نہیں۔"

"تم کون ہوتے ہو اکیلے فیصلہ کرنے والے؟ جو فیصلہ چوہدری صاحب کریں گے وہی ہوگا۔" بشری بیگم

بولی۔

"یہ تو بہت اچھا ہے، جب تک ہم خود انحصار نہیں ہوں گے۔ ان جاگیرداروں کے چنگل سے تو نہیں نکل سکتے۔"

"مسئلہ بھی تو یہیں ہے نا۔ ان کے چنگل سے نکل کر خود انحصاری تک کے درمیان سہارے کی ضرورت ہے، اس پر ہمیں سوچنا ہے اور ان کے لئے کچھ کرنا ہے۔"
سلمیٰ نے گہری سنجیدگی سے کہا تو فہد نے پوچھا۔
"میں چائے بناؤں آپ کے لئے؟"

"ہاں بناؤ لیکن ذرا جلدی۔ میں نے ابھی نور پور کے لئے نکلنا ہے۔ یہ استاد جی کدھر ہیں؟"

"ساتھ والے گاؤں، اپنے کسی دوست کے پاس گئے ہیں۔ آپ کہاں گئے ہوئے تھے؟" سلمیٰ نے پوچھا تو صفیان کے پاس سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

"جیسا کام تم کر رہی ہو، ویسا ہی میں کر رہا ہوں۔ دیکھو میں نے چاہے عمر حیات کی زمین اس لئے خریدی ہے کہ اس پر فیکٹری لگاؤں۔ تاکہ لوگوں کو روزگار ملے اور وہ خود انحصار ہو کر چوہدریوں کے چنگل سے نکل آئیں۔"
فہد نے کہا تو سلمیٰ بولی۔

"فیکٹری لگانا کوئی معمولی بات ہے، اس کے لئے بڑا سرمایہ چاہئے؟"

"میرے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ ایک کی بجائے دس فیکٹریاں یہاں لگا لوں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ یہاں کے لوگ بھی میرے ساتھ شامل ہو جائیں۔"

فہد نے جواب دیا تو سلمیٰ نے جلدی سے پوچھا۔
"وہ کیوں؟"

"شیخ آفتاب نے بہت کوشش کی فیکٹری لگانے کی مگر چوہدری نے اس کی چلنے نہیں دی۔ وہ سرمایہ اٹھا کر پھر بارہا لیکن کسی نے زمین نہ دی۔ اب میں نے زمین خریدی ہے تو وہ میرے ساتھ پارٹنر بننا چاہتا ہے۔ میرے

نے غصے میں پوچھا تو چوہدری کبیر سکون سے بولا۔
 "ماں تو بہت بھولی ہے، شادی اس سے میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"جی بات تو یہ ہے چوہدری صاحب! آپ نے شروع ہی سے فہد کے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔ نکاح چوہدری ٹھیک کہتا تھا۔ اسے یہاں پیر جمانے ہی نہ دینا چاہئے تھے۔ وہ کھلے عام لوگوں کو آپ کے بارے میں بھڑکار رہا ہے۔ اس کا وجود ہمارے لئے بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے چوہدری صاحب!" فشی نے اسے باور کرایا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ ہمیں ہر طرح سے زچ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں اب سمجھا ہوں کہ وہ ہم سے کس طرح انتقام لینا چاہتا ہے۔ اب اسے یہاں نہیں رہنا چاہئے۔" چوہدری جلال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر جتنی جلدی ہو سکے اس کا کام ہو جانا چاہئے ورنہ مشکل پیدا کرتا چلا جائے گا، وہ ہمارے لئے" فشی نے بڑی خطرناک صلاح دی تو چوہدری جلال اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوا بولا۔

"ہاں! اب اس کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا اس پر ایسے ہاتھ ڈالنا ہے کہ وہ پھڑک نہ سکے۔" لیکن آپ پہلے کئے چوہدری والا معاملہ دیکھ لیں۔" فشی نے یاد دلایا تو چوہدری جلال کو یاد آ گیا۔

"وہ نعمت علی سے پوچھو، اگر اس کی بہو نہیں مانتی تو....."

"میں سمجھ گیا، ان کا بھی مل ہے لیکن اگر میں کہوں کہ فہد ہی ہے جو اس مسئلے کی جڑ ہے۔ تو....." فشی نے سوالیہ نشان چھوڑ دیا تو چوہدری جلال لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔

"اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ذرا تھوڑے کپڑے گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔" فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

نور پور پر جانا ہے۔ اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ذرا تھوڑے کپڑے گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔ فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

نور پور پر جانا ہے۔ اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ذرا تھوڑے کپڑے گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔ فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

نور پور پر جانا ہے۔ اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ذرا تھوڑے کپڑے گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔ فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

نور پور پر جانا ہے۔ اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ذرا تھوڑے کپڑے گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔ فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

نور پور پر جانا ہے۔ اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ذرا تھوڑے کپڑے گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔ فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

نور پور پر جانا ہے۔ اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ذرا تھوڑے کپڑے گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔ فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

نور پور پر جانا ہے۔ اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ذرا تھوڑے کپڑے گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔ فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

نور پور پر جانا ہے۔ اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ذرا تھوڑے کپڑے گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔ فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

نور پور پر جانا ہے۔ اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ذرا تھوڑے کپڑے گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔ فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

نور پور پر جانا ہے۔ اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ذرا تھوڑے کپڑے گاڑی نکالے، نور پور پر جانا ہے۔ فشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

جانب چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر کے وقت چوہدری جلال اور بشری بیگم دونوں لان میں تھے۔ چوہدری کبیر دھیرے دھیرے چلا ہوا ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے چہرے پر تاثر یہی تھا کہ وہ اس سے کوئی اہم ترین بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس لئے چوہدری کبیر نے پوچھا۔ ”جی بابا! آپ نے مجھے بلایا۔ خیریت تو ہے نا۔“

”ہاں، خیریت ہے اگر تم چاہو تو ورنہ شاید نہ ہو سکے۔“ چوہدری جلال نے کسی تاثر کے بغیر کہا۔

”کیا مطلب، ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟“ چوہدری کبیر سکون سے بولا تو بشری بیگم نے کہا۔

”بات یہ ہے کبیر! وقت ایسا آ گیا ہے جب ہمیں کچھ فیصلے کر لینے چاہئیں ورنہ حالات ہمارے ہاتھ سے ریت کی طرح نکل جائیں گے۔“

”ایسا کیا ہو گیا ہے بابا، آپ لوگ کیوں اتنے پریشان ہیں۔“ چوہدری کبیر نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی بات کرنے تمہیں بلایا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ابھی نڈیر کا معاملہ ختم نہیں ہوا اور تم نے ایک نئی ضد شروع کر دی ہے اور ایسی ضد جسے نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ ہماری خاندانی روایات۔“ چوہدری جلال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

”تو میں کون سا اس ماسٹر کی بیٹی کو اس حویلی کی زینت بنانا چاہتا ہوں۔ جس سے ہماری خاندانی روایت ٹوٹ جائے گی۔“

اس نے کہا تو دونوں میاں بیوی چومک گئے۔ تبھی چوہدری جلال نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا مطلب! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”میں تو فہد کو اپنی اذیت چاہتا ہوں میں سسلی کو اس حویلی میں نہیں لاؤں گا بلکہ نوکرائی بنا کر لوہر میں رکھوں

گا۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی میرے خلاف نڈیر کی بیوی کو بھڑکانے کی۔“ چوہدری کبیر نے حقارت سے کہا تو چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہوں، تو یہ سوچ ہے تمہاری؟“

”کیونکہ آپ فہد کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کو صرف فہد کی وجہ سے اتنا حوصلہ ملا ہے کہ وہ ہمارے خلاف سر اٹھا سکیں۔ اور یہ جو حالات ہمارے خلاف ہو رہے ہیں۔ صرف اور صرف اسی وجہ سے ہیں۔“ چوہدری کبیر نے اپنے باپ کو دلیل دی۔

”کبیر! تم نہیں سمجھتے ہو۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اسے راستے سے ہٹاتے ہیں نا تو پھر ہمارے پاس حالات سدھارنے کا بھی موقع نہیں رہ جاتا۔ شاید تم نہیں جانتے اس نے بچپن سے لے کر اب تک ہمارے خلاف ہی قوت جمع کی ہے۔“ چوہدری جلال نے کہا۔

”تو پھر فیصلہ کر لیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ یوں حالات کو ہاتھ سے نکلنے دیکھتے رہیں یا پھر ان پر قابو پا لیں۔“ چوہدری کبیر نے پوچھا تو چوہدری جلال دھیمے سے لہجے میں بولا۔

”ان حالات پر قابو پانا ہی ہو گا کبیر!“

”تو بس پھر، میں جو کرتا ہوں، مجھے کرنے دیں۔“ چوہدری کبیر نے مسکراتے ہوئے کہا تو بشری بیگم تیزی سے خول زدہ لہجے میں بولی۔

”خدا! کچھ ایسا نہ کرنا جو ہمارے لئے نئی مصیبت بن جائے میرے بیٹے، پہلے ہی ہم بہت اذیت سے گزر رہے ہیں بہت ہو چکا یہ خون خرابہ۔“

”ہاں! فیصلہ ہو چکا ہے،“ چوہدری کبیر نے حتمی لہجے میں کہا اور اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ بشری بیگم کے چہرے پر اذیت بھرے جذبات ابھر آئے تھے، اسے یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہوں کہ اب سیاست اور حالات کا رخ بدل گیا ہے، اب عوام کو شعور ہے۔ کامیاب دہی ہوگا جو عوامی خدمت کرے گا، اسی کے ہاتھ میں سیاسی گرفت ہوگی۔

”وکیل صاحب! میں آپ کی اسی بات سے اختلاف کرتا آیا ہوں۔ میں چاہوں تو ایک ہی دن میں پانسہ پلٹ کر رکھ دوں بس چند بندوں کو قابو کرنے کی بات ہے۔ یہ نہ عوامی شعور سے ہوگا اور نہ عوامی خدمت سے۔ میرے خیال میں اصل معاملہ یہ ہے کہ مفاد پرست لوگ سیاسی بلک میلنگ پر اتر آئے ہیں۔ کیا خیال ہے؟“

یہ سن کر وکیل کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے غل سے کہا۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن غلط میں بھی نہیں کہہ رہا۔ علاقے کی چھوٹی چھوٹی قوتوں کو ساتھ لے کر ہی چلنا ہوگا۔“

”آپ کا کیا خیال ہے ملک نعیم یہ جو اپنے ہونے کا ناکام ثبوت دے رہا ہے، میں اس سے گھبرا جاؤں؟ آپ اپنا گروپ مضبوط کریں، میں علاقے کی سیاست کو خود دیکھتا ہوں۔“ چوہدری جلال نے کہا تو وکیل بولا۔

”جیسے آپ کی مرضی، میں آپ کو نور پور کی صورت حال بارے بتا دیتا ہوں، پھر جیسا آپ کہیں ویسا ہی ہوگا۔“

وہ دونوں ہاتھیں کرنے لگے۔

وکیل چلا گیا تو چوہدری جلال نے بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اسے اپنی تمام تر مشکلات کی وجہ صرف اور صرف فہد ہی لگا۔ اس کے یہاں آنے ہی سے حالات اس کے قابو میں نہیں رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل جائے، اس نے فہد ہی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی رات چوہدری جلال اپنے لہجے پر جا پہنچا۔ جیسے ہی اس کی گاڑی رکی اس کے پیچھے ہی ایک اور کار آن رکی۔ اس میں سے ایک نوجوان نکلا، جس نے جین اور لیڈر جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔

اسی شام وکیل جمیل اختر حویلی کے ڈرائنگ روم میں تھا۔ چوہدری جلال نے اسے بلوایا تھا کہ یہ اچانک ملک نعیم کیسے سر اٹھانے لگا ہے، یہاں تک کہ اس کے ساتھ فہد اور شیخ آفتاب جیسے لوگ بھی آن لے گئے؟ وہ اس سوال کا جواب چاہتا تھا کہ آٹھریا کیا ہو گیا ہے کہ وہ مضبوط ہو رہے ہیں۔ وہ قدرے غصے میں بات کر رہا تھا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے وکیل صاحب! ہم پڑکھوں سے یہاں پر سیاست کر رہے ہیں۔ آج تک علاقے میں ہماری اتنی مخالفت نہیں ہوئی جتنی اب ہو رہی ہے؟ لوگ جگہ جگہ بیٹھ کر ہمارے ہی خلاف ہاتھیں کر رہے ہیں۔“

”چوہدری صاحب! ایسا بھی ہوتا ہے جب کسی بھی سیاست دان کی اپنے حلقے میں سیاسی گرفت کمزور ہو جائے۔ مفاد پرست تو کچھ بھی نہ ہونے سے بہت کچھ بنا لیتے ہیں۔ دیکھنا یہی ہوگا کہ سیاسی گرفت کمزور کیوں ہو گئی؟“ وکیل نے بڑے غل سے کہا۔

”کیوں ہو گئی، آپ سب کا خیال کیا ہے؟“ اس نے بھی کافی حد تک غل سے پوچھا۔

”یہ لوگ آپ کو کیا بتائیں، انہوں نے تو وہی کیا ہے جو آپ نے کہا۔ ان کے پاس ووٹ تو ہیں لیکن وہ صلاحیت نہیں جس سے بدلتے ہوئے حالات کا رخ دیکھ سکیں۔ کیا آپ نے علاقے کے ان ہائر لوگوں سے رابطہ رکھا جو اپنے طور پر چھوٹی چھوٹی قوتیں ہیں؟“ وکیل نے پوچھا۔

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب! نور پور کے چھوٹے موٹے کاموں سے لے کر اسمبلی تک چھوٹے بڑے اداروں میں ان کے کام نکلوائے ہیں، سفارشیں کی ہیں، نوکریاں دلوائیں ہیں، جائز اور ناجائز سارے کام ہوتے ہیں..... اور رابطہ کیسے ہوتا ہے؟“

چوہدری جلال نے الجھتے ہوئے کہا تو وکیل بولا۔

”چوہدری صاحب! میں بار بار عرض کرتا رہا

اس کا چہرہ کافی حد تک ڈھکا ہوا تھا۔ چوہدری جلال نے اس کی طرف غیر جذباتی انداز میں دیکھا تو کاشی نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ چوہدری جلال نے غیر جذباتی انداز میں کہا۔

”بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے کاشی!“

”آپ نے یاد ہی اتنے عرصے بعد کیا ہے۔ اس دوران آپ کو کام نہیں پڑا، آج کام پڑا تو آپ نے ہوا لیا۔“ کاشی نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ہاں تمہاری یاد، غیر معاملہ ہی کچھ ایسا آ پڑا ہے، میں تو سیدھے سیدھے اس کا حل کر لیتا لیکن یہ سیاست درمیان میں آگئی۔ دونوں کی فکر میں معاملہ ہاتھ سے لٹکا جا رہا ہے۔“ چوہدری جلال نے اپنی الجھن بتائی تو کاشی سکون سے بولا۔

”ہم کس لئے ہیں چوہدری صاحب! ہم حاضر ہیں۔ بولیں، آپ کے مقابلے میں کوئی اور سیاست دان آگیا ہے کیا؟“

”ایک چھوٹا سا سیاست دان تو پہلے ہی تھا لیکن اس کے علاوہ ایک غیر اہم سا بندہ ہے جسے شروع میں میں نے اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ اب وہ دردمن بن گیا ہے۔“ چوہدری نے کہا تو کاشی لاپرواہی سے بولا۔ ”اب میں آگیا ہوں نا، سکون ہو جائے گا۔ کہیں تو آج رات ہی اس کا کام کر دیتا ہوں۔“

”نہیں اتنی جلدی نہیں ہے۔ تم آؤ نا، سکون سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ معاملہ یہاں کا ہی نہیں نور پور کا بھی ہے۔ میں تمہیں تفصیل سے سمجھا دیتا ہوں۔ آؤ۔“ چوہدری جلال نے کہا اور کاشی کو لے کر اندر کی جانب بڑھ گیا

☆.....☆.....☆

جعفر اپنے آفس میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جب سے مائرہ یہاں سے ہو کر گئی ہے، اس کی اپنی ذات

میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ اسے یہ تو کفر ہو گیا تھا کہ مائرہ اس کے بلاوے سے زیادہ فہد کی کشش میں وہاں تک پہنچی چلی آئی ہے۔ وہ یہ سب جانتے ہوئے بھی مایوس نہیں تھا، اسے ہلکا سا دکھ ہو رہا تھا کہ جا کر اس نے فون بھی نہیں کیا تھا۔ تب اس نے سوچا اگر اس نے فون نہیں کیا تو وہ خود کر لے۔ یہ سوچ کر وہ مسکرا دیا۔ اس نے اپنا فون اٹھایا اور مائرہ کے نمبر ڈائل کر دیئے۔ لکھوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ حال احوال کے بعد اس نے پوچھا۔

”کیسا لگا تمہیں فہد کا گاؤں؟“ ناچا جتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے نکل گیا تو مائرہ نے کچھ بھی محسوس نہ کرتے ہوئے پُر جوش انداز میں کہا۔

”میں سوچ رہی ہوں جعفر کہ وہاں کچھ دن رہ کر زبردستی رپورٹ بناؤں۔ ہم ترقی کی بات کرتے ہیں، لیکن کہاں ہے ترقی؟ میں اس علاقے کو مثال کے طور پر پیش کروں گی۔ وہاں انسان بستے ہیں، کیا جدید دنیا کی سہولتوں پر ان کا کوئی حق نہیں؟“

”تمہیں یاد ہے مائرہ۔ مجھے تم نے یہ بات پہلے بھی کہی تھی لیکن اس وقت تمہارے بچے میں یہ شدت نہیں تھی۔ ہمارا میڈیا بھی ابھی تک عوام کے ان مسائل تک نہیں پہنچ سکا جس پر شعور دینا چاہئے۔ خیر، تم نے تجربہ نہیں کیا؟“ جعفر نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تو مائرہ نے سنی ان کی کرتے ہوئے کہا۔

”جعفر! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے انسان سامنے پڑی ہوئی شے کو نہیں سمجھ پاتا، یونہی خواہ مخواہ الجھن کا شکار رہتا ہے، اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔“

”تم کہنا کیہ چاہ رہی ہو، کیا الجھن ہے، کے سمجھ نہیں پاتی ہو؟“ جعفر نے پوچھا۔

”بعض اوقات حالات ایسے بن جاتے ہیں۔ جس سے ہمارے اپنے ہی بدگمان ہو جاتے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ ہمیں انہوں کی بدگمانی دور کر دینی چاہیے نا؟“ جواب

دینے کی بجائے اس نے سوال کر دیا جس پر جعفر بولا۔
 ”بالکل، کیوں نہیں، اپنوں کے درمیان انکھن نہیں
 ہونی چاہیے۔ کوئی بھی تعلق ہو اس میں کوئی ابہام نہیں ہونا
 چاہئے، اسے صاف ہونا چاہئے۔“

”میرا اور تمہارا تعلق کیا ہے۔ تم میرے بہت اچھے
 دوست ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی تعلق نہیں
 اور.....“ مائرہ نے کہنا چاہا تو جعفر تیزی سے بات کاٹ کر
 فکڑ بھرے لہجے میں بولا۔

”نہیں مائرہ ہم فقط دوست ہی نہیں کچھ اور بھی
 ہیں۔ یہ بات تمہیں اب تک سمجھ آ جانی چاہئے
 تھی۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ اظہار ہی کیا جائے۔“

”کیوں، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے درمیان کچھ
 اور تعلق ہے، اظہار مطلب؟“ مائرہ نے حیرت سے
 پوچھا۔

”ہاں مائرہ! میں تمہیں چاہتا ہوں اور میں تمہارے
 سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“
 جعفر نے ہمت کر کے اظہار کر دیا تو مائرہ نے چونک
 کر حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جعفر! تم یہ سوچ بھی کیسے ہو کیا! تمہیں نہیں
 معلوم کہ میں فہد سے محبت کرتی ہوں، اسے چاہتی
 ہوں؟“

”مگر میں جانتا ہوں کہ وہ تمہیں کبھی نہیں اپنائے
 گا۔ وہ اب لوٹ کر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی
 الگ سے دنیا بنالی ہے۔ یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی
 ہو۔“ جعفر نے اسے بتایا تو وہ غصے میں بولی۔

”نہیں جعفر! تم فہد کی بات نہیں اپنی بات کہو، میں تو
 تمہیں ایک دوست سمجھتی تھی اور تم کیا سوچتے رہے، تم نے
 میرے اعتماد کو دھوکا دیا۔ تم وہ جعفر نہیں ہو، اب تم مجھ سے
 ملنے کی کوشش مت کرنا۔ میں نہیں چاہتی کہ میں.....“
 وہ کہہ نہیں پائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جعفر بے بسی سے اس کی طرف سے رونے کی آواز سنتا
 رہا۔ اچانک فون بند ہو گیا۔ اس نے فون کو بے بسی سے
 دیکھا پھر ایک طرف اچھال دیا۔ وہ بہت مایوس ہو گیا تھا۔
 رات گہری ہوئی چلی جا رہی تھی۔ دھیمی روشنی میں
 مائرہ اپنے بیڈ روم میں سو جتنی چلی جا رہی تھی۔ اسے جعفر کا
 جذباتی پن یاد آ رہا تھا۔

”ہاں مائرہ! میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اور میں
 تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا..... مگر میں جانتا
 ہوں کہ وہ تمہیں کبھی نہیں اپنائے گا۔ وہ اب لوٹ کر کبھی
 واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی الگ سے دنیا بنالی
 ہے۔..... میں جھوٹ نہیں بولتا اور پھر تم سے تو غلط بیانی کر
 ہی نہیں سکتا یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہو۔“

مائرہ نے اذیت سے اپنے بالوں میں انگلیاں
 پھیریں اور بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

”یہ تم کیا سوچ رہے ہو جعفر! مجھے تو فہد کا انتظار کرنا
 ہے اور مجھے یقین ہے وہ لوٹ کر ضرور آئے گا۔“
 ”اگر نہ آتا تو؟“

جعفر کی بات ٹھیک ہوئی تو کیا میں جعفر جیسا
 دوست بھی گنوائیٹھوں گی..... یا خدا یا! میں کس دور رہے پر
 آن کھڑی ہوئی ہوں، مجھے کیا کرنا چاہئے، کیا مجھے اپنا
 آپ حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہئے؟ مجھے کوئی
 نہ کوئی تو فیصلہ کرنا ہو گا۔ میں فہد کو چاہتی ہوں اور جعفر
 مجھے..... میں کیا کروں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ اس نے
 دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبایا اور پھر بے بسی سی ہو
 کر اپنے بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

جعفر اپنی سرکاری رہائش گاہ میں اپنے بیڈ پر پڑا
 سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اسے یہ تو پتہ تھا کہ مائرہ ناراض ہو گئی
 ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا اب رد عمل کیا ہو گا۔ وہ
 یہ سوچ کر ہی کرب سے گزر جاتا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ
 جائے گی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا، اس نے کئی بار

نئی سوچ چاہتے ہیں، نئی قیادت چاہتے ہیں۔
 ”وہ اس لئے ملک صاحب کہ نسل نئی آگئی ہے،
 انہیں وقت کی تبدیلی کا شعور ہے، وہ اپنے ارد گرد بھی
 تبدیلی چاہتے ہیں۔“ جعفر نے تہرہ کیا تو ملک نعیم
 بولا۔ ”اصل میں یہ وقت ہی تو ہے جو سب کچھ بدل دیتا
 ہے لوگ کب تک ان کرپٹ سیاست دانوں کو مقدس
 گائے بنا کر رکھیں جب وہ عوام کے لئے کچھ نہیں کریں
 گے تو عوام بھی انہیں روٹ نہیں دیں گے۔“

”یہ تبدیلی تو ایک فطری عمل ہے۔“ وہ بولا۔
 ”بس اب تو انکیشن کا انتظار ہے مجھے یقین ہے کہ
 اس سے پہلے سب ٹھیک کر لوں گا۔“ ملک نعیم نے کہا۔
 ”میرے لائق جو بھی ہو تو مجھے بتائیے گا۔“ اجماب
 اجازت۔ اللہ حافظ!“ جعفر نے اچانک کہا۔

”ضرور بتاؤں گا۔ اللہ حافظ“ ملک نے کہا تو جعفر
 نے فون بند کر دیا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ کچھ دل بہل
 جائے گا مگر وہاں باتیں ہی دوسری شروع ہو گئی تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔
 اسے بہت سارے خیال آرہے تھے۔ اسے فہد کی بات یاد
 آرہی تھی کہ مائرو کا بہت خیال رکھنا، میرے جانے کے
 بعد سب کچھ اطمینان سے بتا دینا کہ میرا گاؤں جانا کتنا
 ضروری ہے۔ بس وعدہ کرو، جو تمہیں کہا ہے وہی کرو
 گے۔ پھر اسے مائرو کی بات یاد آئی جو اسے بہت دکھ دے
 رہی تھی کہ تم یہ سوچ بھی کیسے سکتے ہو، کیا تمہیں نہیں معلوم
 کہ میں فہد سے محبت کرتی ہوں، اسے چاہتی ہوں۔ وہ
 اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

”مائرو سے اپنے من کی بات کہہ کر، اپنے جذبات
 کا اظہار کر کے، میں نے کہیں غلطی تو نہیں کی؟ وہ کیا
 سوچے گی۔ یہی کہ میں نے اس کی دوستی کا غلط مطلب
 لیا۔ میں جو اس کے خواب دیکھتا رہا ہوں۔ اس کی چاہت
 کو اپنے دل میں لئے پھرتا ہوں، کیا میں غلط ہوں یا فہد کی

نمبر بھی ملائے لیکن ہر بار دھک گیا۔ تبھی اسے کچھ نہ سمجھا تو
 اس نے ملک نعیم کے نمبر ملائے۔ رابطہ ہو جانے پر جعفر
 نے پوچھا۔

”سنائیے کیا حال ہے، کیسے چل رہی ہے آپ کی
 سیاست اور کیا کہتا ہے آپ کا علاقہ؟“

”سب ٹھیک ہے اور بہت اچھا ہے۔ چوہدری کے
 خلاف جو نفرت ہے۔ لوگ اسی وجہ سے میرے قریب
 آنے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں انہیں اپنے قریب
 کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ ملک نعیم نے خوش ہوتے
 ہوئے کہا تو جعفر بولا۔

”ہاں یہ جو جاگیر داری سسٹم میں لوگ ہیں نا، یہ
 فقط چند لوگوں کو نواز کر اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ دراصل وہ
 حاکمیت چاہتے ہیں۔ ایسی حاکمیت جس میں کم از کم عوام
 کی بھلائی نہیں ہوتی۔ آپ کا علاقہ تو زیادہ تر دیہاتی
 ہے۔“

”ہاں، زیادہ دیہاتی ہے، میں کام کر رہا ہوں وہاں
 پر فہد کی وجہ سے میں جلدی کامیابی حاصل کر لوں گا۔“
 ملک نعیم نے حوصلہ افزا انداز میں کہا تو جعفر بولا۔
 ”اس کی وجہ سے کیسے، وہ کیسے؟“

”اس نے بڑی چیز سے اپنے گاؤں قسمت پور
 اور پھر ارد گرد کے علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بنایا ہے۔ گو
 چوہدری نے جو اپنا خوف برسوں سے لوگوں پر مسلط کیا
 ہے۔ اسے ختم کرنے میں کچھ تو وقت لگے گا۔ وہ جو یہاں
 میرے حامی اور سپورٹر تھے۔ اس کے لئے بھی وہ بہت
 اہم ثابت ہو رہا ہے۔“ ملک نعیم نے بتایا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے میں نے کہا تھا نا کہ وہ
 آپ کے لئے بہت اہم ہو گا۔“ جعفر نے کہا تو ملک نعیم
 بولا۔

”اصل میں یہ ایک نئی لہر کی وجہ سے بھی ہے لوگ
 سابقہ جہروں کو ان کے کاموں کو دیکھ کر استا کچے ہیں، وہ

جنت میں ڈوبی مائرو کا انتظار کرتے ہوئے وقت ضائع کر رہا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے یا پھر خود کو حالات پر چھوڑ دینا چاہئے۔
اس نے مٹی سے آنکھیں موند کر صوفے سے لپک لگا لی۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو چکا تھا۔

جعفر صوفے پر نیم دراز نہ جانے کب سو گیا تھا۔ اس کے منہ پر کتاب تھی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اس کے فون کی بیل بجی۔ اس نے بے زاری سے فون اٹھا کر اسکرین دیکھا تو یوں چونکا کہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کال ریسیڈ کر کے جلدی سے بولا
"لیس مائرو، تم اس وقت؟"

"ہاں، میں اور کیا اس وقت میں تمہیں فون نہیں کر سکتی؟" مائرو نے عام سے لہجے میں کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس وہ تم بھی جانتی ہو۔" اس نے الجھتے ہوئے جواب دیا تو وہ سنجیدگی سے بولی۔

"دیکھو! ہم بہت اچھے دوست ہیں اور دوستوں میں غلط فہمیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اچھے دوست تو وہی ہوتے ہیں نا، اپنی غلط فہمیاں دور کر لیں۔ اس میں کوئی شرمندگی والی بات نہیں ہے۔"

"کیا چاہتی ہو تم؟" جعفر نے اسی الجھن میں پوچھا تو مائرو نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ ہم دونوں نے جو اپنے دل میں چھپا چھپا کر باتیں رکھی ہوئی ہیں، وہ ہمیں ایک دوسرے سے کہہ دینی چاہئیں۔ ہمارے درمیان کوئی نیا تعلق بنتا ہے یا نہیں۔ اہمیت اس کی نہیں بلکہ ہمارے لئے اہم یہ ہونا چاہئے کہ ہماری دوستی پہ کوئی حرف نہ آئے۔"

"اگر تم ایسا سوچتی ہو تو پھر میرے ضمیر پر جو اتنا بوجھ ہے وہ اتر جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیں یہ طے کرنا ہو گا کہ آخر ہمارے

درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے۔" جعفر نے سنجیدگی سے کہا۔

"جعفر! میں تم سے آج طے نہیں کروں گی۔ بلکہ کبھی بھی نہیں طے نہیں کروں گی۔ ہم اسے وقت پر چھوڑ دیتے ہیں پلیز....." اس نے منت بھرے انداز میں کہا تو جعفر سکون سے بولا۔

"اوکے، اب یہ طے ہے کہ ہم نے کبھی آپس میں ایسی کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ اور سناؤ کیسی ہو؟"
"اب میں پڑ سکون ہوں اور سکون سے سو پاؤں گی۔ باقی باتیں صبح کریں گے۔" مائرو نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جعفر نے فون ایک طرف رکھا اور بیڈ پر جا لیٹا۔ بات کر کے وہ اچھا محسوس کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کی نماز کے بعد ماسٹر دین محمد گلی میں چلا آ رہا تھا۔ ایسے میں سامنے سے ایک عورت آگئی۔ وہ قریب آ کر رکی جیسے وہ اس سے بات کرنا چاہ رہی ہو۔ ماسٹر دین محمد رک گیا تو وہ عورت بولی۔

"ماسٹر جی۔ کیا حال ہے آپ کا؟"

"میں ٹھیک ہوں بہن! تو سنا گھر میں سب ٹھیک ہیں نا؟" ماسٹر دین محمد نے سکون سے پوچھا تو وہ عورت بولی۔

"سب ٹھیک ہیں۔ ویسے ماسٹر جی۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کی طرف آؤں۔ میں نے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔"

"خیر تو ہے نا بہن۔ ایسی کیا بات کرنا تھی۔" اس نے پوچھا تو وہ عورت شکوہ بھرے لہجے میں بولی۔

"دیکھیں نا۔ میں تو وہی کہوں گی۔ جو آپ کے فائدے کی بات ہو۔ گاؤں میں لوگ بڑی باتیں بتا رہے ہیں۔ ایسا کچھ کہتے ہیں کہ بس تو یہی بھلی۔"

"ایسا کیا کہتے ہیں؟" ماسٹر دین محمد نے حیرت

”بہت برا کہہ رہے ہیں لوگ۔“ ماسٹر دین محمد نے

کہا۔

”بالکل ہی، جب وہ اکٹھے گاؤں میں اکیلے ادھر ادھر گھومیں پھریں گے ساتھ ساتھ دکھائی دیں گے تو یہی سوچیں گے تاکہ ان میں کوئی خاص ہی تعلق ہے۔“ اس عورت نے ماسٹر کے بدلتے چہرے کو دیکھا اور پھر جلدی سے بولی، ”خیر اس وقت تو مجھے جلدی ہے میں پھر آؤں گی مگر جب تفصیل سے بات کروں گی۔ اللہ حافظ۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ ماسٹر چند لمحوں میں کھڑا رہا پھر قدم بڑھاتا ہوا چل دیا۔ اس کی چال میں قطعاً اعتماد نہیں رہا تھا۔

ماسٹر دین محمد صحن میں آکر چار پائی پر ڈھے جانے والے انداز میں بیٹھا۔ سسکی بکن میں تھی، وہ پانی کا گلاس لے کر آئی اور وہ اسے تھمتے ہوئے پوچھا۔

”اباجی! ناشتہ لاؤں، آپ کے لئے؟“

”نہیں پترا! ٹو بس میرے لئے ایک چائے کی پیالی لے آ۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو سسکی نے گہری نگاہوں سے دیکھا اور پھر دھیرے سے اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

”اباجی! کیا بات ہے، آپ نے ٹھیک طرح سے بات نہیں کی، آپ کا لہجہ آپ کا ساتھ نہیں دے رہا، کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں پترا۔ بعض اوقات انسان ایسے موڑ پر آن کھڑا ہوتا ہے جہاں پر لفظ گنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کہنے والی بات بھی کہی نہیں جاسکتی۔“ ماسٹر دین محمد نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو سسکی بولی۔

”اباجی! الکی کون سی بات ہے جو آپ مجھ سے بھی کہہ نہیں پارہے ہیں؟ مجھے نہیں یاد، پہلے کبھی ایسا وقت ہم پر آیا ہو کہ ہم بات ہی نہ کر سکیں۔“

”یہ بات ہی ایسی ہے پترا! بتانا بھی چاہتا ہوں

سے پوچھا تو اس عورت نے انتہائی طریقہ لہجے میں کہا۔

”یہی کہ ایک جہان جہان لڑکا آپ کے گھر میں رہتا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور اگر اسے رکھنا آپ کی مجبوری ہے کہ وہ آپ باپ بیٹی کو کھانا پلاتا ہے، روپیہ دیتا ہے تو پھر آپ کیوں نہیں فہد کی شادی سسکی سے کر دیتے؟“

یہ سن کر ماسٹر دین محمد چونک گیا۔ اس نے خود پر قابو رکھا اور بڑے تحمل سے پوچھا۔

”ایسا کون کہتا ہے؟“

”سارے گاؤں والے۔ کسی کی زبان تو نہیں روکی جاسکتی۔ ویسے آپ کو پریشان ہونا بھی نہیں چاہیے، یہ صلاح ہے بھی ٹھیک۔ نہ ہینگ گئے نہ پھنگری، رنگ بھی چوکھا آئے۔ کوئی خرچہ نہیں اور بیٹی بچاؤ دو۔ فہد مگر جوانی بھی رہے گا۔“ اس عورت کے لہجے میں طنز کے ساتھ حقارت بھی تھی۔ تبھی ماسٹر دین محمد نے تحمل سے جواب دیا۔

”یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔“

”دیکھیں نا ماسٹر جی آپ سیانے بندے ہیں، بھلا بتائیں جو ان جہان لڑکی گھر میں ہے تو پھر جب ایک جوان جہان لڑکا گھر میں جب چاہے آئے، جب چاہے جائے کوئی روک ٹوک نہیں تو پھر اس پر اگر لوگ باتیں بنائیں، وہ کیسے غلط ہو گئیں بھلا؟“

”فہد میرے بیٹوں کی طرح ہے۔“ ماسٹر دین محمد نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا حالانکہ اسے شدید غصہ آ رہا تھا بھی وہ عورت تک کر بولی۔

”ہوگا، پر سگا تو نہیں ہے۔ اب دیکھیں نا، اس کا کون سا اپنا گھر نہیں ہے پھر کیوں دن رات آپ کے گھر میں پڑا رہتا ہے؟ اب یہ مت کہئے گا کہ وہ سسکی پر اپنی دولت نہیں دار رہا۔“

نہیں کہہ نہیں پار ہا ہوں۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔
 ”آپ کہہ دیں اور آپ کو یہ بات کہنا ہوگی۔ کیا
 میں آپ کے کرب کا اندازہ نہیں کر سکتی؟“ سلٹی نے دگی
 لہجہ میں کہا تو ماسٹر دین محمد بہت مشکل سے بولا۔
 ”تو پھر سنو!“ یہ کہہ کر اس نے عورت دلی بات
 سلٹی سے کہہ دی۔ سلٹی نے بڑے قفل سے بات سن کر
 کہا۔

”اباجی! جب سے فہد آیا ہے مجھے اسی بات کا ڈر
 تھا۔ آپ فہد سے کچھ نہیں کہیں گے، میں خود اس سے
 بات کر لوں گی۔“

”کیا کہو گی اس سے؟ مجھے اس کی ناراضگی کا ڈر
 نہیں لیکن ان حالات میں اس کا دل نہیں ٹوٹنا چاہیے۔
 ہمارے سوا اس کا ہے کون، یہاں پر؟ وہ دشمنوں سے نبرد
 آزما ہے اس وقت۔“ ماسٹر دین محمد نے سکتے ہوئے کہا
 تو سلٹی نے اسے حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔

”میں سمجھتی ہوں اباجی! مجھے کیا کرنا۔ میں آپ
 کے لئے ناشتہ لاتی ہوں۔“ سلٹی یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی اور
 ماسٹر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ ان کے لئے ایک نیا
 امتحان تھا۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ ملک نعیم کے ہاں سے واپسی
 پر فہد ماسٹر دین محمد کو خوشخبری دینا چاہتا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو
 سنان گھر دیکھ کر ایک لمحے کو ٹٹکا۔ وہ انگلی میں کار کی
 چابی گھما رہا تھا، اسے روک کر اس نے سنان دالان کو
 دیکھا۔ تبھی اجنبی چہرہ لئے سلٹی اندر سے دالان میں
 آئی۔ فہد طویل سانس لے کر دالان میں چلا گیا پھر کرسی
 پر بیٹھتے ہوئے پوچھا

”یہ آج معمول سے ہٹ کر اتنی خاموشی کیوں
 ہے۔ استاد جی کدھر ہیں؟“

”آگے آپ؟“ سلٹی نے اجنبی لہجہ میں پوچھا۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور یہ تم س
 اجنبی لہجے میں مجھ سے بات کر رہی ہو؟“ فہد نے چونک
 کر پوچھا تو سلٹی نے اسی کھردرے لہجے میں جواب دیا۔
 ”فہد! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں سب کچھ
 برداشت کر سکتی ہوں لیکن جب بات میری عزت تک
 آئے گی تو وہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ صاف لفظوں میں کہو۔“ فہد
 نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا تو سلٹی بولی۔
 ”یہی کہ آپ اب اس گھر میں مت آیا کریں۔“
 اس نے بڑی مشکل سے کہا جس پر فہد نے اسے غور سے
 دیکھا اور بڑے قفل سے کہا۔

”سلٹی! میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیوں؟ گھر تمہارا
 ہے تم کہہ رہی ہو لیکن بس مجھے اتنا بتا دو کیا استاد جی بھی
 ایسا ہی چاہتے ہیں؟“

”ہاں، وہ بھی چاہتے ہیں۔“ اس نے بہ مشکل کہا
 تو فہد چند لمحے خاموشی کے بعد پوچھا۔

”سلٹی! میں سمجھ لوں کہ وہ جنگ جو ہم لڑ رہے تھے،
 کیا اب مجھے وہ تہا لڑنا ہوگی؟“

”نہیں، میں آپ کے ساتھ برابر کھڑی ہوں۔
 اس وقت تک جب تک ہمیں کامیابی نہیں مل جاتی یا پھر
 میرا وجود ختم ہو جائے گا۔“

”میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ میں جانتا ہوں
 تعلق کے لئے ملنا ضروری تو نہیں ہوتا۔“ فہد نے
 مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔ اس نے لمحہ بھر کو اس کی
 طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور مڑ کر چلا گیا۔ سلٹی نے
 ایک بار ہاتھ بڑھا کر اسے روکنا چاہا لیکن پھر خود پر قابو پا
 کر رک گئی۔ فہد بڑھتا ہوا دروازہ پار کر گیا تو سلٹی پھوٹ
 پھوٹ کر رونے لگی۔ جبکہ فہد سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ
 کار میں آ بیٹھا۔

فہد اپنے گھر میں بستر پر لیٹا بہت افسردگی سے

اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے تمہارے یہاں آ کر چلے جانے کو بہت مس کیا۔ فہد نے کہا تو مائرہ ایک دم سے ٹھٹھکتے ہوئے بولی۔

”واؤ! جی فہد! ایسے مجھے بھی بڑی تشنگی محسوس ہوئی۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتی۔ تمہارے پاس آئی بھی اور تم سے اتنی دھیر ساری باتیں بھی نہ کر سکی۔ اپنی ہاؤ کیسے ہو تم؟“

”مائرہ! کیا تم کسی ایسے انسان کے احساسات کا تعین کر سکتی ہو جیسے صرف اپنی ذات کو منوانا ہو بلکہ اسے اپنوں کے وقار کو بھی تسلیم کرنا ہو۔ شاید تم اسے دماغی خلل قرار دو۔ مگر سچ یہی ہے۔ من کی دنیا کے تقاضے عجیب ہوتے ہیں ہے نا، میں بس ایسا ہی ہوں۔“ فہد نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو مائرہ بولی۔

”پہلے تو نہیں لیکن اب سمجھ رہی ہوں۔ تم نے خود اپنے آپ کو مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ تو اس کی ایک معقول وجہ ہے تمہارے پاس۔ میں سمجھتی ہوں۔“

”تم سمجھ گئی ہو مائرہ! میرے لئے اتنا ہی بہت ہے۔ میں ایسے حالات میں گھرا ہوا ہوں، یہ تو طے ہے کہ میں جگہ ہار کر یہاں سے بھاگنے والا نہیں ہوں۔ بلکہ خود کو فنا کر دینے تک سینہ سپر رہنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“ فہد کے لہجے میں وہی عزم تھا، جسے وہ پہلے بھی محسوس کر چکی تھی۔ اس لئے سکون سے پوچھا۔

”کیا میں تمہارے لئے کچھ کر سکتی ہوں؟“

”ہاں، بہت کچھ اتنا کہ جتنا کوئی بھی نہ کر سکے۔ بس تم اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ یہی میرے لئے بہت ہے۔“ فہد نے خلوص سے کہا تو وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔

”فہد میں نے ایک پلان بنایا ہے۔ وہ میں نے جعفر سے بھی ڈسکس کیا ہے۔ اس بارے میں چند دن بعد میں تمہیں بتاؤں گی۔“ اس نے جذباتی انداز میں

سوچتا چلا جا رہا تھا کہ یہ سلی کو کیا ہوا؟ اس کا لہجہ اس قدر جھنجھیکیا ہو گیا تھا۔ کسی نے سازش کی ہے یا کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے؟ کیا ہوا اس کو کم از کم مجھے بتانا تو چاہئے تھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟ کسی نے کچھ کہا۔ کوئی بات ہوئی؟ معلوم تو ہونا چاہئے۔ اس کے خیالات کا تانا بانا چھاکے کے آ جانے سے ٹوٹ گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی بولا۔

”اؤ فہد! یاد دیکھو اپنا فون چلا کر، وہ موبائل فون چالو ہو گیا ہے ہمارے علاقے میں۔“

”اچھا کب؟“ فہد نے کہا اور قریب پڑا فون اٹھا کر اسے آن کر دیا۔ سگنل آرہے تھے۔ اس دوران چھاکا بتاتا چلا گیا۔

”ابھی میں آ رہا تھا تو لوگ باتیں کر رہے تھے۔ ٹارو والے اسے چلا گئے ہیں۔ یاد! مجھے بھی چلانا سکھا دے۔“

”ہاں یاد آ گئے ہیں سگنل۔ چل ٹو جائے بنا پھر میں تجھے بتاتا ہوں، یہ کیسے چلتا ہے۔“ فہد نے کہا تو چھاکا کمرے سے چلا گیا۔ فہد نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر مسکراتے ہوئے نمبر پش کر نے لگا۔

اس وقت مائرہ اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی سوچوں میں گم تھی۔ اس کا فون بجا تو اس نے دیکھا پھر چونک کر فون ریسیو کر لیا۔

”ہیلو، فہد! تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟“

”اپنے گاؤں قسمت مگر سے مائرہ! میرے گاؤں سے نکل کر ہوا میں سرسرا نے والی پہلی آواز تمہارے نام ہے۔“ فہد نے خوشگوار موڈ میں کہا تو مائرہ ہنستے ہوئے بولی۔

”اؤ! فون سروں شروع ہو گئی، وہاں۔ اچھا لگا، مجھے بہت اچھا لگا، تم نے مجھے کال کی۔“

”کچھ ایسی ہی خوشی میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔“

یوں کہا جیسے رو دے گی۔ پھر خود پر قابو پا کر بولی، ”اچھا میں اب فون بند کرتی ہوں میں بعد میں کروں گی۔“ اس نے ایک دم سے فون بند کر دیا تھا۔ فہد نے حیرت سے میل فون کو دیکھا پھر دھیرے سے مسکرا کر فون ایک جانب رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

بشری بیگم حویلی میں ایک کھڑکی کے پاس کھڑی، دیکھ تو باہر رہی تھی لیکن گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے رانی کے آنے کا بھی احساس نہیں ہوا۔ جبکہ رانی اسے یوں ساکت دیکھ کر چمک گئی۔ وہ کچھ اور ہی تھی، اس لئے تیزی سے بولی۔

”چوہدرانی جی، چوہدرانی جی چوہدرانی جی۔“

اس کے یوں خوف زدہ لہجے پر بشری بیگم نے چوہدرانی کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

”آں ہاں..... کیا بات ہے؟“

”چوہدرانی جی! خیر تو ہے ناں؟ میں نے پہلے کبھی آپ کو اتنا پریشان نہیں دیکھا۔ کہیں کچھ چوہدری کی وجہ سے تو..... پر یہ کون سا نئی بات ہے۔ وڈھے چوہدری سب سنبھال لیں گے۔“ رانی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”نہیں، بات وہ نہیں جو تم سمجھتی ہو۔ میں تو اس کی اس ضد کے بارے میں سوچ رہی ہوں، جو اس نے ماسٹر دین محمد کی بیٹی کے لئے کی ہے۔ وہ نہیں جانتا۔ یہ ضد اس کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔“ بشری بیگم نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو رانی بولی۔

”میں نے تو سنا ہے چوہدرانی جی۔ ٹکا چوہدری اس سے بڑی محبت کرتا ہے۔ یہ آج کی بات نہیں، بڑی پرانی بات ہے۔“

”محبت ہی تو نہیں کرتا وہ اس سے۔ اگر محبت کرتا ہوتا تو حالات ایسے نہ بنتے۔ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔“ بشری بیگم نے دکھ سے کہا۔

”پھر تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور ماسٹر دین محمد یا سسلی وہ کہاں مانیں گے۔“ رانی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

”وہ نہ بھی مانیں لیکن بات جب ضد کی آ جائے تو یہ چوہدری تلخ نقصان نہیں دیکھتے۔“ بشری بیگم نے ایسے لہجے میں کہا جسے اسے بہت افسوس ہو رہا ہو۔

”ہاں ایہ تو ہے، پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ ٹکا چوہدری تو اپنی ضد کا پکا ہے۔“ رانی نے کہا

”بہت کچھ ہو سکتا ہے رانی، بہت کچھ، جب تک فہد ہے۔ سسلی پر کوئی آج نہیں آئے گی، یہ میں جانتی ہوں۔ ہاں اگر فہد نہ رہا تو شاید حالات بدل جائیں۔ اس لئے فہد کی سلامتی بہت ضروری ہے۔ بہت ضروری۔“

بشری بیگم نے حتمی لہجے میں کہا تو رانی بولی۔

”آپ کو پتہ ہے چوہدرانی جی، وہ فہد حویلی والوں کے کتنا خلاف ہو رہا ہے اور پھر بھی آپ؟“

”ہاں پھر بھی، اب ہمیں ہی کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ تو میرا ایک کام کر۔“ بشری بیگم نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو رانی بولی۔

جی چوہدرانی جی! بولیں۔“

”کسی ذریعے سے کسی طرح میری ملاقات فہد سے کروادے، میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

بشری بیگم نے کہا تو رانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

”چوہدرانی جی! آپ کہتی ہیں تو میں کچھ کرتی ہوں۔“

بشری بیگم نے گہرا سانس لیا اور پھر باہر دیکھنے لگی۔ حیرت زدہ ہی رانی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

رانی اسی دوپہر سراج کے ذریعے پر جا پہنچی۔ سراج اور رانی دونوں کھیت کی منڈ حیر پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ (جاری ہے)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

